مون ڈائجسٹ

لاہور

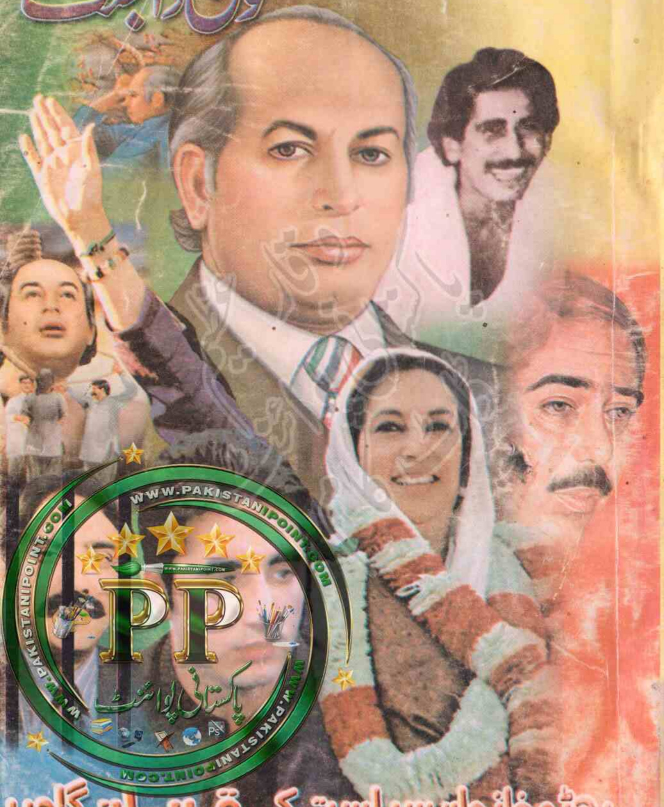

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

بھٹو خاندان سیاست کی قربان گاہ پر

شارٹ نوٹس طلبی ٹینڈرز

1۔ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور کے ساتھ 2009-2008ء کیلئے روڈ ورکس کے شعبہ میں اندراج/ تجدید فرموں/ ٹھیکیداروں سے درج ذیل کاموں کیلئے آئٹیم ریٹس/ مارکیٹ ریٹس پر سر بمہر ٹینڈرز مطلوب ہیں۔

2۔ ٹینڈر دستاویزات دفتر زیر دستخطی سے مصدقہ نقول اندراج/ تجدیدی لیٹر برائے سال 2009-2008ء، پاکستان انجینئرنگ کونسل برائے رواں سال، ٹھیکیدار/ مینجنگ پارٹنر کا قومی شناختی کارڈ بمعہ رجسٹرڈ پاور آف اٹارنی مہیا کرنے اور مجوزہ ٹینڈر فیس کی ادائیگی پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

3۔ ٹینڈر ریٹس اور رقوم دونوں کا اندراج الفاظ اور ہندسوں میں کرنا ہوگا۔ ٹینڈر دستاویزات پر دی گئی عمومی ہدایات کے مطابق ٹینڈر پر دستخط کرنا ہوں گے۔ ٹینڈر ریٹس پر چھوٹ قبول نہیں کی جائے گی۔

4۔ ٹینڈر مورخہ 09-03-7 کو جاری اور مورخہ 09-3-9 کو بوقت دو بجے دن دفتر زیر دستخطی میں ٹینڈر کھولنے کی کمیٹی/ ٹینڈر دہندگان یا اُن کے حاضر نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ اگر ٹینڈر مورخہ 09-3-9 کو وصول نہ ہوں تو پھر یہ ٹینڈر مورخہ 09-3-10 کو وصول کئے جائیں گے۔

5۔ کوئی مشروط یا جن ٹینڈروں کے ہمراہ زر بیعانہ بشکل ڈیپازٹ ایٹ کال یا ٹریژری چالان جاری کردہ کسی بھی شیڈولڈ بینک میں ہوں گے، اُن کو شامل نہیں کیا جائے گا۔

6۔ زیر دستخطی کو اختیار ہے کہ بغیر وجہ بتائے کسی ایک یا تمام ٹینڈروں کو مسترد کردے۔

7۔ ڈیپازٹ ایٹ کال دفتر زیر دستخطی میں ٹینڈروں کے اجراء کے وقت یا پہلے وصول کی جائے گی۔

8۔ منظور شدہ تخمینہ لاگت DNIT سے ٹینڈر کی رقم 5 فیصد کم ہونے کی صورت میں سب سے کم بڈ دینے والے بڈر کو اضافی پرفارمینس سیکورٹی جاری کردہ شیڈولڈ بینک رتجنگ 5 فیصد سے 10 فیصد مساوی دی گئی رقم جمع کروانا ہوگی۔

نمبر شمار	کام کی نوعیت	لاگت ٹینڈر (ملین میں) زرامانت (روپے)	مدت تکمیل (مہینوں میں)	ٹینڈر فیس
1	**ایریگیشن** ٹف ٹائل مون مارکیٹ سوک سنٹر، ای بلاک گلشن راوی اور ایم اے کالونی اور کنسٹرکشن آف مختلف سکیمز بند روڈ یو سی نمبر 87 لاہور جی ایس نمبر 995 اور 996	8.09 161800/-	4ماہ	4005/-
2	تعمیر پی سی سی سٹریٹ اور شالیمار کالونی سٹریٹ نمبر 15، گلشن راوی، یو سی نمبر 91، لاہور	1.619 32380/-	2ماہ	810/-

3	دوبارہ تعمیر سڑک قادر پور بازار قادریاں مسجد تک نیو شالیمار روڈ نالہ رضوان پارک کے ساتھ ساتھ یوسی نمبر 91 لاہور (جی ایس نمبر 1074) لاہور	5.234 104680/-	3 ماہ	2617/-
4	بحال سڑک مرتضٰی سٹریٹ نمبر 62 شریف پارک الحمد کالونی یوسی نمبر 103 (جی ایس نمبر 1074)	2.119 42380/-	2 ماہ	1060/-
5	اصلاح سڑک بیج پیر روڈ، نیو مزنگ، لاہور یوسی نمبر 106 (جی ایس نمبر 1086)	3.452 69040/-	3 ماہ	1726/-
6	تعمیر ٹف پیورز (60 ایم ایم در مختلف سٹریٹس یوسی نمبر 114) (جی ایس نمبر 1138)	3.337 66740/-	1 ماہ	1669/-
7	تعمیر مختلف سٹریٹس یوسی نمبر 115 (جی ایس نمبر 1141)	4.945 98900/-	3 ماہ	2473/-
8	سیوریج پی سی سی کارپٹ سٹریٹ گلشن عباس سکیم نمبر 2، موصل پارک روشن پارک اور علی نگر یوسی نمبر 117 (جی ایس نمبر 1149)	1.152 23040/-	2 ماہ	576/-
9	تعمیر ڈرین 2×2 1/2 بشمول پی سی سی در مین بازار چوہنگ یوسی نمبر 121 (جی ایس نمبر 1164)	8.000 160000/-	4 ماہ	4000/-
10	تعمیر مسجد قادری جنرل سٹور مکان نمبر 299 تا 171 مکان نمبر 268 تا 283 مکان نمبر 160 تا 267 مکان نمبر 31 تا 61 نمبر ڈی 111، مکان نمبر 351 تا 361 اور بلاک نمبر 4/ ڈی ون گرین ٹاؤن لاہور یوسی نمبر 138	2.760 55200/-	3 ماہ	1380/-
11	دوبارہ تعمیر سڑک ڈاکٹر نیاز تا انسپکٹر مکان اور از مدرسہ تا عبدس گوندل نوری مسجد تا یعقوب مکان بلاک ڈی 1 ٹاؤن شپ لاہور یوسی نمبر 138	2.499 49980/-	2 ماہ	1250/-
12	تعمیر کرنا Manway ملک احمد دین گجر والی گلی تا ماسٹر بلوکی یوسی نمبر 144	3.040 60800/-	3 ماہ	1520/-
13	......ایضاً...... تالہ سادوکی، بلوکی یوسی نمبر 144	0.812 16240/-	1 ماہ	406/-
14	......ایضاً...... سولنگ داڑہ گراں بلوکی یوسی نمبر 144	0.785 15700/-	1 ماہ	393/-
15	بچھانا سولنگ بابر گجر والی گلی ساروکی، یوسی نمبر 144 لاہور	1.428 28560/-	2 ماہ	714/-
16	تعمیر کرنا کارپٹ/ الف ٹائل ورساندہ بھٹیاں والا عثمان سٹریٹ، بند روڈ لاہور (جی ایس نمبر 1566 اینڈ 1567)	5.136 102720/-	3 ماہ	2568/-

ں مشاور

خالد شریف
فوزیہ ادیب
ایم ارشد ضیاء چوہدری

مشیران قانون

ایم نسیم کشمیری ایڈووکیٹ

سرورق ڈیزائننگ احسان الحق
کمپوزنگ سلیم اختر ساحلی

ڈ
ب
یب

فون: 042-7225021,7220853 فیکس: 042-7220280

پبلشرز نے با اہتمام سیف الدین، ابوالمعالی پرنٹرز
سے چھپوا کر 37 نسبت روڈ لاہور سے شائع کیا

رکن اے پی این ایس دی کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

Monthly
MOON DIGEST
Lahore

ماہنامہ
مون ڈائجسٹ
لاہور

جلد نمبر 25 شمارہ نمبر 3 مارچ 2009ء

چیف ایڈیٹر
ادیب جاودانی

مینجنگ ایڈیٹر
کاشف ادیب

ایگزیکٹو ایڈیٹر
بلاول ادیب

جوائنٹ ایڈیٹر
عاطف ادیب

مجلس مشاورت
خالد شریف
فوزیہ ادیب
ایم ارشد ضیاء چوہدری

مشیران قانون
ایم نسیم کشمیری ایڈووکیٹ

سرورق ڈیزائننگ احسان الحق
کمپوزنگ سلیم اختر ساحلی

رابطہ آفس: 37۔ نسبت روڈ لاہور فون: 042-7225021,7220853 فیکس: 042-7220280

ادیب جاودانی ایڈیٹر، پبلشر زنے باہتمام سیف الدین، ابوالمعالی پرنٹرز
میکلورڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر 37 نسبت روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ڈرون حملوں کے خاتمے کیلئے مضبوط موقف اپنانے کی ضرورت

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بدترین پہلو پاکستانی حدود میں امریکی ڈرونز (جاسوس طیاروں) کے حملے ہیں۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق برطانیہ نے پاکستان کے اندر ایسے حملوں کی حمایت کردی ہے جبکہ چند روز قبل اِس قسم کی خبریں بھی سننے میں آتی رہی ہیں کہ امریکہ صوبہ بلوچستان میں ڈرون حملوں کی منصوبہ بندی کررہا ہے تاہم یہ بات باعث اطمینان ہے کہ وزیراعظم پاکستان سید یوسف رضا گیلانی نے پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ڈرون حملوں کے حوالے سے امریکہ سے بات ہوگئی ہے' اب بلوچستان اور سوات میں ڈرون حملے نہیں ہوں گے۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ یہ حملے دہشت گردی کے خلاف حکومتی جنگ کو متاثر کررہے ہیں اور صدر بارک حسین اوباما کی انتظامیہ اُن کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتی ہے۔ امرواقع یہ ہے کہ ڈرون حملوں کے حوالے سے پاکستانی عوام میں شدید غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ اب تک جتنے ڈرون حملے ہوچکے ہیں' اُن کے بعد جو عوامی ردعمل سامنے آیا ہے' اُس میں ہمیشہ اِن حملوں کے حوالے سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے یہاں تک کہ اُن کے خلاف پارلیمنٹ اور سینیٹ سے متفقہ قراردادیں بھی پاس ہوچکی ہیں اور حکومت نے بارہا اِن حملوں کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے امریکہ سے احتجاج کیا لیکن امریکہ نے اِن قراردادوں اور درخواستوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھا بلکہ جیسے ہی کوئی قرارداد پیش کی گئی یا احتجاج ریکارڈ کرایا گیا' اُس کے اگلے ہی روز امریکی جاسوس طیارے کے حملے کا کوئی نہ کوئی واقعہ سامنے آگیا۔ سینیٹ اور پارلیمنٹ کی مذمتی قراردادوں' حکومتی احتجاج اور عوامی ردعمل کے باوجود اگر امریکہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آیا ہے تو اِس کی وجہ یہی ہے کہ حکومت کی طرف سے مضبوط موقف کا اظہار نہیں کیا جارہا ہے جس کا اظہار گذشتہ دنوں قومی سلامتی کی پارلیمانی کمیٹی نے اپنے اجلاس میں کیا ہے، کمیٹی نے امریکی صدر کی جانب سے نئی افغان پالیسی پر بریفنگ کیلئے وزیرخارجہ شاہ محمود قریشی کو طلب کیا اور نئی پالیسی میں ڈرون حملے بند نہ کرنے کے امریکی اعلان کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت کو ڈرون حملے رکوانے کیلئے جارحانہ حکمت عملی مرتب کرتے ہوئے امریکہ پر اپنا دباؤ بڑھانا ہوگا۔ قومی سلامتی کی پارلیمانی کمیٹی کا مطالبہ عوامی اُمنگوں کے عین مطابق ہے۔ حکومت اِس سے قبل بھی متعدد مرتبہ کہہ چکی ہے کہ آئندہ ڈرون حملے نہیں ہوں گے لیکن اِن پر عمل درآمد ہوتا ہوا نظر نہیں آیا۔ چنانچہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ امریکہ کو اُس کے وعدوں کی پاسداری پر مجبور کرنے کیلئے اِس پر موثر دباؤ ڈالے ورنہ امریکہ رفتہ رفتہ اپنے پاؤں پھیلاتا جائے گا اور ہم خود کو زیادہ مجبور و بےبس پائیں گے۔

عظیم صوفی، باکمال شاعر اور لازوال موسیقار

حضرت امیر خسروؒ

تحریر: سلیم اختر ساحلی

حضرت امیر خسروؒ کے آباؤ اجداد ہزارہ لاچین نامی قبیلے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ اہم قبیلہ قرشی اور مایمرغ کے قریبی علاقوں میں برسوں سے رہائش پذیر تھا۔ لاچین ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی نقادوں کے نزدیک ''شاہین'' کے ہیں۔ شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے مسلمان نوجوان کو ''شاہین'' سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سُلطانی کے گنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

جب تاتاریوں نے مختلف علاقوں پر حملوں و لوٹ مار کے ساتھ ساتھ ۶۱۶ ہجری (بمطابق ۱۲۲۰ عیسوی) میں اِس علاقے پر حملہ کرکے تباہی وبربادی کا آغاز کیا تو قبیلہ کے بےشمار لوگ ترکِ علاقہ کرکے برصغیر پاک وہند میں آکر آباد ہوئے۔ امیر خسروؒ کے والدمحترم کا نام ''امیر سیف الدین محمود'' تھا اور اُنہوں نے اپنے قبیلے ''لاچین'' سمیت ضلع **ایٹہ** (پیٹالی) میں سکونت اختیار کی تھی۔ اِسی جگہ امیر خسروؒ نے ۶۵ ہجری (۱۲۵۳عیسوی) میں اِس دنیائے رنگ وبُو میں جنم لیا۔

امیر خسروؒ کے والدمحترم سیف الدین محمود کی شادی نامور حکومتی شخصیت عماد الملک کی بیٹی سے ہوئی جس سے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ امیر خسروؒ کے بڑے بھائی کا نام عزّ الدین علی شاہ اور چھوٹے کا حسام الدین قتلغ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جب امیر خسروؒ پیدا ہوئے تو اُنکے والدمحترم اُنہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک مشہور بزرگ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے۔ ''یہ کیا ہے'' بزرگ نے سوالیہ انداز میں اُن سے دریافت کیا۔ ''حضور! یہ میرا بچہ ہے'' امیر سیف الدین نے جواب دیا۔ بزرگ نے ایک گہری نظر کپڑے میں لپٹے ننھے خسرو پر ڈالی اور فرمایا: ''یہ بچہ ایک دن اتنا بڑا آدمی بنے گا کہ اِس کی شہرت چاروں کھونٹ پھیل جائے گی'' یہ الفاظ اُس بزرگ نے ارشاد فرمائے اور ساتھ ہی اپنے ہاتھوں کو اُٹھا کر بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی ''اللہ! اِسے دنیا میں ہر طرح سے کامیاب کرنا!'' بزرگ کی بات سچ نکلی اور امیر خسروؒ نے بڑے ہوکر اتنا نام پیدا کیا کہ قیامت تک اُن کا نام زندہ وجاوید رہے گا۔

حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کا اصل نام ابوالحسن، لقب یمین الدین اور تخلص خسرو تھا۔ امیر خسروؒ کی ابتدائی شاعری پر نظر ڈالی تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابتدائی دور میں ''سلطانی'' تخلص کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ''دیوان تحفہ الصغر'' کی بعض غزلوں میں سلطانی کا لفظ ''تخلص'' کے طور پر ملتا ہے۔

امیر خسروؒ کے تخلص ''سلطانی'' کے متعلق ایک

دلچسپ واقعہ کچھ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ بچپن میں اُنہیں اُس دور کے نامور عالم قاضی سعد الدین کی شاگردی میں مختلف علوم وفنون کی تحصیل کیلئے دیا گیا۔ امیر خسروؒ خوش خطی سیکھنے میں بڑی محنت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ فارغ اوقات میں وہ پرانے کلاسیک شاعروں کی کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔ ایک دن دس برس کی عمر میں قاضی سعد الدین اُنہیں ایک نامور عالم قاضی عزّ الدین کے پاس لے گئے۔ دونوں شاعری کے متعلق باتیں کرر ہے تھے۔ جب قاضی عزّ الدین نے امیر خسروؒ کو دلچسپی سے باتیں سنتے پایا تو پوچھا۔ ''یہ لڑکا کون ہے؟'' قاضی سعد الدین نے امیر خسروؒ کا تعارف کرایا اور کہا کہ اِسے شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ قاضی عزّ الدین نے ایک فارسی شاعر کی کتاب اُنہیں دے کر کہا۔ ''میاں صاحبزادے! ذرا پڑھ کر تو سناؤ''۔ امیر خسروؒ نے کتاب لے کر اتنی روانی اور سلاست سے شاعری پڑھی کہ قاضی عزّ الدین حیرت میں گم ہو گئے۔ ''شاباش بیٹا'' اُنہوں نے کہا۔ ''قاضی صاحب یہ شعر پڑھتا ہی نہیں، شعر کہتا بھی ہے'' قاضی سعد الدین نے بتایا۔ قاضی عزّ الدین نے امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کو چار مختلف الفاظ دیئے کہ انہیں اپنے شعروں میں استعمال کر کے سناؤ۔ امیر خسروؒ نے کچھ دیر سوچا اور پھر چار ایسے اشعار سنا دیئے جن میں اِن چاروں الفاظ کو بڑی مہارت سے استعمال کیا گیا تھا۔ جس پر قاضی عزّ الدین نے امیر خسرو سے کہا: ''تم اپنا تخلص سلطانی رکھو۔ یہ بڑا اچھا تخلص ہے''۔

امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی ماں سے والہانہ محبت تھی۔ ایک رات اُن کو کچھ تکلیف محسوس ہوئی تو امیر خسروؒ بار بار اُنکے پاس جاتے اور حالِ دریافت کرتے۔ آدھی رات گزرنے کے بعد ماں سوگئی۔ جب مسجد سے اذان کی آواز آئی تو وہ جاگ پڑیں۔ یکا یک اُن کی نگاہ سامنے پڑی تو دیکھا کہ امیر خسروؒ اُنکے پاؤں دبا رہے تھے۔ ''بیٹا! تم ابھی تک سوئے نہیں ہو'' ''اماں نیند نہیں آرہی'' ''اچھا اب جاؤ''۔ امیر خسروؒ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُنہوں نے کمرے میں جھانکا تو ماں کو روتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے بچے کی سلامتی اور کامیابی کیلئے اللہ تعالیٰ کی عظیم بارگاہ میں دُعا کے ذریعے حاضری دے رہی تھیں۔ یہ واقعہ اتنا پُر سوز تھا کہ جب بھی یاد آتا، امیر خسرو کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی برسات رواں ہو جایا کرتی تھی۔

والد اور نانا کی وفات پُر ملال

جب امیر خسروؒ کی عمر آٹھ برس ہوئی تو اُن کے والد محترم امیر سیف الدین محمود 86 برس کی عمر میں اِس دارِفانی سے کوچ فرما گئے۔ امیر خسروؒ، کو باپ کی موت کا بے حد دکھ ہوا اور بے اختیار فارسی زبان میں ایک زبردست شعر کہا جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

''سیف میرے سر سے گذر گئے اور میرا دل
دو ٹکڑے ہو گیا۔ میرا دریا بہنے لگا اور میرا موتی یتیم
ہو گیا''

جس کے بعد آپ کی تربیت آپ کے نانا عماد الملک نے کی جو سلطان التمش کے دورِ حکومت میں ممتاز سرکاری عہدے دار تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے دورِ حکومت میں اُنہیں ''وزیر سلطنت'' کا اہم ترین عہدہ عطا کر دیا گیا۔ امیر خسروؒ کی عمر جب بیس برس ہوئی تو نانا بھی اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ عماد الملک کی وفات کو امیر خسروؒ نے ''دیباچہ دیوان غرۃ الکمال'' میں بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔

درباری تعلقات اور اہل اقتدار سے قربت

عماد الملک کی وفات کے وقت (۱۲۷۳عیسوی) دہلی پر سلطان غیاث الدین بلبن کی حکومت نہایت شان وشوکت کے ساتھ قائم دائم تھی۔ وہ اہل علم کا بہت شیدائی تھا اور امراء وحکماء کے علاوہ دیگر اہل علم حضرات کی قدر دانی کا حق بھی ادا کیا کرتا تھا۔ امیر خسروؒ سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد درباری امراء ووزراء سے خصوصی تعلقات قائم کرنے میں کامیابی سے سرگرم تھے۔ طغرل کو جب غیاث الدین بلبن سے میدان جنگ میں شکست فاش ہوئی تو دہلی واپسی پر ایک عظیم الشان جشن منایا گیا جس میں ملتان کا شہزادہ محمد قاآن بھی دہلی آ کر شامل ہوا۔ ملتان کے شہزادے سے امیر خسروؒ کی خصوصی ملاقاتوں کے بعد دوستانہ تعلقات استوار ہوئے۔ چنانچہ ملتان واپسی پر امیر خسروؒ اور خواجہ حسن سنجری دہلوی بھی اُس ساتھ ملتان روانہ ہوئے۔

امیر خسروؒ اور خواجہ حسن سنجری کی گرفتاری اور رہائی

۱۲۸۵ء کے آخر میں تاتاریوں کے وحشی لشکر کے ہاتھوں ملتان کا شہزادہ محمد قاآن اور فوج کے بے شمار بہادر سپاہی مارے گئے اور ہزاروں سپاہی تاتاریوں نے قیدی بنا لئے جن میں امیر خسروؒ اور خواجہ حسن سنجری کے نام بھی شامل تھے۔ قدرت کی مہربانی سے اُنہیں تاتاریوں کی قید سے جلد رہائی مل گئی اور شہزادے کی شہادت کے غم میں دونوں نے زبردست نوحے تخلیق کئے۔ حضرت امیر خسروؒ کا یہ نوحہ دنیا بھر کے چند شاہکار نوحوں میں سے ایک قرار جاتا ہے:۔

نوحہ حضرت امیر خسروؒ:

واقعہ است این یا بلا کر آسمان آمد پدید
آفت است این یا قیامت در جہان آمد پدید

تاتاری لشکر سے رہائی کے بعد امیر خسروؒ چند دن دہلی میں قیام کرنے کے بعد اپنی والدہ محترمہ کے پاس پٹیالی چلے گئے۔ سلطان بلبن کی وفات (۱۲۸۶عیسوی) میں سلطان کا پوتا معز الدین کیقباد تخت دہلی پر شان وشوکت سے براجمان ہوا جس نے ایک سال حکومت کی اور درباری سازشوں کے بعد قتل کر دیا گیا۔

دہلی کے شاہی دربار سے امیر خسرو کے تعلقات

حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کچھ عرصہ بعد کیقباد کی حکومت میں شاہی دربار سے وابستہ ہوئے اور اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت نہ صرف خواص وعام کی نگاہوں کا مرکز بنے بلکہ اُنہوں نے کیقباد کی موت کے بعد جلال الدین فیروز خلجی کی حکومت میں ''امیر'' کا لقب بھی حاصل کیا۔ دربار شاہی میں اُنہیں مصحف داری کا خصوصی عہدہ بھی بادشاہ کی اُن پر نظرِ عنایت کا نتیجہ تھا۔ بعد ازاں علاء الدین خلجی دہلی کے شاہی تخت پر بیٹھا تو امیر خسروؒ اُس کے دور اقتدار میں بھی دربارِ شاہی سے منسلک رہے۔ اُن کی تصانیف دیوان عزۃ الکمال، اعجاز خسروی، مثنوی دولرانی اِسی دور حکومت میں معرض وجود میں آئیں۔ مسلسل بیس برس کی حکومت کے بعد علاؤ الدین خلجی فوت ہوا تو یکے بعد دیگرے شاہی تخت کیلئے خلجی خاندان کے سرکردہ شہزادوں اور امراء میں باہم لڑائی وقتل وغارت گری کا سلسلہ شروع ہوا جس نے خلجی خاندان کی نہ صرف بنیادیں ہلا ڈالیں بلکہ چند برسوں

میں خلجی خاندان کا اقتدار نہایت کمزور بھی ثابت ہوگیا۔ غیاث الدین تغلق خلجی خاندان کا طاقتور بادشاہ تھا جس نے استحکامِ حکومت کیلئے امیر خسروؒ کے مشوروں سے کافی کامیابی حاصل کی اور طویل عرصہ تک حکومت کے مزے لوٹتا رہا۔ ۱۳۲۵ء میں وہ ایک استقبالیہ کوشک کی چھت کے گرنے سے زخموں کی تاب نہ لاکر مر گیا۔

بیعت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کو بچپن سے ہی صوفیاء کرام اور اُن کی تعلیمات وافکار سے گہرا دلی لگاؤ تھا۔ آپ صوفیاء کرام اور درویشوں کی مجلسوں میں خصوصی طور پر شرکت فرمایا کرتے تھے۔ اِسی بناء پر آپ کی طبیعت میں بے حد سادگی، انکساری، اخلاص اور انسان دوستی کے رنگ نمایاں طور پر جلوہ گر تھے۔ آپ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی بہت سی مجلسوں میں شرکت کی اور آخر کار اُن کی سحر انگیز شخصیت اور اسلامی افکار سے متاثر ہوکر ۱۲۷۲ء میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کی باہمی محبت اور خصوصی روحانی تعلق رہتی دنیا تک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ایک عظیم صوفی بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ سلطان غیاث الدین تغلق دہلی سے باہر کہیں جانے لگا تو حضرت سے بدگمانی کی بناء پر حکم دیا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی سے نکل جائیں ورنہ اُن کے ساتھ بُرا سلوک کرے گا۔ حضرت نظام الدین اولیا نے حکم سنا تو خاموش رہے۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق واپس آنے لگا تو خواجہ نظام الدین اولیا کے مریدوں نے کہا کہ ”سلطان دہلی سے کچھ فاصلے پر ہے، بہتری اِسی میں ہے کہ آپ دہلی چھوڑ کر چلے جائیں“ تب حضرت نے فرمایا ”دہلی ہنوز دُور است“۔

پھر ہوا کچھ ایسے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کا بیٹا باپ کے استقبال کیلئے دہلی سے باہر نکلا اور اُسے ایک نئے عالی شان مکان میں ٹھہرایا جو اُس نے باپ کیلئے خصوصی طور پر بنوایا تھا۔ رات کو مکان کی چھت گر گئی جس سے سلطان غیاث الدین تغلق ہلاک ہوگیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اکثر راتوں کو جاگ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ اِسی بناء پر جب وہ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے سامنے آیا کرتے تو اُنکی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہوتی تھیں۔ اِسی کیفیت کو دیکھ کر امیر خسروؒ نے یہ لاجواب شعر کہا:

تو شبانہ می نمائی بہ برکہ بودی شب
کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خُمار دارد

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اُن کو ”ترک اللہ“ کے لقب سے سے سرفراز کی اور چند اشعار فارسی زبان میں اُن کی تعریف میں کہے جو آج بھی یادگار ہیں۔

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملکِ سخن آن خسرو راست
آن خسرو ماست ناصرِ خسرو نیست
زیرا کہ خدای ناصرِ خسروِ ماست

☆☆☆☆

1324ء میں جب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، کا وصال ہوا تو حضرت امیر خسروؒ محمد تغلق کے ساتھ بنگالہ کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ کسی خاص کیفیت کے تحت بادشاہ سے اجازت لے کر اچانک دہلی پہنچ گئے اور مرشد کے وصال کی خبر سنی۔ اُسی وقت تمام دولت وملکیت مرشد کے ایصال ثواب کیلئے فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کردی۔ ماتمی لباس پہن کر مزار پُرانوار تک جا پہنچے اور آستانہ سے سر ٹکرا کر زور سے چیخ ماری ”سبحان اللہ آفتاب درِ زیرِ زمین و خُسرو زندہ“ یہ کہتے ہی بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش آیا تو یہ شعر پڑھا اور رُوح پرواز کرگئی۔

گوری سوئے سیج پر مُکھ پر ڈارو کیس
چل خُسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی پائنتی دفن کیے گئے۔ مہدی خواجہ نے سب سے پہلے 1491ء بعہد بابر بادشاہ مقبرہ تعمیر کروایا جہاں آج بھی امیر خسروؒ کے چاہنے والے اور اُن کے فن کے پرستار کروڑوں کی تعداد میں حاضری دیتے ہیں اور اِس عظیم مسلمان تخلیق کار اور صوفی کیلئے فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ اپنی نگاہِ عالمانہ میں

حضرت امیر خسروؒ فارسی اور اُردو زبان کی کثیر جہت شخصیت تھے۔ اُنہوں نے شاعری، تصوف، گیت نگاری، موسیقی میں اپنی عظیم فنی صلاحیتوں کا سکہ منوانے کے بعد ایک نئی طرز زبان کی بنیاد ڈالی جو ہندی، برج بھاشا، سنسکرت، فارسی اور اُس زمانے کی دیگر مقامی زبانوں کے ہزاروں خوش رنگ الفاظ سے عبارت تھی۔ اِس کے ساتھ ساتھ ہی راگ راگنیوں، پہیلیوں، مکرنیوں، اور نت نئے سازوں کی تخلیق (ستار) میں بھی کمال عروج کو چُھو لیا۔ اِن تمام شعبوں میں اُن جیسی دسترس رکھنے والا کوئی دوسرا شخص آج تک پیدا نہیں ہوسکا جو اُن کی فنی عظمت کی روشن مثال ہے۔

حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں:

”اکنون بباند دانست کہ در ہر کہ از شعراء چہار شرط موجود باشد او نزدیک دُور بینان استاد مطلق بود۔ اول آنکہ علمِ سخن بر طرزی نصب کند کہ دبدبہ آن باگیری گوش زنند۔ دوم آنکہ در عین معانی روشن آب بخشش بعذوت وسلاست بر نہج شعراء باشد نہ بر نمط مذکران وصوفیاں۔ سوم آنکہ جزو ہای منقش او از بدیافت خطا دور بود وچہارم آنکہ چون خیاطان خاین از پرکالہ مردمان قبای پیوندی تقطیع بکند“

ہر کرا این چہار شرط اوستادی دست داد چوبِ شرط اوستادی گو بزن بر برکہ ہشت

یہ نادر ونایاب تحریر (علم موسیقی کے حوالے سے) جناب سعید مارہروی نے امیر خسروؒ کے متعلق تصنیف ”حیاتِ خسروی“ سے نقل کر کے پہلی مرتبہ شائع کی تھی۔ اِسے قارئین موسیقی کے شایان شان پیش کیا جارہا ہے:

بشنو ای یار حقیقی علمِ موسیقی عجیب علمی است۔ طوطیِ نفس ناطقه بی (باوجود) علایق جسمانی در شکر ستانِ ذوق محفوظ گشته وعندلیبِ ارواح از (زمرمئه) روح افزا روح الارواح پر شوق محو شده در قالب در آمد وقانون نغمه عیش وارغنونِ عشرت وطنبور طرب ساز کرده وبه این ترانه تن زد۔

حضرت امیر خسروؒ فارسی اہل علم اور دانشوروں کی نظر میں

”در اشعارِ ایشان یکی بیت است کہ لم لسی بہ آن خوبی گفتہ باشد۔ مضمونہای تازہ وعالی در اشعارِ امیر آن قدر راست کہ اگر ہمہ را جمع کنند از تصانیف بعضی زیادہ می شود وہمین طور در اقسام

زبان وفنون علم ہندی بی مثل بودہ اند، بہ جامعیتِ ایشان کم کسی گذشتہ''

* * *

میر تقی میر:

''حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ مجمعِ کمالات وصاحبِ حالات۔ فضائل او اظہر من الشمس است۔ اشعار ریختہ، آن بزرگ بسیار دار۔ درین خود ترددی نیست''

(تذکرۂ نکات الشعراء)

* * *

دولت شاہ سمرقندی:

''انصاف آنست کہ مثلِ قصاید انوری قصاید خاقانی را توان گرفت باندکی کم وزیاد ومثل غزلیات شیخِ بزرگوار شیخ سعدیؒ غزلہای امیر خسروؒ خواہد بود''

''امیر خسروؒ را نسبت بہ شیخ سعدی اعتقادی زیادہ از تصور بود ودر باب اخلاصِ خود میگوید:

خسروِ سر مست اندر ساغرِ معنی بر یخت
شیرہ از خمخانہ مستی کہ در شیراز بود

* * *

مولانا عبدالرحمٰن جامی:

''امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمہ در شعر متشنٰی است۔ قصیدہ وغزل ومثنوی ورزیدہ وہمہ را بکمال رسانیدہ۔ تتبعِ خاقانی می کند۔ ہر چند در قصیدہ بہ وی نرسیدہ، اما غزل را از وی گذرانیدہ غزلہای او بواسطہ معنی آشنائی کہ اربابِ عشق ومحبت حسب ذوق وجدان خود را دری یابند مقبول ہمہ کس افتاد است''

مولوی غلام علی آزاد:

''مخفی نماند کہ ہنگامہ آرایِ سخن طرازی شیخ سعدیؒ شیرازی کہ مروجِ طرز غزل است، خال خال وقوع گوئی ہم دارد۔ مثل این:

دل وجانم بہ تو مشغول ونظر در چپ وراست
تا ندانند رقیبان کہ تو منظورِ منی

امام ناسخ نقوشِ مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصرِ شیخ سعدیؒ است بانیِ وقوع گوئی گردید واساسِ آن را بلند ساخت''

(خزانہ عامرہ)

* * *

امین احمد رازی:

''امیر خسرو با شغلِ ملازمت وشاعری چہل سال را بصوم گذرانیدہ ہر شپ یک ختمِ قران نمودہ وہر شفقتی کہ شیخؒ بہ امیر خسرو کردہ میرؒ آن راہ جمع کردہ کتابی ساختہ''۔

(تذکرہ ہفت اقلیم جلد اول)

* * *

نواب صدیق حسن خان:

''خسرو دہلوی خسرو قلمرو معانی ست وصاحب قرانِ سوادِ اعظم سخندانی۔ نمک کلامش شور افکنِ انجمن ہا وسوز سینہ او آتش زن خرمن ہا۔ در زبان عرب وعجم وہند سخن گفت۔ عدد اشعارش بہ پنج لک میرسید۔ سخن آفرینی باین قدرت وسرمائیگی در ابران دیار ہم نہ برخاستہ''

* * *

مولانا سیّد محمد بن مبارک علوی:

''آن سلطان الشعراء، برہان الفضلاء امیر خسرو شاعر رحمتہ اللہ علیہ کہ گوی سبقت فضل از مقتدمان ومتاخران بردہ بود وباطنِ صاف داشت، طریقہ اہلِ اہلِ تصوف در صورت وسیرت او پیدا بود''

* * *

رحمان علی:

''خسروِ شاعران نامدار وسر آمد متصوفان معرفت شعار جامعِ علوم ظاہر وباطن بود۔ وی سلطان الشعراء وبرہاں الفضلاء است۔ اشعارِ آبدارش از چہار صد ہزار زایدند ومشہور ست کہ نودونہ کتاب در سلک نظم کشیدہ''

* * *

شیخ عبدالحق محدث دہلوی:

''وی سلطان الشعراء وبرہان الفضلا است در وادیِ سخن یگانہ عالم ونقادہ نوع نبی آدم است وی در سخن عالمی است از عوالم خداوندی کہ پایان ندار۔ آنچہ او را از مضامین ومعانی اطوارِ سخن وانواع آن دست داد ذیچ کس را از شعرای مقتدمین ومتاخرین ندارد ہ ودر طرزِ سخن بر فرمودِ شیخ خود رفتہ است''

(اخبار الاخیار)

طاہر محرم اوف:

''امیر خسرو دہلوی بزرگترین نمائندہ ادبیات فارسیِ زبان ہند ونخستین ادامہ دہندہ مکتبِ ادبی شاعر شہیر آذر بائیجان حکیم نظامی گنجوی میباشد۔ خمسہ امیر خسرو کہ بر اساسِ موضوع مثنویہای نظامی نوشتہ شدہ یکی از نوادرِ آثارِ ادبی شرق است''

ڈاکٹر غلام سرور:

''اگر نوابع شعرای شبہ قارہ پاکستان وہند را در نظر بیاریم فقط چہار تن می باشند۔ یعنی اول امیر خسرو دہلوی، دوم فیضی اکبر آبادی، سوم غالب دہلوی وچہارم اقبال لاہوری۔ ہمچنانکہ امیر خسرو دلہوی بلحاظ تاریخ از ہر سہ شاعرِ دیگر مقدم است در مہارت وکمال در اضاف سخن ہم بر آنجا تقدم دارد وعلاوہ براین او در فنِ موسیقی بدرجہ ای رسیدہ بود کہ چند اصناف نغمہ را اختراع نمودہ وبخطاب نائیک کہ بزرگترین خطابہای موسیقی آن دورہ بودہ است مخاطب گردیدہ۔ در این فنِ شریف گوی مسابقت از ہمہ معاصرین خود ربودہ است وبدین مناسبت اگر او را در فن شعر وموسیقی یگانہ شناسیم ہیچ مبالغہ نیست''

* * *

خود آموزِ فارسی، جلد اول:

''امیر خسرو حق بزرگی برزبانِ اردو دارد نخستین شاعر ونویسندہ بزرگ فارسی گوی در ہند کہ کلماتِ ہندی را در آثارِ خویش آوردہ امیر خسرو دہلوی است۔ امیر خسرو طبعی روان داشت ودر نظم سخن سرعت خیال وجودت طبع نشان دادہ۔ خسرو خود تصریح کردہ کہ در ہر یک از اصناف سخن پیرو کدامیک از استادان بزرگ ایرانی است۔ باوجود این شعر امیر خسرو مانند شعر دیگر گویندگانِ ہند لحن ولطافتی خاص دارد ودر استعمال بعضی لغات وترکیب ہا تاحدی از مصطلحات معمول شعرای ایران دور شدہ است ومیتوان سبک وی را طلیعہ سبک ہندی بشمار

آورده۔ قصاید امیر خسرو از غزلیات وی متین تر است"۔

* * *

ڈاکٹر علی اکبر شہابی:

"نخستین شاعری کہ بجنگ نظامیؒ رفتہ و طلسم پنج گنج حکیم را شکستہ راست امیر خسرو دہلوی شاعر معروف است کہ طوطیِ ہندستانش لقب دادہ اند...... از میان تمام شعرای کہ پیروی از نظامی خمسہ ساختہ اند شاید امیر خسرو بہتر از عہدہ این کار برآمدہ است"۔

" خسرو...... از استادانِ مسلم سبک ناتورا رالیسمِ در شعر فارسیست و نزدیک صد ہزار شعر از و باقی ماندہ است و بزبان ہندی نیز شعر گفتہ و از نخستین کسانیست کہ بدین زبان شعر سرودہ اند۔ در موسیقی نیز دست داشتہ و از موسیقی دانان زبردست زمان خود بشمار رفتہ است"۔

* * *

سجان رائے:

"بعد ازان غازی الملک در کوشک ہزار ستون رسیدہ تعزیت سلطان قطب الدین و برادرش گریہ و زاری نمودہ فاتحہ خواند، چنانچہ امیر خسرو بہ زبان پنجاب بہ عبارات مرغوب مقدمہ جنگ غازی الملک تغلق شاہ و ناصر الدین خسرو خان گفتہ کہ آن را بہ زبان ہند "وارہ" گویند"

(خلاصہ التواریخ)

* * *

محمد قاسم فرشتہ:

"تا عہد بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ ہر یک از پادشاہان کہ بر تخت نشستند امیر خسرو را معزز داشتہ در جرگہ امراء نگاہ می داشتند۔ بادشاہ غیاث الدین تغلق شاہ کہ تغلق نامہ بنام نامی اوست امیر خسرو را بیش از دیگران عزت دادہ"

* * *

ڈاکٹر سلیم نیساری:

"امیر خسرو کہ بہ مطالعہ آثارِ ادبی سخن سرایان ایران رغبتی تام داشت در شعر گفتن نیز ہمتی بکار برد و میتوان او را از لحاظ کثرتِ آثار منظوم در ردیف نخستین شعراء بشمار"

* * *

مولوی محمد حسین:

"اعجوبہ روزگار بود و ہمہ دانی و کمال کسی بپایہ او نرسیدہ۔ در تصوف رتبہ داری کہ بارہا شیخ نظام الدین اولیا رحمہ اللہ علیہ کہ مرشد او بودند فرمودندی کہ روزِ حشر امیدوارم کہ مرا بسوز سینہ این ترک بہ بخشد و در علم موسیقی از ہ پیشوایان این فن است و بسی شعبہ دران ایجاد کردہ و حیرت ناک تر اینست کہ زبان اردو کہ اکنون در ہمہ ہند مروج است اول او بنا نہادہ...... و در کلام او شیرینی و دل نشینی بدرجہ کرامت رسیدہ۔ ہر چند مکرر خواندہ شود لطف و لذت زیادہ دہد"۔

(ارمغان احباب)

☆ ☆ ☆ ☆

حضرت امیر خسرو

اردو شاعروں، ادیبوں، تخلیق کاروں اور دانشوروں کی نظر میں

مرزا غالب:

"غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے سوا کوئی اُستاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسروؒ، کخسر و قلم رو سخن طرازی ہے، یا ہم چشمِ نظامی گنجوی و ہم طرحِ سعدی شیرازی ہے"۔

(عود ہندی)

* *

سرسیّد احمد خان:

"...... امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں کے زمانے سے یعنی حضرت مسیح کی تیرھویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے الفاظ ملانے شروع کئے تھے اور کچھ پہلیاں اور مکرنیاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہی تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو"۔

(آثار الصنادید)

* *

علامہ شبلی نعمانی:

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اِس درجہ کا جامع کمالات نہیں ہوا اور سچ پوچھو تو اِس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو اُن کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے"

* *

الطاف حسین حالی:

"چشمِ انصاف سے دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ امیر خسروؒ کی بعض غزلیات شیخ سعدیؒ کی غزلیات سے بڑھی ہوئی ہیں"۔

محمد سعید احمد مارہری:

"اِس صاحب کمال کو نظم کے ہر شعبہ میں یکساں کمال حاصل تھا۔ غزل میں وہ شعرائے متقدمین اور شعرائے عہد سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مثنوی کے دربار میں اُن کی کرسی نظامی کے برابر ہے۔ قصیدے کے میدان گھوڑ دوڑ میں خاقانی اور ظہیر وغیرہ کے دوش بہ دوش ہیں۔ اُن کے قصیدے بحر الابرار اور انیس القلوب۔ فصاحت و بلاغت کے ایسے معراجِ کمال پر پہنچے کہ بڑے بڑے فضلائے روزگار نے اُن کے جواب میں طبع آزمائیاں کیں مگر کسی کا جواب اُن کا مقابلہ نہ کر سکا"

غلام نظام الدین مرولوی:

"امیر خسرو ہندوستان کے پہلے عظیم فنکار ہیں جنہوں نے ہند و ایران سے برابر کا خراج تحسین وصول کیا۔ اُن کی شخصیت اِس قدر بھرپور، جامع اور پہلودار ہے کہ اُس کا ایک ایک رُخ عام کی زندگی بھر کی ادبی فتوحات پر بھاری ہے"۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی:

"حضرت امیر خسرو کا شمار اُنہی باکمال ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے فضل و کمال کا سکہ اب تک لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ جن کی ہمہ گیر شخصیت نے ایک عالم کو اپنا شیدائی بنا لیا تھا...... اُن کی شاعری تصوف و معرفت کا گنجینہ ہے اور اُنکے ہندی بول، پریم اور گیان کی موہنی صورت۔ صدیاں گزر گئیں لیکن اُن کے کلام کی دلکشی کم نہیں ہوئی"

صاحبزادہ خورشید گیلانی اور سید ارشاد احمد عارف کی شہرۂ آفاق کتابیں

خون جگر ہونے تک

صاحبزادہ خورشید گیلانی کے بستر علالت پر لکھے گئے کالموں کا مجموعہ

تاریخ کی مراد ان اکابرین کا تذکرہ جن پر تاریخ فخر کرتی ہے

رشک زمانہ لوگ بے مثال اور لاثانی افراد کی باتیں

سید ارشاد احمد عارف کی کتابیں

دیوار چین کے اس پار

ایک اچھوتا اور تخلیقی سفر نامہ مصنف کی تخلیقی صلاحیتوں کا شاہکار

افغان باقی کہسار باقی افغانستان پر امریکی حملے کے تناظر میں لکھے گئے کالموں کا مجموعہ

ہر اچھے بک سٹال سے نام لے کر طلب کریں

ناشر خورشید گیلانی ٹرسٹ، 22/H مرغزار آفیسرز کالونی ملتان روڈ لاہور

تذکرہ اولیاء اللہ

امیر السادات غوث اعظم سید کمال ترمذی کی روح پرور داستان

مؤلف: سید انور حسین ترمذی

WWW.PAKISTANIPOINT.COM

امیر السادات غوث اعظم سید کمال ترمذی

امیر السادات کے آباؤ اجداد ترمذ شریف میں آباد تھے۔ جو پشت در پشت بزرگ صاحب کرامات تھے۔

حضرت سید کمال ترمذی 480 ہجری میں بمقام ترمذ پیدا ہوئے۔ اپنے والدین کے اکلوتے چشم و چراغ تھے۔ صرف ایک ہمشیرہ تھیں جن کے بطن سے خواجہ سبز خط جو کہ حضرت امام تقی کی اولاد سے تھے پیدا ہوئے۔ حضرت سید کمال ترمذی شروع سے ہی حد درجہ کمالیت رکھتے تھے ترمذ میں ان کے گیارہ فرزند تولد ہوئے۔ خاندان نجیب الطرفین پایا۔ آپ خواجہ عثمان ہارونی سے بیعت تھے جو وطن مالوف ترمذ میں اشاعت و تبلیغ اسلام فرماتے رہے اور بادشاہان کو امداد دیتے رہے۔ حلیہ مبارک یہ تھا سفید نورانی رنگ، چوڑا چہرہ، بلند بینی، کشادہ ابرو، آنکھیں بڑی، چوڑی پیشانی، چوڑا چکلہ سینہ، بلند دراز بازو، قطعہ ریش مبارک، پُر جلال چہرہ، حافظ قرآن غرضیکہ ہر صفت موصوف تھے۔

ترمذ سے آنے کے کئی صدی بعد حضرت نواب صدر جہان مرحوم و مغفور اولاد سید علیم الدین ترمذی پسر امیر السادات متوطن قصبہ قنوج جن کا ذکر خزینۃ الصوفیہ حصہ دوئم مرتبہ غلام سرور لاہوری میں ہے نے ترمذ پہنچ کر دریافت حال خاندان امیر السادات کیا۔ جہاں سے تصدیق ہوا کہ امیر السادات 588 ہجری میں ترمذ سے بطرف ہندوستان تشریف لے گئے۔ نواب صدر جہاں نے حضرت عبداللہ خان والئی بلخ سے مل کر حالات امیر السادات سنائے۔ عبداللہ خان نے حالات سن کر اظہار مسرت فرمایا اور نواب مرحوم کو خلعت ناصرہ عطا فرمائی۔

امیر السادات سید کمال ترمذی کو سیر و سیاحت کا شوق تھا اور ان اولین صوفیائے کرام میں سے تھے جو 588 ہجری میں بہ لباس فقر ترمذ شریف سے بسوئے ہند روانہ ہوئے۔ ریشم و کتان کے چند تاجر بلخ سے ہرات جاتے تھے۔ ان کا ساتھ ہوگیا۔ ایک خچر پر خیمہ لادا۔ ایک مشکیزہ۔ کتابوں کا بستہ۔ جاء نماز۔ تسبیح اور تلوار کے

ہمراہ دریائے جیحون پار کر کے غزنی۔ افغانستان سے نکلے دریائے اٹک، لاہور پنجاب سے چلے۔ ایک علاقہ سرسبز و شاداب نظر آیا۔ مویشی کثرت سے چر رہے تھے۔ تالاب تھا اہل ہنود کے صنم خانے علاقہ ہریانہ ندی کے کنارے اہل ہند کی ایک مشہور زیارت گاہ اور بت خانہ ہے۔ نزدیک ہی ایک مقام تھانیسر ہے کیتھل کا خاص میدان کوروکھشیتر کہلاتا ہے۔ یہاں عہد قدیم میں ایک زبردست جنگ لڑی گئی تھی۔

راستے میں مختلف مقامات پر قیام فرماتے ہوئے اہل ہنود کو مشرف بہ اسلام فرمایا۔ آخرش در عہد راجہ رائے پتھورا (پرتھوری راج) سیلہ کھیڑہ تالاب ایکانیر کے کنارے تشریف فرما ہوئے اور ٹوٹی پھوٹی ہریانوی زبان میں تبلیغ شروع کر دی۔ اس زمانہ میں کیتھل شہر آباد نہ تھا۔ کیتھل کا پرانا نام کپتھل تھا بلکہ موجودہ شہر کیتھل سے دو میل کے فاصلہ پر بجانب غرب قصبہ سیلہ کھیڑہ آباد تھا۔ راجہ پرتھوی راج کی طرف سے ایک قلعہ پختہ بنا ہوا تھا۔ جس میں راجہ مذکور کی دختر انیکا دیوی رہا کرتی تھی اور اس کی حفاظت کیلئے دو ہزار سپاہی منجانب راجہ رہا کرتے تھے۔ مسماۃ انیکا دیوی کے غسل کیلئے ایک تالاب پختہ اور اس کے قریب ایک پختہ مندر بنا ہوا تھا۔ تالاب اور مندر انیکا کے نام سے مشہور تھے۔ اہل ہنود کے اعتقاد کے مطابق وہ جگہ پاک ہے۔ اسی وجہ سے مسماۃ انیکا اس مقام پر رہ کر روزانہ تالاب پر پہنچ کر غسل کرتی تھی۔ بعد فراغت مندر مذکور میں پوجا (عبادت) کیا کرتی تھی۔ تالاب و مندر کے درمیان ایک اونچی جگہ تھی۔ جس پر درخت جال تھا۔ امیر السادات سید کمال ترمذی نے درخت جال مذکور کے نیچے قیام فرمایا اور عبادت الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ علی الصبح مسماۃ انیکا حسب معمول تالاب پر برائے غسل پہنچی۔ جس کے کان میں نعرہ توحید ''اللہ اکبر'' کی آواز جو کہ امیر السادات لگا رہے تھے پہنچی۔ آواز اللہ اکبر سن کر بہت گھبرائی۔ کیونکہ اس سے قبل اللہ کا نام اس نے نہیں سنا تھا اور نہ ہی اس کے دربار میں کوئی مسلمان پہنچا تھا۔ مسماۃ انیکا کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر اس طرح پیہم نعرہ توحید لگتے رہے تو اس کے ٹھاکریت (یعنی خدا) ناراض ہو جاویں گے۔ انیکا نے ایک سپاہی کو حضرت موصوف کے پاس بھیجا کہ کہہ دے کہ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے اٹھ کر کسی اور طرف چلا جائے۔ اس کے یہاں رہنے سے اس کے ٹھاکر ناراض ہو جاویں گے۔ اگر وہ نہ گیا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ سپاہی تعمیل حکم کیلئے حضرت کے پاس پہنچا۔ حضرت نیچی نگاہ کیے ہوئے عبادت میں مشغول تھے۔ سپاہی کو چہرہ مبارک دیکھ کر اتنی ہمت نہ ہوئی کہ مدعا انیکا زبان پر لائے۔ آخر حضرت نے نظر مبارک اٹھا کر سپاہی کی طرف دیکھا۔ سپاہی نظر کی تاب نہ لا سکا۔ بوجہ خوف اس جگہ سے لڑکھڑاتا ہوا واپس انیکا کے پاس پہنچا اور تمام ماجرہ ہیبت جلالی سنا دیا۔ انیکا نے یہ حال دیکھ کر راجہ کو مقام دہلی اطلاع پہنچائی کہ اس علاقہ میں ایک مسلمان فقیر آیا ہوا ہے۔ دم بدم نعرہ اللہ اکبر لگا رہا ہے کسی سپاہی کی تاب نہیں جو اسے اٹھاوے۔ اگر کوئی انتظام کرنا ہے تو کر لیا جائے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ اس جگہ مسلمان ہی مسلمان نظر آئیں جب یہ خبر راجہ کو پہنچی تو اس نے حیلہ سازی حضرت کو دہلی پہنچنے کی دعوت دی۔ حضرت کو اطلاع پہنچائی گئی۔ تو حضرت نے دہلی روانگی کا عزم کیا۔

پہلی منزل موضع بھانہ جو کہ کیتھل سے قریباً 9 میل کے فاصلہ پر ہے ختم ہوئی تو ایک آہیر دہقانی کے گھر پر پہنچ کر حضرت نے دودھ طلب فرمایا۔

زوجہ آہیر سے اسی طرح سوال و جواب ہوئے۔

زوجہ آہیر: دودھ نہیں ہے۔

حضرت: اچھا مائی نہیں ہوگا۔

یہ فرما کر حضرت نے باہر بستی سے قیام کیا اور یاد الٰہی میں مستغرق ہو گئے۔ چنانچہ بوقت شام جب آہیر اپنے مال مویشی لیکر گھر آیا اور مویشیوں کا دودھ نکالنے لگا تو کسی مویشی نے دودھ نہ دیا بلکہ بجائے دودھ کے پیپ لہو آیا۔ یہ ماجرہ دیکھ کر اپنی زوجہ سے دریافت کیا۔

آہیر: آج مویشی دودھ نہیں دے رہے کیا وجہ ہے۔

زوجہ آہیر: اور تو کوئی بات نہیں البتہ ایک فقیر آیا تھا۔ صرف دودھ مانگا تھا۔ دودھ گھر میں موجود تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔

آہیر: تو نے دودھ کیوں نہ دیا جبکہ گھر میں دودھ موجود تھا۔

زوجہ آہیر: فقیر کا حلیہ مسلمانوں جیسا تھا اور زبان سے اللہ اللہ کہہ رہا تھا۔ جو ہمارے خداؤں کا دشمن تھا۔

آہیر: وہ فقیر کدھر گیا۔

زوجہ آہیر: ادھر بستی سے باہر چلا گیا۔ شام کا وقت تھا اغلب ہے کہ یہاں بستی کے قریب ہوگا۔

آہیر اپنی زوجہ سے تمام حال سن کر تلاش حضرت کیلئے گھر سے روانہ ہو گیا۔ قریب ہی حضرت کو بیٹھے ہوئے اور نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے پا کر آہیر حضرت کے قدموں میں گر کر یوں عرض کرنے لگا۔

آہیر: پرماتما کیلئے میری خطا معاف کر دیں۔

حضرت: بابا کیسی خطا اور کیا خطا ہوئی۔

آہیر: مہاراج نے میرے گھر پر کرپا کر کے دودھ مانگا تھا۔ لیکن میری اَستری نے دودھ نہیں دیا۔

حضرت: بابا ہم نے تو کچھ نہیں کیا صرف یہی کہا تھا کہ اچھا دودھ نہیں ہوگا۔

آہیر: مہاراج اس نے میرا ستیاناس کر دیا ہے کہ کوئی مویشی دودھ نہیں دیتا۔ بلکہ خون پیپ بجائے دودھ کے آ رہا ہے۔ کرپا کر کے معاف کر دیں۔ میری اَستری سے غلط ہو گئی ہے۔

حضرت: اچھا بابا جاؤ خدا کا نام لیکر دودھ نکال لو۔

چنانچہ آہیر اپنے گھر پہنچا اور مویشیوں کا دودھ نکالنے لگا۔ سب مویشیوں نے دودھ دیا بلکہ جو مویشی دودھ نہیں دیتے تھے ان کے تھنوں میں بھی دودھ موجود تھا آہیر نے فوراً چاول شیریں تیار کرائے اور دودھ لیکر حضرت کی خدمت میں پہنچا اور چاول اور شیر حضرت کے حضور پیش کیے۔ حضرت نے حسب ضرورت دودھ لیکر باقی معہ چاولوں کے واپس کر دیا۔ آہیر مذکور تمام رات حضرت کی

خدمت میں حاضر رہا اور حضرت کو تمام رات عبادت میں مشغول دیکھتا رہا اور کرامات دیکھتا رہا۔ صبح کو حضرت دہلی جانے کیلئے روانہ ہونے لگے تو آہیر اس طرح گویا ہوا۔

دہلی روانگی

آہیر: حضرت کہاں روانہ ہونے کی تیاری فرما رہے ہیں۔

حضرت: بابا ہم نے دہلی راجہ کے دربار جانا ہے۔

آہیر: حضرت میں بھی غلامی میں ہمراہ چلوں گا۔

حضرت: بابا تم بال بچوں والے ہو۔ بندہ فقیر آدمی ہے۔ میرے ہمراہ رہ کر کیا کرو گے۔

آہیر: حضرت تو میں بھی فقیر کے ساتھ فقیر ہوں گا۔

حضرت: بابا میں مسلمان ہوں اور تم ہندو ہو۔ مسلمان کے ساتھ ہندہ نہیں رہ سکتا۔

آہیر: حضرت مجھے مسلمان کر لیجئے۔ میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔ کیونکہ تمام رات آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر میں دیکھ چکا ہوں۔ چنانچہ آہیر کو اسلام لانے پر رضامند پا کر حضرت نے اس کو مشرف بہ اسلام فرمایا اور دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ آہیر نو مسلم بھی معہ دیگر خدام کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ چنانچہ حضرت منزل بہ منزل سفر فرماتے ہوئے ایک روز دہلی لے گئے۔ اور لب دریا جمن مصلےٰ بچھا کر قیام فرمایا اور خود معہ خدام یاد الٰہی میں مستغرق ہو گئے۔ آخر بذریعہ خدام راجہ پتھورا کو اطلاع کرائی کہ فقیر سیلہ کھیڑہ سے جس کو بذریعہ انکا اطلاع کرائی گئی تھی دہلی پہنچ چکا ہے۔ راجہ نہایت مغرور تھا۔ جو حضرت کے پاس جانے میں اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ اس لئے راجہ نے اپنا آدمی حضرت کے پاس دربار میں حاضر ہونے کیلئے بھیجا۔ لیکن حضرت نے فرمایا کہ بندہ دہلی پہنچ چکا ہے۔ اگر راجہ کو کوئی کام ہے تو خود آ کر مل جائے۔ فقیر کو راجہ سے کوئی کام یا غرض نہیں ہے۔

راجہ پتھورا آپ کی خدمت حاضر ہوا:

جب راجہ کو یہ اطلاع ملی تو راجہ نے یہ اندازہ لگایا کہ فَقیر ضرور کوئی کامل شخص ہے۔ خود حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر اس طرح سوال و جواب کئے۔

راجہ: آپ کسی ولایت سے آئے ہو۔

حضرت: ہم ترمذ سے بغرض سیر و سیاحت ہندوستان آئے تھے۔ دیار سیلہ کھیڑہ میں قیام کیا ہوا تھا کہ تمہارے طلب کرنے پر دہلی آئے ہیں۔

راجہ: آپ کون ہیں، کیا ذات ہے، کونسا خاندان ہے۔

حضرت: ہم مسلمان ہیں اور فرزندان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہیں۔

راجہ: ہمارے شاستروں میں لکھا ہے کہ سیّد کے بدن کو آگ نہیں لگتی۔

حضرت: یہ قبضہ خدا میں ہے جو مالک الملک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے مطلق ہے۔

راجہ: میں آزمانا چاہتا ہوں تا کہ یقین پختہ ہو جائے۔

حضرت: تم آزمائش کر لو اگر خدا کو منظور ہوا تو ہم آزمائش میں پورے اتریں گے چونکہ اس سے قبل جو

مسلمان دہلی آتا تھا۔ راجہ اسی حیلہ سازی سے مسلمانوں کو آگ میں بٹھا کر جلا دیتا تھا۔ یہی حیلہ سازی راجہ نے حضرت سے کی۔ راجہ نے لکڑیوں کا انبار لگوا دیا اور اس میں حضرت کو بٹھا کر آگ لگا دی اور خود بڑے اطمینان سے اپنے محل کو چلا گیا کہ اب فقیر جل کر مر جائے گا اور قصہ ختم ہو جاوے گا۔ چنانچہ آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ حضرت بڑے اطمینان کے ساتھ بَرضا مولا آگ میں بیٹھے زبان گوہر فشاں سے مناجات بارگاہ الٰہی میں اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر پڑھنے لگے۔

ابھی یہ مناجات ختم نہ ہوئی تھی کہ حضرت کے دونوں گیسوؤں مبارک سے بقدرت الٰہی پانی نکل کر حضرت کے ساتھ والی آگ سرد ہو گئی۔ آگ نے کوئی گزند حضرت کو نہ پہنچایا۔ مناجات ختم ہونے کے بعد حضرت نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ یارب العالمین تجھے معلوم ہے کہ کافر امتحان لے رہا ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ والسلام کو نمرود نے آگ میں ڈالا تھا اور تو نے اسی آگ کو بمثل گلزار بنایا تھا۔ اسی طرح رائے پتھورا نے مجھے مسلمان سمجھ کر اور تیرے حبیب پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد ہونے کی وجہ سے چتا میں بٹھایا ہے کہ جل کر قصہ ختم ہو جائے۔ اس آگ کو بمثل گلزار ابراہیم علیہ السلام بنا دے اور آیت کریمہ پڑھی۔ چنانچہ آتش رائے پتھورا حضرت سید کمال ترمذی پر سلامتی کی آگ ہو گئی۔ دریائے جمنا کا افتاد یعنی طغیانی آئی۔ چنانچہ آتش رائے پتھورا کا تمام خس و خاشاک بہا کر لے گئی۔ حضرت صبح و سالم بفضل تعالیٰ اس جگہ بیٹھے ہوئے نعرہ توحید لگاتے رہے جب خدام نے حضرت کی یہ کرامات دیکھیں تو بہت خوش ہوئے اور نعروں پر نعرے لگانے شروع کئے۔ ادھر ملازمان جو کہ پہرہ آتش پر مامور تھے نے یہ حال دیکھا تو فوراً راجہ کے حضور پہنچ کر تمام حال سنا دیا کہ مہاراج وہ بزرگ زندہ موجود ہے۔ تمام آگ وغیرہ کو دریائے جمنا بہا کر لے گیا ہے۔ راجہ یہ سن کر بہت گھبرایا۔ بطریق ہندووانہ ننگے سر، ننگے پاؤں، منہ میں تنکا لیکر فوراً حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر حضرت کے پاؤں مبارک پر گرا اور اس طرح گویا ہوا۔

راجہ نے آپ کو آزمالیا:

راجہ: میں نے مہاراج کو آزمالیا ہے۔ واقعی آپ سیّد ہیں۔ میری گستاخی کی معافی دی جاوے۔ میرے اور میری رعایا کے حق میں بددعا نہ کی جاوے۔

حضرت: ہم کسی کے حق میں بددعا نہیں کریں گے کیونکہ تم نے اور تمہاری رعایا نے ہمارا کوئی نقصان نہ کیا ہے۔ تم نے آزمالیا۔ ہمارے خدا نے اپنے محبوب کی اولاد کو سچا کر دکھایا۔ لیکن آئندہ کیلئے ایسے فعل سے توبہ کرو۔

راجہ: میں نے سخت غلطی کی ہے میں آئندہ کیلئے جیسا کہ پہلے کرتا آیا ہوں توبہ کرتا ہوں اور کسی مسلمان کو حیلہ سازی سے آگ میں نہیں جلاؤں گا۔ مہاراج اپنے گزارہ کیلئے جتنی جاگیر چاہیں حکم کریں تا کہ میں جاگیر پیش کروں۔

حضرت: ہم شاکر بہ رضا مولا ہیں۔ ہم کو کسی

جاگیر کی ضرورت نہیں۔ البتہ جس جگہ سے ہم اٹھ کر آئے ہیں وہی جگہ اور درخت پسند ہے۔

راجہ: ویسے تو میرا تمام ملک آپ کا ہے۔ لیکن میری خوشی اس میں ہے کہ مہاراج ضرور جاگیر لیں۔

حضرت: اگر تم جاگیر دینا چاہتے ہو تو موضع بھانہ آہیر جو ہمارے ساتھ ہے کو دے دیا جائے۔ ہم اسی درخت جال پر خوش ہیں۔

راجہ: جیسی آپ کو خوشی۔

راجہ نے موضع بھانہ کا تعلقہ تحریر کرا کہ آہیر نومسلم کے حوالے کر دیا۔

حضرت: واپس کیتھل درخت جال کے نیچے تشریف لے گئے۔

حضرت معہ خدام دہلی سے روانہ ہو کر کیتھل درخت جال کے نیچے تشریف لے آئے۔ راجہ نے انیکا دیوی کے نام فرمان بھجوایا کہ اس فقیر کو میں نے آزما لیا ہے جو کہ بزرگ، بزرگ زادہ ہے خبردار ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جاوے ورنہ، نہ تیری خبر گیری ہوگی اور نہ ہی میری بلکہ حضرت کی خدمت میں حاضر رہ کر خدمت گزاری کرے۔ حضرت نے اپنے مقام پر رہ کر تبلیغ اسلام شروع کی۔ مسماۃ انیکا راجہ کا فرمان پاتے ہی بہ دل و جان حضرت کی خدمت میں حاضر رہنے لگی۔ باطن میں حضرت سے مشرف بہ اسلام ہوئی اور کلام مجید پڑھنا شروع کیا۔ حضرت اپنے مقام پر رہ کر لوگوں کو کرامات دکھاتے رہے۔ خدام ہر وقت حضرت کی خدمت میں رہتے۔ ہندو بھی حضرت کے پاس آ کر فیض حاصل کرتے رہے۔ سیلہ کھیڑہ میں بے شمار ٹھاکر دوارے یعنی مندر تھے۔ جن کا تعلق رام دیال برہمن سے تھا۔ جو سنگراسی کے نام سے مشہور تھا کی آمد و رفت حضرت کے پاس ہوگئی۔ جس نے جام کمالیہ نوش کیا وہ بھی باطن میں مسلمان ہوگیا۔ ایک روز حضرت نے رام دیال سے فرمایا کہ باطن میں تم مسلمان ہو چکے ہو۔ اعلانیہ مسلمان ہو جاؤ۔ رام دیال نے کہا کہ حضرت میں جملہ ٹھاکر داروں کا سنگراسی ہوں۔ اعلانیہ مسلمان ہو جانے پر تمام مہنت میرے خلاف ہو جاویں گے۔

حضرت نے فرمایا کہ مہنتوں کی مخالفت کی پرواہ مت کرو۔ خدا واحد لاشریک سے ڈرو۔

رام دیال اعلانیہ مسلمان ہوگیا:

چنانچہ حضرت کا اشارہ پاتے ہی رام دیال نے فوراً اعلانیہ مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ حضرت کے مریداں خاص میں شامل ہو کر ہر وقت خدمت حضرت میں رہنے لگا۔ اور فیض حاصل کرتا رہا۔ رام دیال برہمن کا اسلامی نام حضرت نے اپنے نام سے ملا کر شیخ کمال رکھا۔ جس کی اولاد قصبہ کیتھل میں بکثرت آباد تھی۔ جو کہ قصاب کہلاتے تھے ان کے ہاں شیخ کمال کے وقت کے بہی کھاتہ بطور یادگار موجود تھے۔ وہ لوگ فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم برہمن تھے اب قصاب ہیں۔ شیخ کمال کی اولاد سے موسے قصاب وغیرہ تھے جو اب ڈیرہ غازیخان آباد ہیں۔

چونکہ حضرت امیر السادات سید کمال ترمذی کے والدین حیات تھے اس لئے زیارت والدین و وطن کا

شوق حضرت کو ہوا جو خدام وطن سے ہمراہ آئے تھے ان کے ہمراہ وطن روانہ ہوئے۔ وطن پہنچنے سے قبل حضرت غزنی تشریف لے گئے۔ غزنی میں سلطان محمود سے ملاقات ہوئے۔ سلطان سے حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ملک ہندوستان خوب تر ہے۔ جہاں ہر اہل ہنود بت پرست رہتے ہیں۔ تم چند بار ہندوستان پر حملے کر چکے ہو۔ لیکن تم فتح نہ کر سکے۔ فتح ہند و تمہارے پسر جس کا نام شہاب الدین غوری ہوگا اور قہر سے برآمد ہوگا کے نام پر ہوگی۔

امیر السادات دوبارہ عازم ترمذ ہوئے:

میر السادات سید کمال ترمذی چند سال کیتھل میں قیام کرنے کے بعد پدر بزرگوار سے ملنے کی خاطر دوبارہ عازم ترمذ ہوئے جب حضرت کو ترمذ شریف میں کافی عرصہ گذر چکا تو حضور پاک رسالتماب محمد مصطفےٰ ﷺ کا حکم ہوا کے ہندوستان میں پہنچ کر دعوت اسلام دیں۔ چنانچہ بہ تعمیل حکم آنحضرت امیر السادات نے دوبارہ اپنی بی بی بچوں اور رفقاء کے ہمراہ قصد ہند کیا اور ہندوستان تشریف لا کر انہیں مقام سیلہ کھیڑہ درخت جال جس کو اب کیتھل کہا جاتا ہے قیام فرما ہوئے اور بدستور تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔ آپ کی توجہ سے ہزارہا آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مراجعت حضرت بطرف وطن مبارک:

حضرت سید کمال ترمذی کافی عرصہ تک تبلیغ فرماتے رہے۔ والدین کی زیارت کیلئے معہ پسر حضرت ابراہیم کے دوبارہ واپس بطرف وطن تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں حضرت کی سلطان شہاب الدین غوری سے ملاقات ہوا۔ اور عرض کیا کہ بارگاہ رسالت سے حکم ہوا ہے کہ میں آپ سے فتح ہندوستان کیلئے امداد لوں۔ اس لئے معہ لشکر جرار آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے چلا تھا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے اور عرض کیا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں پرتھوی راج پر حملہ کرنے کا ہے۔ میری امداد کی جاوے حضرت نے فرمایا کہ بندہ عرصہ دراز سے زیارت والدین سے محروم ہے۔ میں زیارت والدین کیلئے وطن جا رہا ہوں۔ میں واپس نہیں ہوسکتا۔ البتہ میں اپنے پسر ملک ابراہیم کو ہمراہ کرتا ہوں۔ خدا کے نام پر حملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو فتح عطا فرماوے گا۔ چنانچہ حضرت نے سید ملک ابراہیم ترمذی کو شہاب الدین غوری کے حوالہ کر کے خود تن تنہا ترمذ شریف روانہ ہو گئے۔

عطائیگی ولایت قصبہ کیتھل و مستقل سکونت تشریف آوری بار سوئم بسوئے ہند' حضرت سید کمال ترمذی

حضرت سید کمال ترمذی جب وطن تشریف فرما ہوئے تو سید السادات قطب الاقطاب حضرت سید عثمان والد بزرگوار اور والدہ محترمہ انتقال فرما چکے تھے۔ جن کے انتقال پُر ملال کا حضرت کو بہت صدمہ ہوا۔ چندے صدمہ انتقال والدین گزار رہے تھے کہ ایک روز الہام حضور آقا دو جہاں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوا کہ تم کو قصبہ کیتھل ہندوستان کی ولایت عطا کی

جاتی ہے۔ معہ اہل وعیال ترمذ سے ترک سکونت کر کے فوراً پہنچو۔ بہ تعمیل حکم سید الانبیاء فخر دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سید کمال ترمذی معہ زوجہ مائی عائشہ' برخورداران وخدام بے شمار کے ترمذ شریف کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خیر باد فرما کر بطرف کیتھل کوچ فرمایا اور راستہ میں اظہار کرامات فرماتے ہوئے قصبہ کیتھل تشریف اائے۔

مسماۃ انیکا اعلانیہ مسلمان ہوئی:

جب سطان شہاب الدین دہلی فتح کر چکا تھا۔ مسماۃ انیکا قلعہ میں موجود تھی جو باطن میں مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی۔ حضرت کی خدمت میں رہ کر کلام مجید پڑھ کر حفظ کر چکی تھی۔ حضرت کے بار سوئم تشریف لانے پر جبکہ سلطان شہاب الدین دہلی فتح کر چکا تھا۔ پرتھوی راج مارا جا چکا تھا۔ مسماۃ انیکا اعلانیہ مسلمان ہوئی۔ حضرت نے اس کا نام حافظہ جمال بی بی رکھا۔ حافظہ جمال بی بی نے قلعہ خود برائے رہائش حضرت پیش کیا۔ چنانچہ موصوف نے قلعہ مذکور میں رہائش اختیار کی۔ حافظہ جمال بی بی دہلی چلی گئی جہاں جا کر وفات پائی۔ جس کا مزار متصل خانقاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ قریب لاٹ قطب صاحب پرانی دہلی میں ہے۔ اس زمانہ میں شہر کیتھل آباد نہ تھا۔ صرف سیلہ کھیڑہ آباد تھا۔ جگہ جگہ مندر تھے۔ مندر انیکا میں بے شمار بہت ہی بت تھے۔ حضرت کے خدام ہر وقت حضرت کی خدمت میں رہتے۔ شیخ کمال جو صاحب کمال تھے بھی تمام دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ سیلہ کھیڑہ میں اقوام راجپوت بکثرت آباد تھی۔ راجپوتوں کا چوہدری جس کا نام کالے رولے تھا بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ آخر ایک روز حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کالے رولے کفر کے اندھیرے سے نکل کر اسلام کی روشنی میں کیوں نہیں آتا۔ یہ حکم پاتے ہی کالے رولے فوراً کلمہ توحید پڑھ کر داخل اسلام ہو گیا۔ جس کا اسلامی نام نور محمد رکھا گیا۔ یہ بھی خاص مریدوں میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ اس نور محمد کی بھی کیتھل میں اولاد بکثرت تھی۔ وہ بھی قصاب کہلاتے تھے۔

شیخ کمال نومسلم کو شہید کر دیا گیا:

باشندگان سیلہ کھیڑہ خدام اور مریداں نومسلم کو بوجہ بغض اسلام طرح طرح کی تکالیف دیتے رہتے۔ ایک روز چند مریدان کسی خاص ضرورت کے بستی سیلہ کھیڑہ گئے۔ اہالیان سیلہ کھیڑہ نے ان کو روک کر حضرت کی شان میں نہایت گستاخی سے کلمات نکالے۔ مریدان کو بھی جوش آ گیا آپس میں لڑائی ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ کمال نومسلم شہید ہو کر داخل جنت ہو گئے۔ جن کی نعش کو باقی ماندہ مرید اٹھا کر حضرت کمال ترمذی کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت کو مرحوم سے بہت محبت تھی۔ رنجیدہ ہو کر حضرت نے سیلہ کھیڑہ کے حق میں بددعا فرمائی کہ سیلہ کھیڑہ بددعا سے فوراً تہہ و بالا ہو گیا۔ جس کا نشان اب بھی بطور ٹیلہ موجود تھا۔ باشندگان شہر ہر خاص و عام کی زبان پر تھا کہ سیلہ کھیڑہ حضرت ترمذی صاحب کی بددعا سے الٹا گیا تھا۔ شیخ کمال کی قبر پختہ احاطہ مزار حضرت سے باہر جانب جنوب تالاب انیکا کی طرف ایک درخت جال کے نیچے تاقیام ہندوستان موجود تھی اور قابل مرمت تھی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت نے کفاروں پر جہاد فی سبیل اللہ کیا۔ بہت لوگوں کو مشرف بہ اسلام فرمایا اور ہندوستان میں بے شمار بت مسمار کیے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ فرش مزار حضرت پتھروں کے بتوں سے باندھا گیا۔ عرصہ گذرا کثرت باران رحمت سے فرضی مزار ٹوٹ گیا اور غار پڑ گیا۔ غار فرش سے بکثرت بت شکستہ نکل پڑے۔ جاروب کش پیرو شاہ فقیر نے بڑے بڑے بت غار سے نکال کر باغ میں جو کچے تالاب بنے ہوئے تھے کے کنارے منہ ہاتھ دھونے اور نہانے کیلئے رکھ دیئے۔

رات کو پیرو شاہ نے جناب اکرام الحق ترمذی کے والد بزرگوار سید محمد علی ترمذی مرحوم کی خدمت میں عرض کیا۔ بزرگوارم نے پیرو شاہ کو بتلایا کہ فرش مزار حضرت تمام بتوں پر بنایا گیا تھا جو یہ بات سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے کیونکہ حکومت انگریز کی ہے اہل ہنود کا زور ہے ایسا نہ ہو کہ ہندو باخبر ہو جاویں۔ کوئی شر نہ اٹھاویں۔ اس لئے راتوں رات وہ بت جو کہ کنارہ تالاب پر رکھے ہیں کو اٹھا کر غار میں ڈال دو۔ پیرو شاہؒ نے مرحوم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بت غار میں دفن کر دئے۔

سید خواجہ علی عرف سبز خط

ترمذ شریف میں سید خواجہ علی ہمشیرہ زادہ حضرت سید کمال ترمذی جن کا ذکر پیشتر ہو چکا ہے موجود تھے ان کو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت ہوئی کہ اپنے ماموں کی امداد کیلئے ہندوستان پہنچو۔ جنہوں نے عرض کی کہ ان کو یہ معلوم نہیں کہ ماموں بزرگوار ہندوستان میں کس جگہ پر ہیں۔ حکم ہوا کہ اپنے آگے اپنا عصاء رکھتے ہوئے چلے جاؤ۔ عصاء سے سبز گھاس کا خطہ ہوتا چلا جائے گا۔ جس جگہ سبز خطہ ختم ہو جاوے اسی جگہ تمہارے ماموں ہوں گے۔ سید خواجہ علی اس طرح اپنے ماموں کے پاس پہنچ گئے۔ بدیں وجہ خواجہ علی کا نام خواجہ سبز خطہ مشہور ہو گیا۔ ان کا مزار احاطہ مزار امیر السادات سے علیحدہ چبوترہ پر موجود تھا۔ جن کے والد حضرت سید حامد اور ان کے لڑکے سید یوسف وغیرہ بھی ہمراہ تھے۔ سید حامد کا مزار دروازہ جامع مسجد کیتھل سے بائیں طرف ایک چہار دیواری برلب سڑک واقعہ تھے۔ ان کے پسر سید محمد یوسف موضع پھور جو کہ شہر کیتھل سے قریباً 20 کلومیٹر کے فاصلہ پر علاقہ اسلام آباد عرف تانیسر میں واقع ہے کی ولایت ملی۔ جنہوں نے ایک کھنکار میں چودہ موصغات کفر تباہ کئے تھے۔ سید یوسف کی اولاد موضع پھور' سامانہ میں آباد تھی۔ جن کا آبائی نسب نامہ یہ ہے:

سید یوسف بن سید خواجہ سبز خطہ بن مخدوم سید حامد بن سید حسین بن سید علی بن سید احمد چراغ خراساں بن حضرت سید عارض بن سید علی ثانی بن سید موسیٰ میر قابن' بن حضرت امام تقیؑ۔

حضرت امیر السادات سید کمال ترمذی سیلہ کھیڑہ میں تبلیغ اسلام و جہاد فرما رہے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ خواجہ معین الدین چشتی سنجریؒ اجمیری شریف میں تبلیغ فرما رہے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر بڑے

پائے کے بزرگان دین آئے اور اسلام کو فروغ دیتے رہے۔

جب حضرت امیر السادات سید کمال ترمذی جملہ مہمات دینوی و دنیاوی سرانجام دے چکے تو ایک روز اپنے حجرہ مبارک میں خنجر سادات سید حسام الدین ترمذی فرزند کلاں کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ اے فرزند اب ہم اپنے کاموں سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دو یوم بعد 4 رجب المرجب کو ہمارا کوچ ہے۔ ہماری رحلت کے بعد تم ہماری جگہ سجادہ ہو گے۔ اسی پیشگوئی سے دو یوم بعد غسل فرمایا اور نماز ادا کر کے حضرت سید حسام الدین ترمذی کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا کہ ہمارا وقت قریب ہے۔ بعد انتقال ہمارے جسم کو اول درخت جالی جو کہ تالاب و مندر کے درمیان ہے اور جس کے نیچے ہم روز اول آ کر بیٹھے تھے دفن کرنا۔ اس کے بعد قلعت جامہ وعمامہ خاص جو مرشد کی طرف سے عطا ہوا تھا حضرت سید حسام الدین ترمذی کے زیب تن کر دیا۔ سید حسام الدین ترمذی کو اپنے سینے مبارک سے چمٹایا۔ علم اور جملہ کرامات تفویض فرمائے اور رتبہ ہمسری بخش کر کامل اولیاء بنایا۔ حضرت سید حسام الدین ترمذی کو مفارقت حضرت سے رقت طاری ہو گئی۔ حضرت نے فرزند مذکور کی تسلی و تشفی فرما کر ہدایت فرمائی اب حجرہ سے باہر جاؤ۔ خود بارگاہ ایزدی میں سر نیاز جھکا دیا۔ بعد عشاء یعنی نماز رخصتی حضرت سید حسام الدین ترمذی حجرہ مبارک میں پہنچے تو حضرت سید السادات کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون'' آپ کی وفات 4 رجب المرجب 712 ہجری بوقت نماز عشاء پنجشنبہ جمعہ مبارک کی درمیانی شب کو ہوئی۔ چنانچہ جمعہ کے روز حضرت کی تجہیز و تکفین ہو کر درخت جالی کے سایہ میں مدفون ہوئے اور زیارت گاہ مزار شریف حضرت تا قیام ہندوستان تھا۔ تالاب و مندر موسومہ انیکا اب تک موجود ہے ان ہر دو کے درمیان مزار اقدس حضرت ہے وہ درخت جال جس کے نیچے حضرت اول مرتبہ ہندوستان تشریف لا کر بیٹھے تھے۔ اب تک مزار پر سایہ کئے ہوئے موجود ہے۔ تالاب انیکا پر جانب غرب و شمال و شرق سادات اولاد حضرت کا قبضہ تھا۔ احاطہ مزار کے اندر تین مزار ہیں۔ اول مزار حضرت سید کمال ترمذی شاہ ولایت اولین کا ہے۔ دوئم حضرت سید حسام الدین ترمذی صاحب سجادہ۔ سوئم مزار ام السادات ترمذی کیتھل یعنی زوجہ محترمہ حضرت امیر السادات و والدہ ماجدہ صاحبہ سجادہ حضرت سید حسام الدین ترمذی کا ہے۔

روایت کی جاتی ہے کہ ہر سہ مزارات پر کسی وقت میں روضہ کی شکل میں گنبد بنوایا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خاندان کے بزرگ کو خواب میں حضرت نے اشارہ فرمایا کہ میں سایہ درخت جال پر خوش تھا لیکن تم لوگوں نے جال کٹوا کر گنبد بنا دیا ہے۔ اپنا تعمیر کردہ گنبد ہٹا لیا جائے۔ مگر خواب کی بات کو اہمیت نہ دی گئی اور نہ پرواہ کی گئی کچھ عرصہ کے بعد گنبد خود بخود نیچے آ رہا اور درخت جال کی شاخ نکل آئی۔ یہ ماجرہ دیکھ کر تمام عمارت روضہ صاف کر دی گئی۔ چہار دیواری معہ فرش پختہ بنوا دیا گیا۔

غزل

پس زنداں ہوئے ہیں خواب سارے
ابھی گردش میں ہیں حالات پیارے
غموں کے باداباں ہیں کس نے کھولے
ابھی تک سوچ میں ڈوبے ہیں دھارے
یہ بہتر ہے کہ مجھے تم بھول جاؤ
نہیں ملتے کناروں سے کنارے
ابھی تو چیونٹیوں کے پر ہیں نکلے
ابھی افلاک سے ٹوٹیں گے تارے
اندھیرے بڑھ رہے ہیں بستیوں میں
کہاں جاکر چھپے ہیں چاند تارے
محافظ بھی بنے ہیں راہزن اب
وطن کی خیر ہو یارب ہمارے
سکوں ملتا نہیں اب ڈھونڈنے سے
بکھرتے جارہے ہیں غم کے دھارے
ہمیں خوشحالیوں نے کیا دیا ہے
ابھی تک بھوک ہے گھر میں ہمارے
زمین کی نبض پر ہے ہاتھ اپنا!
مگر گردش میں ڈوبے ہیں ستارے
مراسم یوں نہیں رکھتے کسی سے
جواں ہیں بیٹیاں گھر میں ہمارے
ابھی تک خون رستا ہے دہن سے
کبھی ڈھونڈے تھے ہم نے بھی سہارے
ابھی پگھلی نہیں ہے برف شفقت
ابھی غفلت میں ڈوبے ہیں شرارے

شاعر: رانا شفقت عظیم، لاہور

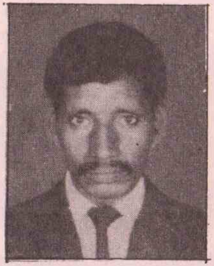

غزل

دل سوچ کا پنجرہ ہے اک بار ہی کھلتا ہے
دل پیار کا سودا ہے اک بار ہی تلتا ہے
دل یاد کا بادل ہے بے انت برستا ہے
دل پیار کا بھوکا ہے اپنوں کو ترستا ہے
دل موج کا دریا ہے سینے سے نکلتا ہے
دل برف کا تودا ہے جمتا نہ پگھلتا ہے
دل سیپ کا موتی ہے نظروں میں چمکتا ہے
دل ہجر کا پتھر ہے نظروں میں کھٹکتا ہے
دل پیاس کا دریا ہے بے چین سا بہتا ہے
دل درد کا ٹکڑا ہے بے چین سا رہتا ہے

حاجی علی حسن گوجر، وہاڑی

کیا صدر مملکت آصف علی زرداری بے نظیر کا مشن پورا کرسکیں گے

آصف علی زرداری نے ہمیشہ پیپلز پارٹی کی عزت وحمیت کو خود سے زیادہ مقدم رکھا ہے

محترمہ کی معاونت کیلئے زرداری ہمیشہ متحرک فعال اور پُرخلوص جدوجہد کرتے رہے ہیں

اُنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پاک عراق تعلقات کا جمود توڑا

صدر مملکت آصف علی زرداری دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے پُرعزم ہیں

رپورٹ: مون ڈائجسٹ

محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت سے قبل آصف علی زرداری کی پہچان اُن کی شوہر کی حیثیت سے ایک ایسے شخص کے طور پر رہی ہے جو محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورحکومت میں وزیر اعظم ہاؤس اور اپوزیشن کے دور میں جیل میں رہتے تھے۔ پولو کھیلنے کا شوقین، دوستوں کا دوست، شادی کے 19 برسوں میں سے ساڑھے گیارہ برس اُس نے جیل میں ایسی ثابت قدمی سے گزارے کہ اپنے تو کیا سیاسی مخالفین نے بھی اُنہیں ''مردِ حُر'' کا خطاب دیا۔ حکمران بیوی کا شوہر ہونے کی وجہ سے آصف علی زرداری کو نیک نامی کے ساتھ ساتھ کئی اسکینڈلز کا سامنا بھی رہا، ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' کا لفظ بھی اِسی بناء پر اُنہی کے ساتھ منسوب کیا گیا لیکن طویل نظر بندی اور مختلف مقدمات کے بعد آج اِن تمام الزامات کی حیثیت پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں ہے۔ آصف علی زرداری نہ صرف طویل عدالتی مقدمات سے باعزت بری ہو چکے ہیں بلکہ قومی مفاہمتی آرڈی نینس کے تحت اُن کے خلاف دیگر مقدمات کے خاتمے کا عندیہ بھی مل چکا ہے۔ عام انتخابات میں اگرچہ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو تیسری بار وزیر اعظم بنانے کا اعلان کیا گیا تھا لیکن اُن کی افسوس ناک شہادت کے بعد ملکی سیاست کا منظر نامہ ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ پیپلز

کسی بھی اچھے سفارت کی تمام خوبیاں آصف علی زرداری میں بدرجہ اتم موجود ہیں

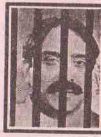

انہوں نے بڑے صبر وتحمل اور برداشت کے ساتھ طویل **عرصہ تک جیل** کاٹی ہے

آصف علی زرداری پر بے شمار مقدمات بنائے گئے مگران پر کوئی جرم ثابت نہ کیا جاسکا

پارٹی کے اندر بھی کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اِس وقت آصف علی زرداری کے کندھوں پر (جو پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئر مین ہیں) اصل ذمہ داری پیپلز پارٹی کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی خواہش کے مطابق منظم رکھنا اور پارٹی اُمیدوار کو وزیرِاعظم بنوانا ہے۔ سیاسی تجزیہ کاروں کا کہنا یہ ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت نے اِس ٹارگٹ کو نسبتاً آسان بنادیا ہے کیونکہ شہید محترمہ بے نظیر بھٹو زندہ بے نظیر بھٹو سے زیادہ طاقتور نظر آتی ہیں۔ اُنکی بے وقت شہادت نے پیپلز پارٹی اور اُسکے ہم خیال حلقوں میں عوامی طاقت کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے [illegible] بے نظیر بھٹو جو مشن لیکر وطن واپس آئی تھیں [illegible] س کی خاطر ان کو اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑا [illegible] صف علی زرداری ان کا یہ مشن جاری رکھ سکیں گے۔

18 فروری 2008ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی ملک کی سب سے بڑی اکثریتی جماعت بن کر اُبھری ہے۔ اب آصف علی زرداری کا امتحان شروع ہو گیا ہے کہ وہ کس طرح اپنے اُمیدوار کو وزیرِاعظم بنوانے کیلئے سیاسی پارٹیوں سے جوڑ توڑ کرتے ہیں۔ صدر پرویز مشرف کے ساتھ مفاہمت کے عمل کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی پارٹی کی مقبولیت کو کس طرح برقرار رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر پارٹی کو اندرونی ٹوٹ پھوٹ اور گروپ بندی سے کس طرح بچاتے ہیں؟ یہ سب کچھ اُنکا کڑا امتحان ہے۔ چونکہ ملکی سیاسی تاریخ میں پہلی بار پاکستان پیپلز پارٹی بھٹو خاندان کی سیاسی قیادت سے محروم ہوئی ہے، لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ آصف علی زرداری اِس اہم مہم کو کس طرح پورا کرتے ہیں؟

''آصف علی زرداری'' کے متعلق ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جو منصوبہ دراصل ''پیپلز پارٹی'' کے خلاف تھا، سیاسی متقدر حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا کردی گئیں، چونکہ اِس سے قبل آصف علی زرداری کو لوگ بحیثیت سیاست دان نہیں جانتے تھے۔ اگرچہ اُنکا تعلق سیاست دان گھرانے سے تھا۔ لیکن وہ محترمہ سے شادی کے بعد منظر عام ہوئے، نہ ہی آصف زرداری نے کبھی سیاست میں آنے کا سوچا تھا اور نہ ہی اُنہیں ''پبلک فگر'' بننے کی خواہش تھی۔

''محترمہ بے نظیر بھٹو'' کی قیادت میں جہد مسلسل کے بعد پیپلز پارٹی 2 دسمبر 1988ء کو برسر اقتدار ہوئی۔ محترمہ کی زیرِ قیادت پیپلز پارٹی اور خود محترمہ کی مقبولیت سے مخالفین خائف رہنے لگے اور اُنکو اپنا سیاسی مستقبل سیاہ و تاریک نظر آنے لگا۔ داخلہ و خارجہ سطح پر پیپلز پارٹی جب اپنے منشور کے مطابق فریضہ سرانجام دینے میں کامیاب نظر آئی تو مخالفین نے ذاتی سیاسی مفادات کے پیشِ نظر محترمہ کو اُلجھن میں ڈالنے کا منصوبہ تیار کیا تاکہ نہ صرف پیپلز پارٹی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ختم ہو بلکہ محترمہ اپنے فرائض منصبی کو پایہ تکمیل نہ کر سکیں اور اِس طرح اُن کی ذاتی سیاسی حیثیت ختم ہو جائے لہٰذا اُنکے شوہر آصف علی زرداری کی کردار کشی شروع کردی گئی۔

باوجود اِس کے کہ اگر آصف زرداری چاہتے تو 1988ء میں قومی اسمبلی کی نشست حاصل کر کے وزارت حاصل کر سکتے تھے۔ اِس طرح کرنے سے آصف زرداری مخالفین کو منہ توڑ جواب دے سکتے تھے لیکن آصف علی زرداری کو اِن معاملات میں نہ تو دلچسپی تھی اور نہ سیاست کی طرف وہ راغب تھے۔ مخالفین بدستور اپنے منصوبے کے تحت آصف علی زرداری کی

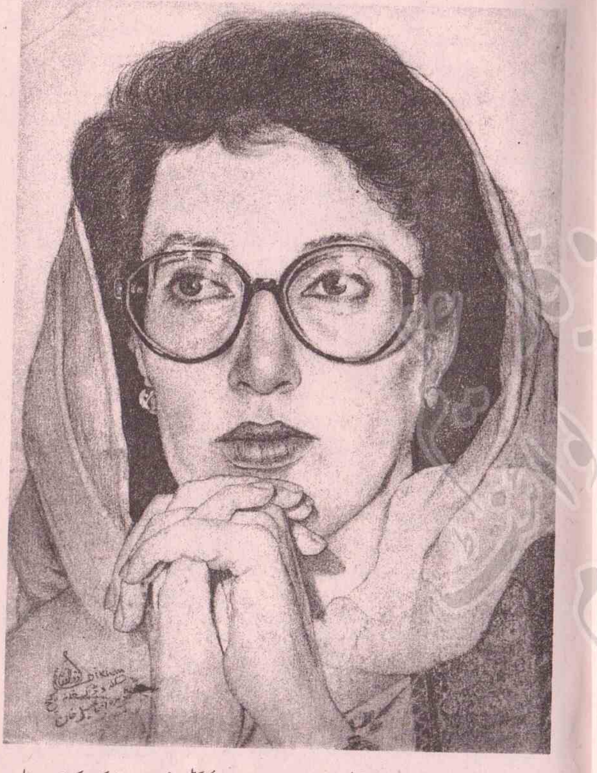

مخالفت کرتے رہے۔ اُن کی ذات کو مسلسل تنقید کا نشانہ بناتے رہے یہاں تک کہ عوام اور سیاسی حلقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا کہ صوبائی سطح پر نشست خالی کروا کر آصف علی زرداری، وزارت اعلیٰ کو حاصل کر کے مخالفین کا پروپیگنڈہ تہس نہس کر دیتے لیکن آصف علی زرداری

نے پیپلز پارٹی کی جہد مسلسل اس کی عزت وحمیت کو اپنی ذات سے زیادہ مقدم سمجھا۔

دیکھا جائے تو وفاقی اور صوبائی سطح پر سیاست میں باقاعدہ شامل نہ ہونا پارٹی کیلئے پہلی قربانی تھی۔ آصف علی زرداری پیپلز پارٹی کو مقدم سمجھتے رہے اور باوجوہ خاموش رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنکی خاموشی کو مخالفین نے استعمال کرتے ہوئے آصف علی زرداری کو آسان ہدف سمجھا اور اپنے منفی عزائم کی تکمیل کیلئے ہر منفی ہتھکنڈا آزمایا گیا۔ نتیجتاً عوام میں آصف علی زرداری کی شخصیت کو مبہم شخصیت بنادیا گیا۔ شکوک وشبہات کو اس وقت یقین میں بدلنے کا وقت سازگار ثابت ہوا جب...... پیپلز پارٹی کی حکومت کو سابق صدر غلام اسحاق خان نے 6 اگست 1990ء میں 58-2B کے تحت ختم کردیا۔

''وہی 58-2B جس نے نظریہ ضرورت کی کوکھ سے جنم لیا تھا''...... یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ 'نظریہ ضرورت' ہمارے ملک میں تاریخی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے نظریہ ضرورت سیاست کا خواصہ بن گیا ہے جسے منفی رویہ سے استعمال میں ضرور لایا جاتا ہے۔ ویسے ''نظریہ ضرورت'' بھی کمال نظریہ ہے، جس کی داد دیئے بغیر انسان نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ مفاد پرست عناصر جب چاہیں، جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں، اپنے منصوبے خواہ وہ قلیل المدت ہوں یا طویل المدت، اپنی مرضی سے پایہ تکمیل کرتے ہیں۔ صدیوں میں رقم ہونے والی تاریخ کو لمحوں میں مرتب کرلیا جاتا ہے۔

''نظریہ ضرورت'' سابقہ حکمرانوں کا بالعموم اور موجودہ حکمرانوں کا بالخصوص وطیرہ بن چکا ہے۔ کیونکہ نظریہ ضرورت کا استعمال حکمرانوں کے ذاتی مفادات کے حصول نیز عوام کو دردآگین حادثات سے دوچار کرنے کا ''مجرب نسخہ'' ہے۔ کائنات کے ہر سوال کا جواب اور اپنی بابت اُٹھنے والی ہر نگاہ کی استفہامیہ لہروں کو لوٹانے کا ہنر نظریہ ضرورت کی ڈھال سے ممکن ہوگیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریہ ضرورت کا استعمال اور اُسکے نتائج بالآخر ثابت قدم آصف علی زرداری اور عوام کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ جس کی زندہ مثال 6 اگست 1990ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے برطرف ہونے کے ایک ماہ بعد آصف علی زرداری کی گرفتاری ہے۔ اُنہیں وزیراعظم کی رہائش گاہ سے ایک ماہ بعد جیل کی کوٹھری میں ڈال دیا گیا جہاں دنیا بھر کے مسائل آصف علی زرداری کے منتظر تھے اور پھر دو، چار نہیں سیدھے بارہ مقدمات قائم کردیئے گئے۔ کامیاب منفی منصوبہ بندی کے عین مطابق آصف علی زرداری کو تقریباً اڑھائی برس جیل کاٹنا پڑی، مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔

اگرچہ اُن پر کسی قسم کا چارج نہ تھا۔ یہی وہ مقام تھا کہ جہاں ''شہید ذوالفقار علی بھٹو'' کے خون ناحق پر تعمیر پیپلز پارٹی ضیاء دور کے بعد ایک مرتبہ پھر بتلا کا شکار ہوئی۔ آصف علی زرداری کے خلاف عائد مقدمات میں باعزت بری ہونا پیپلز پارٹی کی ساکھ بحال کرنے کے مترادف ہوگیا...... دانشور طبقہ سے عام آدمی تک سب کی سوچ یکساں تھی۔ خیال پایا جانے لگا کہ آصف علی زردار کی باعزت بری ہونے سے پیپلز پارٹی کا مستقبل مشروط ہے۔ آصف علی زرداری بارہ مقدمات میں سے نو مقدمات میں بے قصور ثابت ہوئے جس کی بناء پر اُنہیں باعزت بری کردیا گیا اور تین مقدمات دفعہ 249 کے تحت عدالت نے ختم کردیئے۔

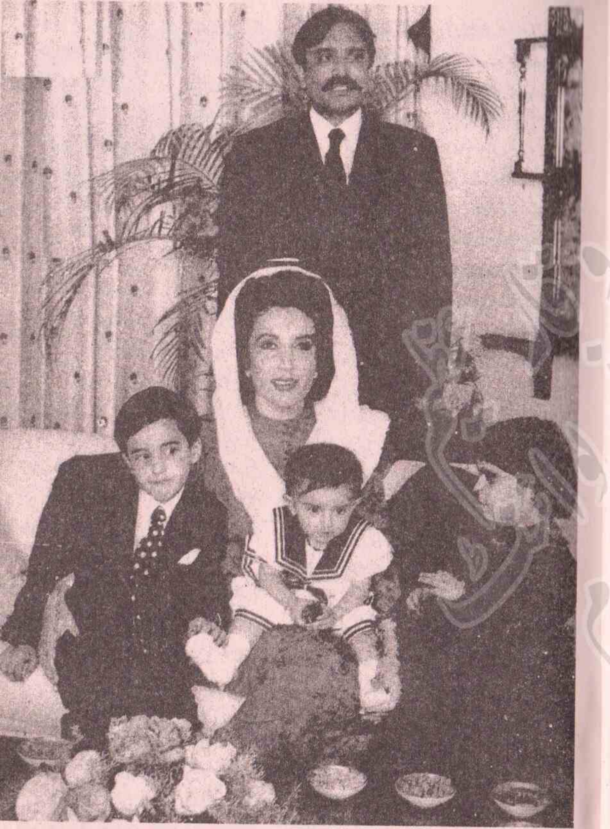

آصف علی زرداری کی یہ فتح پیپلز پارٹی کے روشن مستقبل کی نوید تھی لیکن اڑھائی برس تک بے قصور جیل

کاٹنا اور مقید رہنا یقیناً صبر آزما اور حوصلے کا کام تھا جسے آصف علی زرداری نے نبھایا۔ ہمارے ہاں جیلوں کی صورتحال کیا تھی اور کیا ہے؟ میرے خیال میں یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جیل کے ایسے خوفناک اور بھیانک ماحول میں آصف علی زرداری کا مقید رہنا دراصل وہ مقام تھا کہ جہاں آصف علی زرداری نے تہیہ کرلیا کہ وہ عملاً سیاست میں آئے گا کیونکہ اپنی مرضی سے زندگی گزارانے والا، آزاد منش، دوست پسند اور نبھانے والا عجب آزاد مرد آصف علی زرداری جیل سے باعزت بری ہوکر جب واپس لوٹا تو وہ اُس مقام پر کھڑا تھا کہ جہاں اُس کا عملاً سیاست میں داخل ہونا ناگزیر تھا۔

جیل کی صعوبتیں، جھوٹے مقدمات کا سامنا، بے بنیاد الزامات کے پس منظر میں آصف علی زرداری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جمہوریت پر عزم راسخ وصحت مند سیاسی اطوار پر ایمان رکھتے ہوئے آصف علی زرداری سیاست کی پُر خار وادی میں داخل ہوا۔ 1993ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی۔ اِس بار آصف علی زرداری ''بحیثیت سینیٹر'' عوام کے سامنے آئے۔ پیپلز پارٹی کے دوسرے دور اقتدار میں آصف علی زرداری کی مرکزی کابینہ میں شمولیت اور پھر ''محترمہ بے نظیر بھٹو'' جو مملکت پاکستان کی وزیر اعظم تھیں، اُنکے شوہر ہونے کی وجہ سے پاکستانی سیاست اور خصوصاً پیپلز پارٹی میں واضح ونمایاں پوزیشن حاصل رہی۔

اب اُن کی توجہ سیاست کی طرف بھرپور تھی اور پارٹی میں موجودگی سے وہ بہتر طور پر پیپلز پارٹی میں موجود مختلف شخصیات کے اوصاف وعادات سے واقف ہوتے چلے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کو معلوم ہوگیا کہ پارٹی کیلئے کونسے رہنما تہہ دل سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں کہ جو پارٹی کے اندر توڑ پھوڑ اور گروپ بندی کے عزائم رکھتے ہیں۔ آصف علی زرداری بطور حکومتی نمائندہ 9 فروری 1994ء میں گیارہ ٹن ادویات واجناس لے کر جب زمین انبیاء وآئمہ طاہرین (عراق) گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلامتی کونسل کی طرف سے 1992ء میں عراق پر اقتصادی پابندیاں عائد کی گئیں جسکی وجہ سے قدرتی وسائل اور ذہنی وقلبی نکتہ نظر سے دنیا کی امیر ترین عوام اجناس وادویات کی قلت کا شکار ہوگئی''

بوڑھے، بچے، جوان اور خواتین کی اموات بوجہ مفلسی ہونے لگیں۔ اِس کے پیش نظر آصف علی زرداری عراق گئے تو واپسی پر اُنہیں عالمی سطح اور بالخصوص پاکستان میں سراہا گیا۔ کسی بھی اچھے سفارت کار کی خوبیاں اور اوصاف بھی آصف علی زرداری میں بدجہ اُتم موجود ہیں، جسکی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

☆ اِس میں کوئی کلام نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جہاں پاک عراق تعلقات انتہائی سرد مہری کا شکار ہوگئے لیکن آصف علی زرداری نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف پاک عراق تعلقات کا جمود توڑا بلکہ پاکستانی قیدی بھی رہا کروائے۔

☆ ایک مرتبہ آصف علی زرداری محترمہ کے ساتھ امریکہ کے دورہ پر گئے جہاں اُنہوں نے سندھی ثقافت کو اپنی صلاحیتوں کے عین مطابق ناقابل فراموش طریق سے اُجاگر کیا۔

☆ دورہ آسٹریلیا میں آصف علی زرداری کی صلاحتیں نکھر کر اُس وقت سامنے آئیں جب اُنہوں نے یورپی ممالک کو پاکستان میں سرمایہ کاری کیلئے راغب کیا۔ اِس سے قبل سابق حکومت اچھے سفارت کاروں کے فقدان کی وجہ سے ایسا کرنے میں ناکام رہی تھی لہٰذا آصف علی زرداری کی بطور اچھے سفارت کار صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

☆ آصف علی زرداری نے کبھی وزارت یا پارٹی عہدے کا مطالبہ نہیں کیا۔ سرمایہ کاری کی وزارت بھی اُنہیں اُس وقت ملی جب پیپلز پارٹی کو برسر اقتدار آئے لگ بھگ اڑھائی سال بیت چکے تھے۔ بطور وزیر وہ ایک وفد لے کر کوریا اور ہانگ کانگ گئے۔ اِن دونوں مذکورہ ممالک کے ساتھ کئی معاہدے کئے جس کے نتیجہ میں ہانگ کانگ کے مسٹر گورڈن 8 ارب ڈالرز کی سرمایہ کاری پر راضی ہوگئے اور جنوبی کوریا 4 ارب پندرہ کروڑ ڈالرز کی سرمایہ کاری کرنے پر رضا مند ہوگیا۔ صرف ایک دورہ سے آصف علی زرداری نے پاکستان کیلئے 12 ارب، 15 کروڑ ڈالرز کی سرمایہ کاری کی راہ ہموار کی۔

☆ آصف علی زرداری کو کونسل برائے تحفظ ماحولیات کا چیئرمین بنایا گیا تو اُن کے سامنے وہی دیرینہ مسئلہ وسائل کم اور مسائل زیادہ درپیش تھے۔ لیکن وہ گھبرائے نہیں بلکہ اپنی فہم وفراست سے پہلے اُنہوں نے ملک بھر کے دورے کئے۔ آلودگی کے خلاف رائے عامہ ہموار کی۔ ملک کو سرسبز وشاداب بنانے کیلئے ترغیبات دیں۔ اپنی اَن تھک کاوش سے فقط 1995ء میں کونسل برائے تحفظ ماحولیات کی مہم کے سلسلے میں تقریباً ستائیس کروڑ پودے لگوائے۔

آصف علی زرداری کی ملک کو سرسبز وشاداب بنانے کی مہم کو کامیاب کرنے کیلئے پٹرولیم اور قدرتی وسائل کے محکمہ نے 10 ہزار ایکٹر رقبہ پر 10 لاکھ پودے

لگائے۔ مختلف بینکوں کی طرف سے 6 کروڑ پودے لگائے گئے جبکہ پاکستان ریلوے نے اپنی ساڑھے پانچ ہزار ایکٹرز مین پر خاصی معقول تعداد میں پودے لگائے اور باقی پانچ ہزار ایکٹر رقبے پر پودے لگانے کا ہدف رکھا۔ اِسی طرح سٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن نے 16 ہزار ایکٹر رقبہ پر 80 لاکھ پودے لگائے۔

☆ پیپلز پارٹی 1993ء سے 1996ء تک برسر اقتدار رہی۔ اِس عرصہ میں ملک یا حکومت کے متعلق جب بھی مسائل پیدا ہوئے تو آصف علی زرداری نے ہمیشہ فعال کردار ادا کیا۔ لاہور میں میاں منظور احمد وٹو اور پیپلز پارٹی کے درمیان محاذ آرائی ہوئی اور منظور وٹو کی طرف سے پیپلز پارٹی کے کارکنان کے خلاف مختلف اشکال میں زیادتیوں کا سلسلہ عروج پر پہنچا تو پی ڈی ایف کی قیادت نے منظور وٹو کو وزارت اعلیٰ سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا تو پنجاب میں بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ آصف علی زرداری نے بردباری اور تحمل سے اراکین کو بغیر کسی مراعات یا لالچ کے راضی کرلیا اور اراکین نے برملا پی ڈی ایف کی حمایت جاری رکھی۔ اِسی طرح وہ لاہور میں اپنے قیام

کے دوران ناراض ساتھیوں کے گھروں پر پہنچ جاتے اور اپنے اخلاق اور اعتماد سے اُن کو منا لیتے اور اتحاد کی فضا قائم کردیتے۔

الزامات کی ایک بوچھاڑ تھی جو پے در پے آصف علی زرداری پر گزشتہ دور حکومت کی طرح عائد ہوتی چلی گئی۔ ابھی تو ایک منصوبہ آصف علی زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے درمیان علیحدگی کا تھا جو ناکام ہو گیا۔

☆صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کرنے کی غرض سے آصف علی زرداری نے قابل ذکر جدوجہد کی اور نہایت مثبت کردار ادا کیا۔

☆حکومت اور تاجران مذاکرات، حکومت اور حلیف جماعتوں کے تعلقات میں تسلسل، ربط اور اعتماد قائم رکھنے کیلئے آصف علی زرداری ہمیشہ پیش پیش رہے۔ کراچی میں دہشت گردی کے واقعات کے خاتمہ کیلئے اور محترمہ کی معاونت کیلئے آصف علی زرداری ہمیشہ متحرک، فعال، پُر خلوص اور اَن تھک جدوجہد کرتے نظر آئے۔

ہر کٹھن گھڑی میں اعتماد اُن کی شخصیت میں نمایاں نظر آیا۔ نتیجتاً دھڑے بندی کرنے والے متحرک ہو گئے۔ اِس طرح اندرون پارٹی کے بے شمار سیاسی رہنما کھل کر سامنے آئے۔ آصف علی زرداری سیاسی سازشوں سے مکمل آگاہ ہو گئے۔ ابھی وہ اِس مسئلہ کا تدارک نہ کر پائے تھے کہ پیپلز پارٹی مخالف قوتوں نے میر مرتضٰی بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے درمیان سیاسی تضادات کو عجیب و غریب رنگ دے دیا اور پھر آصف علی زرداری اور پھر میر مرتضٰی بھٹو میں کشیدہ فضا قائم کرنے کی کوشش کی۔

منصوبہ ساز کارخانوں میں سنگین منصوبے دھڑا دھڑ دن رات اوور ٹائم کے ساتھ بننے لگے۔ اِن خطرناک منصوبوں میں سے ایک المناک منصوبہ میر مرتضٰی بھٹو کا قتل تھا۔ پھر اِسی منصوبے کی کڑی محترم آصف علی زرداری سے منسوب کر دی گئی۔ بعد ازاں ایک مخصوص طریقہ کار جسے بین الاقوامی سامراجی قوت کہا جاتا ہے، اُسکے اشارے پر وفاداریاں بدلتے ہوئے ایمل کانسی کی گرفتاری، مہران بینک کا سکینڈل، امریکہ نواز پالیسی بلکہ امریکہ کی ہدایت پر سر تسلیم خم کرنے کی صلاحیت کے وارث محترم فاروق احمد خان لغاری نے 4 نومبر 1996ء کی رات پیپلز پارٹی کی حکومت دوبارہ اپنی مقررہ مدت پورا کئے بغیر 58-2B کے تحت ختم کر دی۔ سابق صدر فاروق لغاری کو پیپلز پارٹی نے اُنکی گذشتہ کئی برس کی خدمات خاص، محترمہ بے نظیر بھٹو کو بیٹی کہنے اور بالخصوص وفاداری کے پیش نظر صدر پاکستان مقرر کیا۔ مذکورہ تمام خصوصیات کے حامل فاروق احمد لغاری کا شاید صدر کے عہدہ تک پہنچنا ہی خواہش و مقصد تھا۔

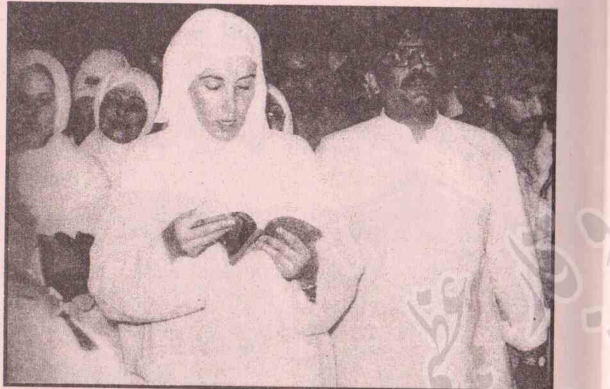

جیسے ہی یہ خواہش مکمل ہوئی تو سابق صدر فاروق احمد لغاری اپنے مذکورہ اوصاف بھول گئے۔ پھر وہی ''نظریہ ضرورت'' سابق صدر فاروق لغاری پر چند الزامات عائد ہوئے اور وہ ''سرینڈر'' کر گئے اور اپنی ساکھ برقرار رکھنے اور اپنے تحفظات کو پارٹی پر مقدم سمجھتے ہوئے ''پیپلز پارٹی'' کی حکومت برطرف کر دی۔ مکافات عمل کہ فوج و امریکہ پر اِترانے والے فاروق لغاری کے ساتھ مسلم لیگ (ن) کی دوتہائی اکثریت نے بہت بُرا سلوک کیا۔ نہ صدارت رہی اور نہ پارٹی میں عزت البتہ جیل سے بچ گئے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ محترم فاروق احمد خان لغاری اپنا کام کر چکے تھے۔

4 نومبر 1996ء کی تاریخ پیپلز پارٹی سے کہیں زیادہ آصف علی زرداری پر بھاری پڑی۔ گورنر ہاؤس لاہور سے اُنہیں گرفتار کر لیا گیا اور کہا گیا تھا کہ گرفتاری کے وقت اُنکے پاس سے کروڑوں روپے برآمد ہوئے۔ اِس انداز اور اِس طرح سے گرفتاری عمل میں لائی گئی کہ لوگ سمجھنے لگے کہ واقعتاً آصف علی زرداری کے پاس سے کروڑوں روپے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کروڑوں روپے پرس، جیب میں نہیں رکھے جاتے اور نہ ہی خاص و عام اِس قدر بڑی رقم ہمہ وقت اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔

بعد ازاں وقت گزرتا رہا اور آصف علی زرداری پر مختلف نوعیت کے مقدمات عائد ہوتے رہے۔ 1996ء سے لے کر 2001ء تک یہ سلسلہ ہائے مقدمات جاری رہا۔ ■■

پاکستان کے تمام مسائل کی ذمہ دار سول اور فوجی بیوروکریسی ہے

یہ صورتحال جمہوریت اور عوام کے لئے لمحہ فکریہ اور آئین و پارلیمنٹ کے منہ پر طمانچہ ہے۔

گریڈ 17 سے اوپر کے لوگ روپیہ کمانے اور فوجی وسائل لوٹنے میں مصروف ہیں۔

آجکل سیاست کا مقصد مالی مفادات کا حصول اور قومی وسائل پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔

جب امپورٹڈ لوگوں کو ایوان اقتدار کا گرین سگنل ملے تو ہم جیسوں کو ہجرت کر جانی چاہیے۔

پیپلز پارٹی کے سابق رہنما احمد سعید اعوان کا ایک چونکا دینے والا انٹرویو۔

ملک احمد سعید اعوان کا تعلق فیصل آباد کے ممتاز سیاستدانوں اور نظریاتی گروپ سے ہے پیپلز پارٹی کے بانیوں میں شامل ہیں اکتوبر 1969ء میں جب پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو ذوالفقار علی بھٹو کی صفوں میں شامل ہو گئے اور ان کی نظریاتی فوج کے ہراول دستے کا حصہ بن گئے۔ 70ء کے انتخابات میں پر جوش تقریروں کے باعث غریبوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ پنجاب اسمبلی کے علاوہ قومی اسمبلی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو کے دور حکومت میں وزیر مملکت برائے اطلاعات ونشریات بھی رہے۔ بعد ازاں لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس مقرر کر دیئے گئے مگر مخالف سیاسی جماعتوں کی کڑی تنقید اور الزامات کے

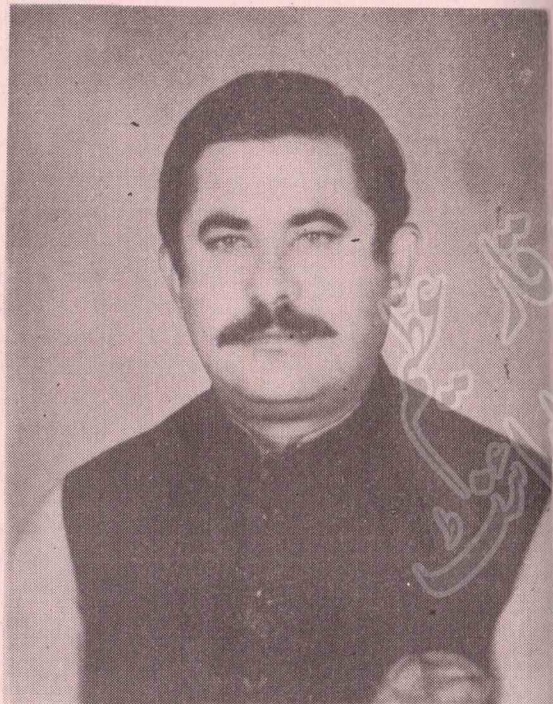

باعث استعفیٰ دے دیا۔ 2002ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے مسلم لیگ (ن) کے ساتھ انتخابی اتحاد کیخلاف احتجاجاً الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ فیصل آباد میں پارٹی کی دھڑے بندیوں سے بددل ہو کر آج کل عملی سیاست سے الگ تھلگ ہو چکے ہیں۔ پیپلز پارٹی کو نظریاتی اور بھٹو کے افکار والی متحرک جماعت دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ بینظیر کو اپنی قائد اور بہترین صلاحیتوں والی عصری سیاستدان تسلیم کرنے کے

باوجود مفاداتی سیاست کے خلاف ہیں۔ چند روز قبل ان سے ایک انٹرویو کیا گیا جو سیاستدانوں اور حکومتی ایوانوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔

سوال: مسلم لیگ کے صد سالہ تقریبات پارٹی کو مضبوط کرنے کی کوشش ہے یا طاقت کا مظاہرہ؟

جواب: 1906ء میں قائم ہونے والی مسلمانوں کی اس جماعت کیلئے بدقسمتی کی اس سے بڑی اور بات کیا ہے کہ سو برس گزرنے کے بعد اس کی قیادت قائداعظم کی بجائے ایک جرنیل کی تصویر کے نیچے کنونشن منعقد کر رہی ہے۔ یہ صورتحال جمہوریت کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کے کروڑوں عوام کیلئے لمحہ فکریہ اور آئین و پارلیمنٹ کے منہ پر طمانچہ ہے۔

سوال: کیا دوقومی نظریہ اب بھی ہماری سیاست کی بنیاد ہے یا ختم ہو چکا ہے؟

جواب: قائداعظم نے 1930ء میں الہ آباد کے خطبے میں دوقومی نظریہ پیش کیا جسے بعدازاں علامہ اقبال نے مسلمانوں کیلئے الگ وطن کے حصول کی بنیاد قرار دیا تھا۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کے بعد اندرا گاندھی آنجہانی نے کہا کہ مسلمانوں کا دوقومی نظریہ ختم ہو گیا بدقسمتی سے خان عبدالولی خاں نے لندن کی برٹش لائبریری سے تحریک پاکستان کا ریکارڈ چیک کرنے کے بعد خود اس نظریہ کو غلط قرار دے دیا۔ مولانا عبدالکلام آزاد نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ اگر پاکستان بن بھی گیا تو 20 برس بعد ٹوٹ جائے گا۔ ان سب باتوں کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ دوقومی نظریہ کی تکذیب سیاستدانوں اور جرنیلوں نے خود کی۔ اس اساس کا صرف ڈھنڈورا ہی نہیں پیٹنا چاہئے بلکہ اس پر خلوص نیت سے عمل بھی ہونا چاہئے۔

صوبائی یا فوجی اسمبلی کا انتخاب لڑنے

کیلئے چار پانچ کروڑ روپے ہونا ضروری ہیں۔

سوال: اقتصادی و معاشی طور پر پاکستان آج تک خوشحال کیوں نہ ہو سکا؟

جواب: پاکستان کے تمام مسائل اور مشکلات کی ذمہ دار سول و فوجی بیوروکریسی ہے جو خود کو حاکم اور عوام کو اپنی رعایا تصور کرتی ہے گریڈ 17 سے اوپر کے لوگ اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر جائز و ناجائز ذریعے سے روپیہ کمانے رشوت لینے اور قومی وسائل لوٹنے میں مصروف ہیں جبکہ غریب کو سکولوں، کالجوں، ہسپتالوں، ڈسپنسریوں، عدالتوں، سرکاری دفاتر اور تھانے کچہریوں میں دھکے کھانا پڑتے ہیں۔ فوجی بھی خود کو اعلیٰ مخلوق جبکہ اپنے ٹیکسوں کے ذریعے قومی خزانے میں روپیہ جمع کرانے والوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔ لاہور، راولپنڈی، گوجرانوالہ، پشاور، نوشہرہ، کراچی، حیدرآباد میں کنٹونمنٹ ایریاز (چھاؤنی کے علاقے) تمام بنیادی سہولتوں سے آراستہ ہیں وہاں کی سڑکیں، گلیاں خوبصورت جبکہ سکول کالج، ڈسپنسریاں، اپنی بجلی، گیس ہر چیز موجود ہے۔ نوشہرہ کی سڑکیں دنیا کی خوبصورت اور کشادہ ترین ہیں۔ فوجی علاقوں میں سبزی و فروٹ مارکیٹس، گوشت کی دکانیں ریسٹ ہاؤس اور کمیونٹی سینٹرز بنائے جاتے ہیں شادی بیاہوں کے موقع پر میرا لونگ گواچا کی لے پر گانے چلائے جاتے ہیں۔ باراتوں کا استقبال فوجی بینڈ کرتے ہیں۔ غریبوں کیلئے یہ سہولتیں کیوں نہیں حالانکہ وہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں ملک میں سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، چار قومیں نہیں بلکہ سویلین اور آرمی دو قومیں ہیں۔

سوال: جمہوریت پاکستان میں جڑیں کیوں نہ پکڑ سکی؟

جواب: بیوروکریسی، جرنیل کریسی، تھیوکریسی نہیں چاہتیں کہ جمہوری کلچر فروغ پائے کیونکہ ان کے اختیارات سلب اور عوام کے حقوق بحال ہو جائیں گے یہی وجہ ہے کہ جب بھی فوجی اقتدار پر قابض ہوئے انہوں نے سیاستدانوں کو ذلیل کیا۔ سرمایہ دار اور جاگیردار ہر دفعہ فوج کو اپنا کندھا پیش کر کے مفادات حاصل کرتے اور جرنیلوں کے غیر قانونی و غیر آئینی اقتدار کو سہارا دیتے رہے۔ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ عوام سے تعلق رکھنے کے باعث میرے خلاف ایک بریگیڈیئر نے اس وقت بجلی چوری کا مقدمہ درج کرایا جب میں لاہور ہائیکورٹ کا جج تھا (یہ کام سرمائے کے زور پر سیاست کرنے والے شخص کے ایماء پر کیا گیا۔

سوال: بلوچستان میں فوج کشی اور گیس تنصیبات پر حملے بارے آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: بلوچستان میں حکومت کے خلاف ایک سردار نے بغاوت کر رکھی تھی جسے طاقت سے دبایا گیا۔ میرا خیال ہے معاملہ کا حل مذاکرات سے ہی ہونا چاہئے تھا۔ قدرتی وسائل کی رائلٹی کسی شخص یا قبیلہ کو نہیں، صوبے یا متعلقہ علاقے کو ملنی چاہئے صوبائی خود مختاری محض ایک سیاسی نعرہ ہے پنجاب میں نواز شریف نے اپنا بنک اور ٹیلی ویژن اسٹیشن بنانے کا اعلان کیا تھا جبکہ سرحد میں خان عبدالولی خان بھی پاکستانی سرحدیں اٹک کے پل تک محدود کرنے کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بحیثیت سیاستدان اور ایک پارٹی ورکر ہونے کے میرا خیال ہے کہ مضبوط مرکز ہی استحکام وطن کی ضمانت ثابت ہو سکتا ہے۔ مضبوط فیڈریشن ہی ملکی بقاء کے تقاضے پورے کر سکتی ہے۔ اگر صاف شفاف اور غیر جانبدارانہ انتخابات ہو جائیں تو صوبائی حقوق جیسے نعرے خود بخود دم توڑ جائیں گے۔

سوال: کالا باغ ڈیم اور بھاشا ڈیم کے بارے آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: کالا باغ سمیت تمام آبی ذخائر ملک و ملت کی ضرورت ہیں مگر اب بھاشا ڈیم کو بھی سیاسی ایشو بنانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ 1998ء میں واپڈا کے ایک ریٹائرڈ اعلیٰ افسر نے کہا تھا کہ بھاشا ڈیم متنازع جگہ پر تعمیر نہ کیا جائے اس سے بھارت کو بھی مداخلت کا جواز مل جائے گا۔ موجودہ مقام کی بجائے اگر اسے سو کلومیٹر نیچے بنا لیا جائے تو مخالفت کا جواز ہی ختم ہو جائے گا۔ پیانگ یانگ کے دورہ کے دوران مجھے بتایا گیا کہ شمالی کوریا اپنے دریاؤں میں بہنے والے پانی کا ایک قطرہ تک ضائع نہیں ہونے دیتے جبکہ

مضبوط مرکز اور مضبوط فیڈریشن ہی

استحکام وطن کی ضمانت ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہاں 40 فیصد پانی کراچی پہنچ کر بحیرہ عرب میں گر جاتا ہے وقت آ گیا ہے کہ دریائی پانی کو ذخیرہ کر کے اقتصادی و معاشی ترقی کیلئے استعمال میں لایا جائے وگرنہ غربت کم ہونے کی بجائے بڑھے گی۔

سوال: مگر بھرپور تائید کے باوجود ڈیم شروع کیوں نہ کرا سکے؟

جواب: ذوالفقار علی بھٹو، محترمہ بینظیر اور نواز شریف نئے ڈیم تعمیر کرانا چاہتے تھے مگر جب بھی کوئی بڑا کام شروع ہونے کا وقت آیا ان کی حکومتیں توڑ دی گئیں۔ دراصل جرنیل نہیں چاہتے کہ کسی بڑے پراجیکٹ کا کریڈیٹ سیاستدان لے سکیں۔

سوال: بینظیر کے خلاف کرپشن کے الزامات بارے آپ کیا کہیں گے؟

جواب: ان کے اور آصف علی زرداری کے خلاف تمام مقدمات نواز شریف اور فاروق لغاری کے دور میں سیاسی انتقام کے طور پر بنائے گئے جس کا مقصد انہیں ہراساں کرنا اور سیاسی میدان سے آؤٹ کرنا ہے لہٰذا یہ ختم ہونے چاہیں۔

سوال: کیا سوئٹزرلینڈ میں خفیہ اثاثوں کا مقدمہ غلط ہے؟

جواب: محترمہ کھاتے پیتے اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اپنا سرمایہ کسی مغربی ملک میں رکھنا کوئی جرم تو نہیں۔

سوال: لندن کی ایک عدالت میں انہوں نے سرے محل کی ملکیت تسلیم کر لی ہے جبکہ فرانس، برطانیہ اور سپین کے بینکوں میں بھی ان کے ایسے اثاثے ہیں جن کا انہوں نے پاکستان میں کبھی اقرار نہیں کیا اس پر آپ کیا کہیں گے؟

جواب: اگر بینظیر نے کسی عدالت میں سرے محل کی ملکیت کو تسلیم کر لیا ہے تو انہیں نتائج کا سامنا کرنا چاہئے۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ انہیں اپنے خلاف قائم مقدمات کا سامنا کرنا اور اپنی صفائی پیش کرنی چاہئے تا کہ حقیقی صورتحال عوام کے سامنے آ سکے۔

سوال: سلیمی چوک ستیانہ روڈ پر آپ نے جو اعوان پلازہ بنا رکھا ہے اس بارے حقائق کیا ہیں؟

جواب: یہ جگہ میں نے جائز طریقے سے حاصل کر کے 96ء میں پلازہ بنانا شروع کیا جس کی تعمیر کیلئے بینک نے سرمایہ فراہم کیا تھا مگر نواز شریف نے ذاتی دشمنی اور مجھے نقصان پہنچانے کیلئے یہ پلازہ گرانے کا حکم جاری کر دیا جس کے خلاف میں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جس پر کمشنر سمیت دو افراد کے خلاف انکوائری کرائی گئی۔ عدالت میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہاؤسنگ نے بیان دیا کہ یہ جگہ احمد سعید اعوان کی ملکیت ہے شہباز شریف نے بھی اپنی حیثیت اور انتظامی افسروں کو استعمال کر کے پلازہ کی تعمیر رکوانے کی ہدایت کی جس کے خلاف مقدمہ آج بھی عدالت میں زیر سماعت ہے۔

سوال: آپ کو سیاسی انتقام کا نشانہ کیوں بنایا گیا ؟

جواب: یہ شریف فیملی کے ظرف کی بات ہے ویسے میں نے تو ان کے والد میاں شریف کی 72ء میں دفعہ 302 کے تحت درج مقدمہ قتل میں جان بچائی تھی۔ واقعات یہ تھے کہ میاں شریف پر الزام تھا کہ انہوں نے اپنی ملکیت اتفاق فونڈری کے ایک مزدور لیڈر عبدالرحمٰن کو گرم تیل کے کڑاہے میں پھینک دیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا ورثاء کی درخواست پر انکوائری کے میدان پر مقدمہ درج ہوا جس میں انہیں پھانسی کی سزا ہو سکتی تھی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو صدر پاکستان بنے تو شریف فیملی نے مجھ سے رجوع کیا اور کہا کہ وہ لواحقین کو معاوضہ دینے کیلئے تیار ہیں لہٰذا کسی طرح میری جان بخشی کرائی جائے۔ میں نے قائد عوام کو سارا معاملہ بتایا انہوں نے کہا اگر ورثاء خون بہا لینے پر آمادہ ہو جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ان دنوں غلام مصطفیٰ کھر پنجاب کے گورنر اور بابائے سوشلزم شیخ رشید وفاقی وزیر صحت تھے اور لاہور میں اس مزدور کے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے ملزموں کو سزائے موت دلوانے کے حق میں تھے۔ بھٹو کی ہدایت پر میں نے غلام مصطفیٰ کھر اور شیخ رشید سے کہا کہ عبدالرحمٰن تو کبھی واپس نہیں آئے گا البتہ معاوضہ ملنے سے اس کی بیوہ اور بچے معاشی پریشانیوں سے بچ جائیں گے بڑی مشکل سے یہ معاملہ بالآخر حل ہو گیا۔ سید طاہر احمد شاہ اور خود میاں فیملی کے جاوید شفیع جو چوہدری شیر علی کے رشتہ دار بھی ہیں اس معاملے کے گواہ ہیں نہ صرف یہ بلکہ میاں شریف کو اپنا کاروبار وسیع کرنے کیلئے نواب آف کالاباغ نے پی آئی ڈی سی سے جو قرضہ لیکر دیا تھا اس کی ادائیگی کیلئے سہولت بھی ہم نے لیکر دی تھی سابق صدر پاکستان غلام اسحاق خاں سے جو اس وقت سیکرٹری داخلہ تھے اس بات کی تصدیق کرائی جا سکتی ہے حامد میر (جیو نیوز والے ہیں) کو 93ء میں اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے اخبار روزنامہ پاکستان میں یہ خبر چھاپ دی جس پر پریشان ہو کر میاں نواز شریف نے چوہدری شجاعت حسین اور مشاہد حسین کے ذریعے انہیں اغواء کرا لیا اور تردید چھاپنے کو کہا مگر انہوں نے کہا کہ مجھے یہ بات احمد سعید اعوان نے بتائی ہے جس پر شریف فیملی نے تردید کرنے کیلئے میرے اوپر دباؤ ڈالا لیکن میں نہ مانا جس پر نواز شریف ذاتی طور پر میرے مخالف ہو گئے اور آج تک مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

سوال: غلام مصطفیٰ کھر کی آمد سے پیپلز پارٹی کو کیا فائدہ پہنچے گا۔؟

جواب: یہ بات انتہائی دلچسپ ہے کہ سابق گورنر پنجاب کو تینوں دفعہ پارٹی میں واپس لانے میں میری کوششیں بھی شامل ہیں۔ البتہ پارٹی کے اندر موجود آرائیں گروپ اس کے حق میں نہیں کیونکہ غلام مصطفیٰ کھر عوامی آدمی اور پنجاب میں انتہائی مقبول ہیں جس سے ان کی چودھراہٹ خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ فیصل آباد کے ارائیں بھی جہانگیر بدر کی ہدایت پر ان کی پارٹی میں آمد کے خلاف تھے افسوس اس بات پر ہے کہ وہ اپنی ساکھ بچانے کیلئے کھر کو ہر صورت کارنر کرنا چاہتے ہیں۔

سوال: سیاستدانوں پر کرپشن کے الزامات کیوں لگتے ہیں؟

جواب: ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں کبھی سیاستدانوں پر اقتدار سے الگ ہونے کے بعد بھی کرپشن کے الزامات نہیں لگے بھٹو کے ساتھی کبھی ایسا

شرمناک یا گھٹیا کام نہیں کر سکتے البتہ آج کل سیاست میں آنے کا مقصد ہی مالی مفادات کا حصول اور قومی وسائل پر ہاتھ صاف کرنا ہے معاشرہ میں اب روپیہ ہی حصول مقاصد کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب کوئی غریب' سفید پوش یا متوسط طبقے کا شخص الیکشن نہیں لڑ سکتا صوبائی یا قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کیلئے چار پانچ کروڑ ہونا چاہئے جو میرے جیسا آدمی افورڈ نہیں کر سکتا مجھے 2002ء میں بھی پیپلز پارٹی ٹکٹ دینے کیلئے تیار تھی مگر میرے پاس سرمایہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے مسلم لیگ (ن) کے ان لیڈروں کی بھی حمایت کرنی پڑتی جن کی بدعنوانیوں کے چرچے عام تھے اور جو بھٹو کی پھانسی پر خوشیاں منانے والوں میں شامل تھے لہٰذا میں خاموش ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ موجودہ حکومت میں تو کرپشن اتنی بڑھ گئی ہے کہ ٹاؤن و تحصیل ناظم کا الیکشن بھی ایک کروڑ سے کم میں نہیں لڑا جا سکتا۔

سوال: آپ کی اعوان ٹیکسٹائل ملز کیسی چل رہی ہے؟

جواب: دراصل یہ ملز چوہدری سعید اختر اعوان کی تھی جو سابق صوبائی وزیر ملک عبدالقیوم اعوان کے رشتے دار ہیں ان سے یہ ملز چوہدری احمد سعید اعوان نے خرید لی مگر میرے مخالفین نے مشہور کر دیا کہ یہ میری ملکیت ہے میں نے تب بھی اس کی تردید کی تھی اور آج بھی یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ ملز میری ملکیت ہے تو ثبوت سامنے لاؤ اور پھر مجھے میری ٹیکسٹائل ملز کا قبضہ بھی تو دلاؤ۔

سوال: بیگم نصرت بھٹو کہاں اور کس حال میں ہیں؟

جواب: خاوند اور دو بیٹوں کی ہلاکت کے علاوہ اپنی ایک بیٹی صنم بھٹو کو طلاق ملنے سے وہ اتنی دلبرداشتہ تھیں کہ سیاست سے متنفر ہو گئیں بلکہ وہ بینظیر کو بھی یہی مشورہ دیتی رہیں کہ سیاست سے الگ ہو جاؤ گزشتہ کافی عرصہ سے وہ بیماری کے سبب کسی کو پہنچاننے سے بھی قاصر ہو چکی ہیں آج کل دوبئی میں زندگی کے آخری دن گزار رہی ہیں۔

سوال: کیا پیپلز پارٹی پھر 70ء والا عروج و مقبولیت حاصل کر سکے گی؟

جواب: آج کل سیاست روپے پیسے کے زور پر ہی کی جا سکتی ہے۔ بھٹو کے افکار اور غریبوں' مزدوروں' کسانوں کی فلاح و بہبود کے علاوہ اگر روٹی کپڑا مکان کیلئے جدوجہد کا راستہ اختیار کیا جائے تو پیپلز پارٹی پھر مقبول ترین عوامی جماعت بن سکتی ہے۔

…………☆☆☆…………

دل میں کوئی چور نہیں

قائداعظم محمد علی جناح کی عمر جب 41 برس تھی تو ایک صاحب نے ایک محفل میں اُن سے عرض کی: ''جناب! اِس دبلے پتلے جسم کے ساتھ آپ کے عزم اور کارکردگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے' کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ عمر کے اِس حصے میں اِس تندہی اور مسلسل محنت سے آپ قوی کام کیسے کر لیتے ہیں؟'' قائداعظم مسکرائے اور جواب دیا: ''محض دو وجوہ سے ایک تو میں بہت کم کھاتا ہوں اور دوسری یہ کسی بھی سلسلے میں میرے دل میں کوئی چور نہیں ہوتا''۔

دکھی انسانیت کی خدمت کیلئے
فاؤنٹین ہاؤس کا ساتھ دیجئے

واجب الاحترام
السلام علیکم!

زکوٰۃ وصدقات

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے (کہ اس سے دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے) لیکن اگر درپردہ حاجت مندوں کو دو (تاکہ اُن کی عزت نفس مجروح نہ ہو) تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (البقرہ 271)

360 میں سے 150 (ذہنی مریض) فاؤنٹین ہاؤس آپ کی ایک محبوب ادا (زکوٰۃ' صدقات اور خیرات) کے منتظر ہیں۔ رمضان المبارک کے مبارک مہینہ میں کھلے دل سے اُن کی امداد کر کے دین و دنیا میں سرخروئی حاصل کریں اور اُنہیں معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنائیں۔

Local Currency Accounts
1- Muslim Commerical Bank,
Branch Code No.1317,
Session Court Lahore,Pakistan
A/C No 13170101000010-9
A/C No 13170201005531-05
A/C Title:Fountain House
2- Habib Bank Ltd.
Branch Code No.0135,
Bank Square Branch Lahore
A/C No :0135-019534-90-03
A/C No :0135-021561-06-03
A/C Title:Fountain House
3- Standard chartered Bank,
Branch Code No:009'
LDA Plaza Edgerton Road,LHR
A/C No :00908-0716679-01
A/C Title:Fountain House

Foreign Currenty Account
Account No.6214-425061-051
Standered Chartered Bank Ltd.
LDA Plaza,Edgerton Road,Lahore,Pakistan

ای میل: Fountainhouse_dmhr@yahoo.com

آپ اپنے عطیات اُوپر دیئے گئے بنک اکاؤنٹس میں بھیج سکتے ہیں لیکن ازراہ نوازش اپنی کرم فرمائی کیلئے ہمیں ای میل یا عام خط و کتابت سے مطلع ضرور کریں۔ ہماری دُعا ہے کہ ربّ العالمین آپ کو اپنے فیضان سے مالا مال کرے۔ (آمین)

فاؤنٹین ہاؤس کو سنٹرل بورڈ آف ریونیو نے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے رکھا ہے

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید چوہدری
اعزازی ایگزیکٹو ڈائریکٹر

محمد الطاف حسین
ایڈوائزر فنڈز' گرانٹس و پروٹوکول

FOUNTAIN HOUSE
37-LOWER MALL,LAHORE,PAKISTAN
PHONES:92-42-7352803,7352805,7114778,FAX:92-42-7572488

فوجی حکمرانوں کا راستہ روکنے کا

واحد حل آئین پر عمل درآمد ہے

جس شخص کے پاس ملک کا سارا کنٹرول تھا
وہی شخص ہر بات کا ذمہ دار بھی ہے

سول سوسائٹی کی حق کیلئے آواز کو زبردستی
بند کرنا حق چھیننے کے مترادف ہے

ہمارا کوئی سیاسی ایجنڈا نہیں ہے

ہم سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کو مشورے دیتے رہے ہیں کہ وہ ہماری برادری کا حصہ بن جائیں گے

اگر جج صاحبان اور وکلاء کہتے تھے کہ عدلیہ کو بحال کرو تو کیا یہ غلط مطالبہ تھا

ایکس سروس مین سوسائٹی کے صدر (ر) جنرل فیض علی چشتی سے خصوصی انٹرویو

لیفٹیننٹ جنرل (ر) فیض علی چشتی 13 جون 1927ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے، انہوں نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سکول جالندھر اور فیروز پور سے حاصل کی، میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول فاضلکا سے کیا۔ ایف اے منشی رام کالج فاضلکا سے کیا۔ بی اے رام سکھ داس کالج فیروز پور سے کیا۔ 1947ء میں انہوں نے رائل انڈین آرٹلری میں کمیشن لیا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد انہوں نے اپنے آزادی کے حق کے تحت پاکستان آنے کا فیصلہ کیا اور نومبر 1947ء میں بحری راستے سے کراچی آئے، فوج میں تعیناتی کے دوران انہوں نے 1947ء، 1965ء، 1971ء کو تینوں جنگوں میں اگلے مورچوں پر حصہ لیا اور 30 مارچ 1980ء کو ریٹائرڈ ہوئے، اس عرصہ میں انہیں ہلال امتیاز ملٹری اور ستارہ بسالت سے نوازا گیا۔ وہ ملک کے سیاسی حلقوں میں اس وقت متعارف ہوئے جب پانچ جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا اور مارشل لاء نافذ کیا۔ اس وقت جنرل چشتی 10 کور راولپنڈی ہیڈ کوارٹر میں خدمات انجام دے رہے تھے اور بھٹو حکومت کیخلاف آپریشن فیئر پلے ان کی زیر قیادت انجام دیا گیا۔ ان کے بارے میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں میں یہ تاثر رہا کہ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو جیل میں تشدد کا نشانہ بنایا۔ تاہم حالات واقعات سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی اور وہ خود بھی اس کی تردید کرتے رہے ہیں۔ ان دنوں وہ

1980 میں ضیاء الحق سے اختلاف کرتے ہوئے میں نے تین وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا تھا

ضیاء پانچ ماہ حکومت کی منتیں کرتے رہے کہ الیکشن کروائیں مگر حکومت خونریزی کرتی رہی

ایک سیاسی جماعت تعمیر پاکستان پارٹی کے سربراہ ہیں۔ ''مون ڈائجسٹ'' نے ان سے گزشتہ دنوں ایک انٹرویو کیا جو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

سوال: بار بار کی فوجی حکومتوں اور مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے کیا فوج کی بطور ادارہ ساکھ متاثر نہیں ہوئی؟

جواب: یہ اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج پاک فوج کی وہ ساکھ نہیں ہے جو ایک قومی فوج کی ہونی چاہیے۔ ہماری فوج کی پیشہ وارانہ صلاحیت اپنی جگہ مسلمہ ہے لیکن اس کے بار بار کے سیاسی رول نے اسے متاثر کیا ہے۔ یہ بات میں آج نہیں کہہ رہا بلکہ گزشتہ سات سال سے کہہ رہا ہوں۔ جب جنرل مشرف اقتدار میں آئے تھے تو اس وقت بھی میں نے کہا تھا کہ جنرل مشرف آرمی چیف کی حیثیت سے پاک فوج کی عزت کو اہمیت دیں اور جلد از جلد اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کر کے چلے جائیں۔ لیکن انہوں نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔

سوال: آپ خود بھی ایک مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے ساتھیوں میں سے ہیں آپ نے انہیں اس کا مشورہ کیوں نہیں دیا اور کیوں ان کا ساتھ دیتے رہے؟

جواب: کون کہتا ہے کہ میں نے جنرل ضیاء الحق کو فوجی اقتدار سمیٹنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ میں ہی تو وہ واحد آرمی آفیسر تھا جس نے برملا جنرل ضیاء الحق سے بھی کہہ دیا تھا کہ ہمیں اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کر دینا چاہیے لیکن انہوں نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا فوج کا سیاسی رول بنتا ہے اور کیا اسے حکومت کرنی چاہیے؟

جواب: فوج کا سیاسی رول بالکل نہیں بنتا اسے اقتدار میں نہیں آنا چاہیے لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ فوج سیاست میں خود نہیں آتی بلکہ فوج کو سیاست میں لایا جاتا ہے۔ فوج کبھی اپنی قوم کو نہیں مارتی لیکن یہ ہماری حکومتیں ہی ہیں جو فوج کو اپنے لوگ مارنے کا حکم دیتی ہے۔ 1977ء میں آج تک حکمرانوں کے کہنے پر فوج کو اپنی عوام کیخلاف آپریشن کیلئے استعمال کیا گیا لیکن اس کے باوجود فوج نے کبھی اس طرح اپنے عوام کیخلاف آپریشن نہیں کیا جس طرح حکمران چاہتے۔ 1977ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو حکومت کیخلاف عوامی تحریک عروج پر تھی تو بھٹو حکومت اپنی عوام کو کچلنے کیلئے فوج کو لے کر آئی لیکن اس وقت بھی یہ ہوا کہ جب نیلا گنبد سے جلوس نکلا اور فوج کو گولی چلانے کا حکم ملا تو 16 میں سے 14 گولیاں مس فائر ہوئیں، حالانکہ ایک فوجی کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کو بتا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے معاملات سیاسی طور پر حل کریں لیکن انہوں نے اس پر توجہ نہیں دی جس کے نتیجے میں جنرل ضیاء الحق کو مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔

ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ سویلین ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

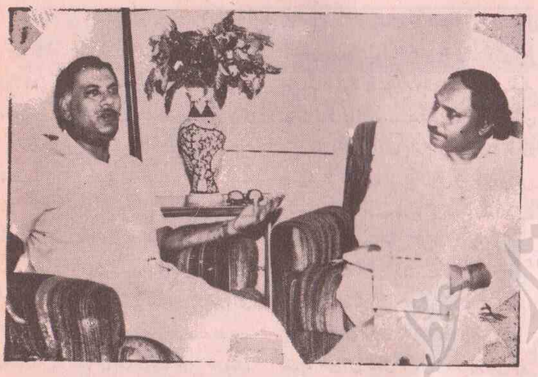

ادیب جاودانی جنرل (ر) فیض علی چشتی سے انٹرویو کر رہے ہیں

سوال: آپ کے خیال میں فوجی حکومتوں کا راستہ کیسے روکا جا سکتا ہے؟

جواب: فوجی حکمرانوں کا راستہ روکنے کا واحد طریقہ آئین پر علمدرآمد ہے جب مکمل طور پر آئین پر عمل کیا جائے گا تو پھر کوئی بھی مارشل لاء نافذ نہیں کر سکے گا۔ لیکن ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ سویلین ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہیں میں پوچھتا ہوں آخر ایک جرنیل اپنی 3 سالہ آئینی مدت سے زیادہ کس طرح جرنیل برقرار رہتا ہے، جنرل ایوب خان 1951ء میں جرنیل بنے تو انہیں 1954ء میں ریٹائرڈ ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ ملک کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے اور پھر فیلڈ مارشل لا
بنے۔ اسی طرح جنرل ضیاء الحق کو بھی آئین سے ہٹ
کر آؤٹ آف ٹرن ترقی دے دی گئی جنرل مشرف ک
چناؤ بھی آئین کو نظر انداز کر کے کیا گیا اور آج نتیج
پوری قوم کے سامنے ہے۔ دوسرا میں سمجھتا ہوں کہ اس
سارے عمل میں بڑا قصور ہماری عدلیہ کا بھی ہے جس
نے ہمیشہ نظریہ ضرورت کے تحت فوجی حکومتوں کو تحف
دیا آخر جسٹس منیر کو ایسی کیا آفت آن پڑی تھی کہ اس
نے فوجی حکومت کو جائز قرار دیا۔ بلکہ میں تو کہوں گا ک
یہ ہماری عدالتیں ہی ہیں جنہوں نے ضرورت ۔
زیادہ فوجی حکمرانوں کو اکاموڈیٹ کیا ہے اور
رعائتیں جو نہیں مانگی گئیں عدالتوں نے فوجی حکمرانو
کو اس سے بھی مستفید کیا ہے جس کی ایک مثال جنر

مشرف حکومت کو آئین میں ضروری ترمیم کرنے کا اختیار بھی تھا۔ جس کے نتیجہ میں ایل او ایف بنا اور پھر وہ 17 ویں ترمیم کے تحت آئین کا حصہ بن گیا اس کے علاوہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا الیکشن کمیشن ہی اپنا کردار صحیح طور پر ادا کر رہا ہوتا تو کبھی ایسے حالات نہ ہوتے۔

لیکن الیکشن کمیشن نے اس پر کبھی عمل نہیں کیا۔ پھر الیکشن میں دھاندلی کا الزام سامنے آیا اور اسٹیبلشمنٹ کی مرضی کی حکومتیں بنوائی جاتی رہیں۔ یوں الیکشن کے نتیجے میں وجود میں آنے والی حکومتوں میں عوامی نمائندگی کا عنصر نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے یہاں وہ جمہوریت آ ہی نہیں سکی جسے حقیقی معنوں میں جمہوریت کہا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ملک میں جمہوریت کے اصل قاتل یہاں کے چیف الیکشن کمشنر ہیں اور جو الیکشن کمشنر دھاندلی میں ملوث ہے اسے قبر سے نکال کر پھانسی دینی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم من حیث القوم اپنا احتساب نہیں کریں گے اور سسٹم میں پیدا ہونے والی خرابیوں کے ذمہ داروں کو سزا نہیں دیں گے صحیح جمہوری نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں ہمارے یہاں دھاندلی پر مبنی الیکشن کی پہلی بنیاد چیف الیکشن کمشنر کے غلط چناؤ سے کی جاتی ہے دنیا بھر میں چیف الیکشن کمشنر کو ایک ایڈمنسٹریٹر عہدہ کی حیثیت حاصل ہے اور ایک باصلاحیت ایڈمنسٹریٹر کو ہی چیف الیکشن کمیشن تعینات کیا جاتا ہے لیکن ہمارے یہاں یہ اصول بنالیا گیا ہے کہ چیف الیکشن کمیشن کیلئے سپریم کورٹ کا جج ہونا ضروری ہے میں پوچھتا ہوں کہ ہندوستان کا چیف الیکشن کمشنر وہاں کی عدلیہ کا جج ہے اگر وہاں ایسا نہیں ہے تو پھر یہاں اس کی کیا ضرورت ہے چلیں یہاں جج ہی الیکشن کمشنر رہیں لیکن پھر انہیں کم از کم اس عہدہ کا اہل تو ہونا چاہیے یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی موجودگی میں دھاندلی ہو جیتے ہوئے ہار جائیں اور ہارے ہوئے جیت جائیں اور وہ خاموش رہیں اور کچھ نہ کر سکیں اب اس حوالے سے جنرل مشرف کے ریفرنڈم کو ہی دیکھ لیں اس بارے میں تو خود جنرل مشرف نے تسلیم کیا ہے وہ غلط تھا اسی طرح 2001ء کا الیکشن بھی شفاف نہیں تھا لیکن اس ساری غلطیوں کا ذمہ دار فوج کو تو نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسکے ذمہ داروں کو سزا ملنی چاہیے اور اب عدلیہ کو کم از کم ان سب کا سوموٹو نوٹس لینا چاہیے۔

> فوج کبھی اپنے لوگوں کو نہیں مارتی یہ ہماری حکومتیں ہیں جو اسے اپنے لوگ مارنے کا حکم دیتی ہیں۔

سوال: لیکن یہ دھاندلی تو شاید اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ ہماری خفیہ ایجنسیاں خود اپنے طور پر الیکشن سیل بناتی ہیں اور حکومت کی مرضی کے مطابق نتائج تیار کرتی ہیں۔ خود آپ بھی تو جنرل ضیاء الحق دور میں فوج کے ایسے ہی الیکشن سیل کے سربراہ تھے؟

جواب: میں فوج کے الیکشن سیل کا سربراہ ضرور تھا لیکن اس سیل کی ذمہ داری دھاندلی کرنا نہیں بلکہ ان الیکشن کو شفاف بنانا اور دھاندلی روکنا تھا۔

سوال: یقیناً آپ کا اپنا کردار تو ایسا ہی ہوگا لیکن بعد میں اس اصول کے تحت بننے والے الیکشن سیل حکومتی مفاد کے مطابق دھاندلی میں استعمال ہو سکتے ہیں؟

> فوج کے بار بار سیاسی رول نے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو متاثر کیا ہے۔

جواب: اگر آپ سمجھتے ہیں ایسے الیکشن سیل ختم ہونے چاہئیں تو اس میں حرج نہیں لیکن اصل مسئلہ وہی ہے کہ الیکشن کمیشن ایسا ہونا چاہئے جس میں شفاف الیکشن کرانے کی پوری صلاحیت موجود ہو 2002ء کے الیکشن میں کھلے عام الیکشن رولز کی خلاف ورزی کی گئی لیکن اس کا نوٹس نہیں لیا گیا۔ الیکشن رولز میں واضح تھا کہ ہر پارٹی الیکشن سے قبل اپنے اثاثے ظاہر کرے گی۔ رجسٹرڈ ہوگی لیکن راتوں رات مسلم لیگ (ق) بنائی گئی پیٹریاٹ ایک دن میں بنی ان کے اثاثہ جات کیسے بنے۔ الیکشن کمیشن نے اس کا نوٹس نہیں لیا گیا۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں حالیہ سیاسی ہلچل کے پیچھے امریکہ کا کوئی کردار ہے؟

جواب: میرا نہیں خیال کہ امریکہ پاکستان کے اندر سیاسی حکومت کی تشکیل کے امور میں اثر انداز ہوتا ہے۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی بھی اپنے مفادات کے ساتھ وابستہ ہے۔ امریکہ کی پاکستان سے دوستی میں یہاں خطے میں امریکی مفادات ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امریکہ یہاں پاکستان میں حکومتوں کی تشکیل میں کوئی اثر ورسوخ استعمال کرتا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کے اندر فوجی حکومتوں کے قیام کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہوتا ہے یا جمہوری حکومتیں امریکہ کی مرضی سے بنتی ہیں وہ غلط سوچتے ہیں البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ امریکہ اپنے مفادات کے حصول کیلئے ہمارے یہاں کی حکومتوں سیاسی جماعتوں اور رائے عامہ کے مختلف طبقات کو استعمال کرتا ہے۔

سوال: جنرل صاحب! نگران وفاقی وزیر اطلاعات نثار میمن نے کہا ہے کہ اگر سابق جرنیل سڑکوں پر آئے تو اُن سے عام آدمیوں جیسا سلوک کیا جائے گا اور اِن جرنیلوں کو صدر پاکستان سے استعفیٰ ماننے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ کسی کو بھی صدر سے استعفیٰ مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ اِس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: اِس بیان سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ عام آدمی کی حکومت کی نظر میں کوئی عزت نہیں ہے۔ یہ سب سامنے ہے۔ ہم بھی عام آدمی ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں اور ہم عام آدمی اور عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ 25 لاکھ ایکس سروس مین سارے کے سارے جرنیل نہیں ہیں۔ اُن میں سپاہی بھی ہیں اور جونیئر آفیسرز بھی، سینئر آفیسرز اور جرنیل بھی ہیں۔ ہم سب عام آدمی ہیں تو ہمیں وہ عام آدمی کے سلوک کی دھمکی نہ دیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت والوں کو بھی اپنی رائے کے اظہار کا حق ہے۔ وہ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ یہ بات یاد رکھیں کہ ایکس سروس مین سوسائٹی ایک برادری ہے۔ یہ ہمارا برادری کا معاملہ ہے۔ جنرل (ر) پرویز مشرف اب ایکس سروس مین ہیں۔ ہماری برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کل تک ہماری برادری میں شامل نہیں تھے لیکن آج وہ ہماری برادری میں شامل ہو چکے ہیں۔ ہماری برادری میں سے جو ڈور

ہوگیا، کیا یہ ہماری ڈیوٹی نہیں ہے کہ ہم اُسے سیدھا راستہ دکھائیں۔ ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کررہے ہیں۔ ہم پاکستان کے پرامن شہری ہیں، ملک کی بہتری چاہتے ہیں، ہمارے خیال کے مطابق ہم یہ مشورہ دینے کے مکلف ہیں کہ یہ کام اچھا ہے، یہ کام اچھا نہیں ہے، اِسے نہ کرو۔ لہٰذا ہم اپنی برادری کے اِس فرد کو مشورہ دیتے ہیں کہ آج تک کوئی صدر پاکستان باعزت طور پر رخصت نہیں ہوا، سوائے چوہدری فضل الٰہی کے، لہٰذا ہم اُن کو عزت کے ساتھ منصب چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہیں تو کیا نثار میمن صاحب یہ نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔ ہمارا پرویز مشرف کو بھی یہی مشورہ ہے کہ وہ عزت کے ساتھ رخصت ہوجائیں۔ اِس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ استعفیٰ دے دیں۔ ہم قوم اور ملک کی بہتری کی بات کرتے ہیں۔ جو کچھ پرویز مشرف نے گذشتہ آٹھ سالوں میں کیا ہے، سب کے سامنے ہے۔ ہماری وزیر اطلاعات سے درخواست ہے کہ وہ حقائق کو غلط طور پر بیان نہ کریں۔ اُنہوں نے جو دھمکی ہے تو وہ اِس پر عمل کر گزریں اور ہمیں جو کرنا ہوگا ہم کرلیں گے۔

سوال: لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنا تو سیاسی جماعتوں کا کام ہے، وہ کام اب سول سوسائٹی نے سنبھال لیا ہے اور ایکس سروس مین سوسائٹی نے سنبھال لیا ہے۔ آپ اِسکے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: جو آج ہمارے ملک کی حالت ہے، وہ ایک دن کے واقعات کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ بہت سی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ زیادہ تر غلطیاں سول سوسائٹی سے ہی ہوتی ہیں کیونکہ سول سوسائٹی ہی ہر ایک چیز کو جنم دیتی ہے۔ جرنیل کو جرنیل نہیں بناتے بلکہ اُنہیں سول سوسائٹی جرنیل بناتی ہے۔ جج، جج نہیں بناتے، اُنکو وکیل جج بناتے ہیں، وہ اُنہیں جج تسلیم کرکے جج بناتے ہیں۔ وکیلوں کو سول سوسائٹی وکیل بناتی ہے جن میں سے جج بنتے ہیں۔ اِسی طرح سے سیاست دان بھی سول سوسائٹی ہی سے بنتے ہیں۔ سول سوسائٹی کے مختلف حصے اکٹھے ہوکر ایک قوم بنتی ہے۔ اِس لئے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کی بہتری کیلئے جو کچھ ہوسکتا ہے، وہ سوچے اور جو کرسکتا ہے کرے اور ملک کے حق میں بہتر کام کرنے کی تلقین کرے اور جہاں بھی اُسے غلطی نظر آتی ہے، اُسے ٹھیک کرے۔ آج اگر جج صاحبان اور وکلا کہتے ہیں کہ عدلیہ کو بحال کردو تو کیا عدلیہ کو بحال کرنے کا مطالبہ غلط ہے اور ہمارے مطالبات افتخار محمد چوہدری کو رہا کریں اور بحال کریں اور اعتراز احسن کو کام کرنے دیں، ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو رہا کریں کیا غلط مطالبات ہیں؟ بغیر کسی جرم کے جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے اُنکی رہائی بھی ضروری ہے۔ کیا یہ مطالبات سنگین جرم ہیں؟ پھر اُنہوں نے ملک کے شہریوں کو کیا دیا ہے۔ ایک شہری کو کیا چاہیے؟ انصاف چاہیے۔ کیا آج اُسے انصاف مل رہا ہے؟ بچوں کیلئے تعلیم چاہیے۔ کیا تعلیم مل رہی ہے؟ نہیں۔ صحت کیلئے اچھی سہولیات چاہئیں، کیا مل رہی ہیں؟ نہیں، امن وامان مل رہا ہے؟ روٹی چاہیے، مل رہی ہے؟ اِس صورتحال کا کون ذمہ دار ہے؟ حکومت ہی ذمہ دار ہے۔ شوکت عزیز جو ہم میں سے نہیں تھے،

جب تک ہم من حیث القوم اپنا احتساب نہیں کریں گے جمہوری نظام قائم نہیں ہوسکتا۔

چپکے سے باہر نکل گئے لیکن وہ بھی اِن کے ہاتھوں میں کھلونا تھے۔ سارا کنٹرول ایک شخص کے ہاتھوں میں تھا لہٰذا جسکا کنٹرول تھا، وہ ہر بات کا ذمہ دار ہے۔ قوم کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اُنہیں مشورہ دے۔

سوال: ایک سوال جو اکثر کیا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء کو اقتدار میں لانے میں جنرل فیض چشتی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور مارشل لا اُٹھانے میں اُن کا اہم کردار تھا۔ کیا آپ اِس پر قوم سے معذرت کرتے ہیں؟ کیا وہ آپکی غلطی تھی یا وقت کا تقاضا تھا؟

جواب: جہاں تک مارشل لا کا تعلق ہے، مارشل لا دو طرح سے لگتا ہے، ارادتاً یا نتیجتاً۔ ارادتاً لگے تو لگانے والے کی نیت کچھ اور ہوتی ہے۔ نتیجتاً لگے تو کچھ اور نیت ہوتی ہے۔ 1953ء کا مارشل لا قادیانی مخالف تحریک کے نتیجے میں لگا جسے سکندر مرزا نے لگایا جو فوجی نہیں تھے صرف فوجی لباس پہنتے تھے لیکن سویلین تھے تو ایک سویلین نے مارشل لا لگایا جس سے ایوب خان نے فائدہ اُٹھایا۔ اسکے بعد 1969ء میں جنرل یحییٰ خان نے ارادتاً مارشل لا لگایا کہ کوئی اور کیوں حکومت کرے، وہ خود کیوں نہ حکومت کریں۔ پھر 1971ء میں یحییٰ خان سے اقتدار لینے پر ذوالفقار علی بھٹو نے بطور سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مارشل لا لگایا اور ذوالفقار علی بھٹو نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا دباؤ رکھتے ہوئے کام کیا۔ 1977ء میں تحریک نظام مصطفیٰ میں بھٹو نے تین شہروں میں مارشل لا لگایا۔ جسے عدالتوں نے غیر قانونی قرار دیا تو وہ ختم ہوگیا۔ اِسکے بعد 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا لگایا۔ ضیاء الحق نے مارشل لا کس لئے لگایا؟ اِس لئے کہ 7 مارچ 1977ء سے لے کر 5 جولائی تک ضیاء الحق نے حکومت کی منتیں کیں کہ الیکشن دوبارہ کراؤ۔ کیا یہ عرصہ کم تھا کہ مارچ سے جولائی تک الیکشن ہوسکتے تھے، حالات ٹھیک ہوسکتے تھے۔ کیا پانچ مہینوں میں حکومت حالات ٹھیک نہیں کرسکتی تھی۔ اِن پانچ مہینوں میں حکومت خوں ریزی کرتی رہی۔ ہزاروں افراد مارے گئے۔ یحییٰ بختیار کے مقدمات کو دیکھ لیں کہ اُن میں اُنہوں نے ذکر کیا ہے کہ قومی اتحاد کی اِس تحریک میں کتنے افراد مرے۔ جب پولیس نے مارا تو فوج چپ تھی۔ جب فیڈرل سیکورٹی فورس نے مارے تو فوج چپ رہی۔ جب فوج سے کہا کہ مارو تو فوج نے بھی حکم مانا لیکن جب اِس مسئلے پر فوج میں مختلف سوچ پیدا ہوئی تو فوجیوں نے حکم ماننا بند کردیا۔ تین بریگیڈیئروں نے حکم ماننے سے انکار کردیا کیونکہ فوج کا نظم ٹوٹ رہا تھا۔ فوج نے کہا کہ ہمارا کام اپنے بندے اپنے شہریوں کو مارنا نہیں ہے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم اُن کی حفاظت کریں، ہم اُنہیں نہیں ماریں گے۔ آپ دوبارہ الیکشن کرائیں ورنہ ہم آپ کو ماریں گے۔ لیکن اُنہوں نے بات نہیں مانی تو ہم نے مارشل لا لگادیا۔ یہ فیصلہ غلط ہوسکتا ہے لیکن یہ مارشل لا نتیجتاً تھا۔ ہمارا ارادہ نہیں تھا کہ اُن کو نکالتے۔ اگر ہمارا ارادہ ہوتا تو مارچ میں ہی نکال دیتے۔ اپریل میں جب لاہور میں زیادہ خوں ریزی ہوئی تھی، اُس وقت نکال دیتے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی ہم صبر سے

77 کا مارشل لاء نتیجتاً لگا تھا آپ سب کا احتساب کریں میں بھی تیار ہوں

کام لیتے رہے، فیصلے غلط ہو سکتے ہیں۔ اِس کی جو سزا دینی ہو ہمیں دے لیں۔ مقدمہ چلاؤ اور سزا تجویز کرو کہ کیا ہوا تھا، ایسا کیوں کیا۔ آج جو لوگ جمہوریت کے چیمپیئن بنتے ہیں اُنہوں نے کیا کیا؟ فوجی اقتدار پر قبضہ کرلیتا ہے تو غلطی کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ احتساب کرو۔ میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میں احتساب کیلئے حاضر ہوں۔ مجھ سے سوال جواب کرو۔ حکومت کرنا سویلین کا کام ہے۔ سول حکومت اپنے کام ٹھیک کیوں نہیں کرتی؟ سول حکومت آرمی چیف کی خوشنودی کیلئے اُسے ایکسٹینشن دیتی رہی۔ وہ تو آرمی چیف کو تین سال کے بعد ریٹائرڈ کیوں نہیں کرتی رہی۔ اِس کا جواب کون دے گا؟ میرا احتساب کرو تو میں بتاؤں گا کہ 1977ء کا مارشل لا کیوں لگا؟ لوگ مجھ سے معافی مانگنے کیلئے کہتے ہیں۔ 1977ء کا مارشل لا غلط تھا یا صحیح، آپکی رائے اور ہو سکتی ہے، ہماری رائے مختلف ہو سکتی ہے۔ اُس وقت فیصلہ کرنے والے ہم تھے۔ ہم اپنے فیصلے کے ذمہ دار ہیں۔ آج میں کہتا ہوں کہ مارشل لا مجبوری تھا، ٹھیک لگا۔ لیکن ٹھیک چلا نہیں، مقصد پورا نہیں ہوا جس کیلئے مارشل لا لگا تھا کیونکہ جنرل ضیاء الحق نے حکومت سویلین کو واپس نہیں دی۔ میں نے قوم سے معافی مانگ لی ہے کیونکہ جب میں نے 1980ء میں تین وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا، اِس سے بڑی معافی مانگنا اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے ضیاء الحق کی زندگی میں اُن پر تنقید کی ہے۔ اُن سے کہا کہ آپ نے قوم سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں کیا۔ میں نے ضیاء کا ساتھ نہیں دیا کہ آپ میرا کہنا نہیں مانتے۔ میں 30 مارچ 1980ء کو تین وزارتوں سے استعفیٰ دے کر گھر واپس آ گیا۔ اِسکے بعد آٹھ سال جنرل ضیاء کی حکومت رہی۔ تنقید کرنے والے جواب دیں کہ اِن آٹھ برسوں میں کیا جنرل چشتی اُس کے ساتھ تھا؟ لوگوں کو حقیقت معلوم ہونی چاہیے۔ جب ضیاء نے 1977ء میں پی این اے اور مسلم لیگ کے لوگوں کو وزارت میں شامل کیا تو میں نے اُس وقت وزارت لینے سے انکار کر دیا تھا۔

فوجی جرنیلوں کو آئین سے ہٹ کر ترقی دینے کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے

اگست 1978ء سے لے کر یکم اپریل 1979ء تک کوئی فوجی وزیر نہیں تھا اور نہ بنا اور نہ میں نے بننے دیا۔ اپریل 1979ء کے بعد فوجی وزیر بنے ہیں۔ جنرل جمال سعید میاں، ائیر مارشل انعام الحق اور جنرل فیض علی چشتی (میں) ہم تینوں فوج سے آ چکے تھے۔ میں نے تو 1980ء میں استعفیٰ دے دیا، باقی لوگ کیوں واپس نہیں آئے۔ جمال سعید میاں کے ساتھ جنرل ضیاء میری بات نہیں مانتے تھے تو میں کیا کرتا۔ یا اُنہیں ہٹاتا یا اُنہیں بناتا تو میں خود ہی ہٹ گیا۔ میں نے ملک کی خاطر خود کو ہٹا لیا۔

☆☆☆☆

میں نے جنرل مشرف کو اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن انہوں نے میری بات نہ مانی۔

SINGHAR سنگھار
Hair Style & Beauty Parlour ہیئر سٹائل اینڈ بیوٹی پارلر

Faisal
Directors

4-Mozang Road,
Near Family Hospital, Lahore
Ph: 7231839

ڈپلومہ ہولڈر پروفیشنل بیوٹیشن سے دلہا میک اپ جدید ہیر سٹائل اور مکمل اسکن کیئر
سروس اسپیشل پروڈکٹس کے ساتھ کروائیں۔

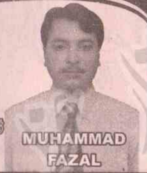
MUHAMMAD
FAZAL

BANK OF BEAUTY
آپکو خوبصورت بنانے کا وعدہ

LADIES & GENTS
بنک آف بیوٹی لیڈیز اینڈ جینٹس سیلون

Specialist In: • Bridal • Groom • Massage
• Model & Party Makeup • Photosession

• لیڈیز کیلئے لیڈیز سٹاف • صاف ستھرے اور آئیڈیل انوائرمنٹ کے ساتھ
• خصوصی رعائتی پیکج کے ساتھ

A.G.Office Chowk, Lahore.Opp. Bata Shoes Store
Tel: 042-7211887, Mobile: 0333-4309899

ہماری سب سے پہلی ترجیح عدلیہ اور آئین کی بحالی ہے!

نواز شریف مزاحمت کرنے والے ایک عظیم لیڈر کی حیثیت میں سامنے آئے ہیں

حالیہ الیکشن میں عوام نے حق اور سچ کا ساتھ دیا اس پر قوم مبارکباد کی مستحق ہے

عوام سمیت، آئین کی بحالی پر تمام سیاسی جماعتیں متفق ہیں سوائے (ق) لیگ کے!

عدلیہ کی آزادی کے بعد حقیقی معنوں میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہوں گے

پرویز مشرف کی فوجی مداخلت سے ملک کی پیشانی پر آمریت کا بڑا داغ لگ گیا تھا

مسلم لیگ (ن) کے رہنما جاوید ہاشمی کا مون ڈائجسٹ کو انٹرویو

سوال: مسلم لیگ (ن) کو انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے آئندہ حکومت سازی میں آپ کی جماعت کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ کیا آپ کی جماعت نے کوئی حدود مقرر کی ہے جن کے اندر رہتے ہوئے مسلم لیگ (ن) اپنا ایجنڈا مکمل کرے گی؟

جواب: اصل میں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ حکومت بنانے سے پہلے ہماری جماعت اپنی اتحادی جماعتوں کے ساتھ عدلیہ کی بحالی، پرویز مشرف کی واپسی اور میڈیا کی آزادی کے معاملات طے کرے۔ ان معاملات پر اتفاق رائے کے بعد ہی مخلوط حکومت بن سکتی ہے۔ میاں نواز شریف پر ہمیں مکمل اعتماد ہے وہ ملک کی بہتری اور عوام کی فلاح چاہتے ہیں ان کا مطالبہ ہے کہ جسٹس افتخار محمد چوہدری کو بحال کیا جائے اور صدر مشرف کو رخصت کیا جائے۔ انتخابات سے دو دن پہلے تک

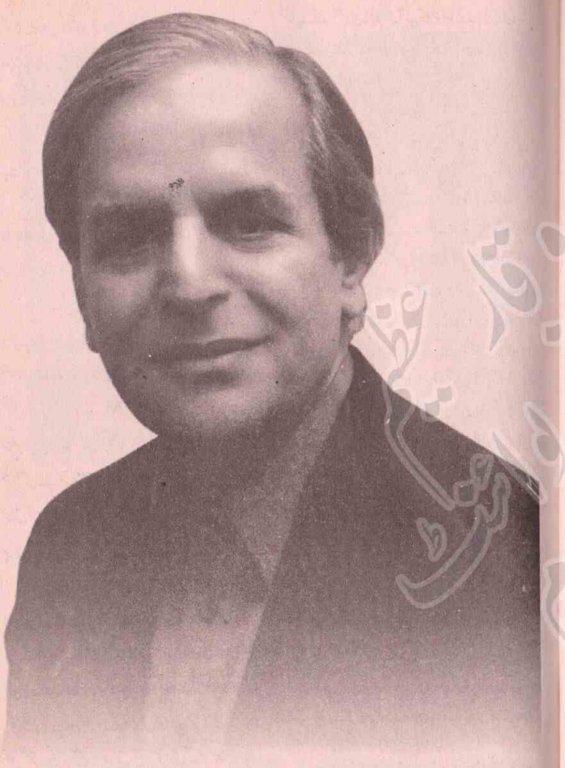

اربوں روپے لگا کر قوم کو ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن عوام نے حق اور سچائی کا ساتھ دیا۔ اس پر پوری قوم مبارکباد کی مستحق ہے اس وقت ساری دنیا کی نظریں (ن) لیگ اور پیپلز پارٹی پر لگی ہوئی ہیں کہ یہ آئندہ کیا لائحہ عمل اختیار کرتی ہیں جبکہ ہمارا اپنا نقطہ نظر عدلیہ کی آزادی، میڈیا کی آزادی اور صدر مشرف کے انڈر کام نہ

کرنا ہے ان ایشوز پر ہمارا مؤقف بالکل واضح ہے اور پیپلز پارٹی کے چیئرپرسن آصف علی زرداری نے بھی ہمارے مؤقف کی تائید کی ہے اور اس امر کا اعلان کیا ہے کہ مرکز میں (ن) لیگ اور پیپلز پارٹی باہمی مشاورت سے حکومت سازی کریں گے۔

سوال: 73ء کے آئین کی بحالی اور جسٹس افتخار محمد چوہدری کی بحالی پر بھی کیا آصف علی زرداری متفق ہو گئے ہیں؟

جواب: پی پی پی سے بات چیت جاری ہے دوسرے ایشوز کے ساتھ ہمیں امید ہے کہ پیپلز پارٹی جسٹس افتخار محمد چوہدری کے واپس آنے کے مسئلے پر بھی متفق ہو جائیں گے۔ 1973ء کے آئین کی بحالی پر تمام سیاسی جماعتیں متفق ہیں اور عوام کی بھی شدید خواہش ہے کہ 73ء کا آئین اپنی اصل روح کے ساتھ بحال کیا جائے۔ سوائے (ق) لیگ کے آئین کی بحالی پر کسی بھی پارٹی کو اعتراض نہیں ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا یہ انتخابات صاف اور شفاف ہوئے ہیں؟

جواب: دیکھئے انتخابات جمہوریت کی روح ہیں ان کا صاف شفاف ہونا ہی جمہوریت کے مضبوط ہونے کی نشانی ہے اور عوام کے مسائل عوامی انتخابات کے بعد ہی ختم ہوں گے۔ عدلیہ کی آزادی کے بعد دوبارہ انتخابات ہوں گے جو آزادانہ اور منصفانہ ہوں گے جس کے سامنے موجودہ انتخابات کچھ نہیں ہوں گے؟

سوال: آپ پر سینکڑوں مقدمات بنے' بیسیوں بار جیل گئے' کبھی ایسا ہوا کہ آپ کا حوصلہ ٹوٹا ہو' بچوں کے چہرے سامنے آ گئے ہوں اور دل میں آیا ہو کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں' کیوں کر رہا ہوں' کس کیلئے کر رہا ہوں۔

جواب: دیکھئے! میں نے کبھی جیلوں میں جانے کا نہیں سوچا تھا لیکن میری تربیت کچھ اس نہج پر ہو گئی کہ یہ آزمائشیں راستہ میں آنے والی معمول کی چیزیں لگتی رہی ہیں۔ جیل میں جانا بڑا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے دوست احباب اور عزیز و اقارب سے الگ ہونا' تنہا ہو جانا کافی اذیت ناک ہوتا ہے۔ لیکن Clarity of Mind اور اعلیٰ مقصد بہت بڑا حوصلہ دیتا ہے جو اذیت کو آپ تک نہیں پہنچنے دیتا۔ آپ نے سوال کیا ہے تو میں بار بار سوچ رہا ہوں کہ کب کوئی ایسا لمحہ آیا' مجھے یاد نہیں کہ کبھی کوئی ایسا وقت آیا ہو؟ میری جیلیں' صرف جیل میں آنا نہیں تھا۔ ہم جس خطے اور ملک میں رہتے ہیں وہاں جبر کی حکومتیں اذیت کے نت نئے طریقے بناتی ہیں۔ مجھ پر ستم کا ہر انداز آزمایا گیا' تشدد کے مختلف آلات استعمال کئے گئے' ایذا رسانی کے بدنام زمانہ عقوبت خانوں میں رکھا گیا شاہی قلعہ لاہور کی چونا منڈی ملتان کا سی آئی اے سٹاف۔ جس پر برف کی سلوں پر لٹایا گیا' لاہور کے ماڈل ٹاؤن تھانہ میں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ہاتھ باندھ کر تشدد کیا گیا' بندہ Directionless ہو جاتا ہے کہ میں کہاں ہوں کس طرف ہوں' اسلام آباد راولپنڈی کے تمام تھانوں میں رہا۔ لیکن کبھی کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا کہ جب میں نے سوچا ہو کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں مجھے واضح پتہ تھا کہ کیوں کر رہا ہوں۔

سوال: کوئی ایسی قید جو بہت اذیت ناک محسوس ہوئی ہو' ہو سکتا ہے بظاہر معمولی ہو لیکن جس نے اندر سے کچھ توڑا ہو' آپ اندر سے ہل گئے ہوں۔؟

جواب: جیل کا ہر دن اذیت کی داستان ہوتا ہے جیل کی ہر شام بڑی اداس کر دینے والی ہوتی ہے۔ جب لوگ جیل میں بند کر کے تالے لگا کر چلے جاتے ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ عزیز و اقارب قبر میں لٹا کر اوپر مٹی ڈال کر چلے گئے ہیں۔

سید جاوید ہاشمی کے ساتھ ادیب جاودانی کی ایک یادگار تصویر

جیل کے اندر کی کیفیات ہی عزیمت کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ آدمی مقاصد کے ساتھ جیل میں گیا ہو تو اسے صوفی بننا پڑتا ہے بلکہ وہ صوفی ہو جاتا ہے۔ آپ کے کمزور لمحات میں یہی صوفی ازم آپ کی قوت ہوتا ہے۔

سوال: آپ نے جیل کے اندر دو کتابیں لکھیں۔ ان کی تحریر بڑی عمدہ ہے کیا اس کی مشق کرتے تھے؟

جواب: نہیں! میں تو کاپیوں پر لکھتا چلا جاتا تھا۔ اس میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں کی۔ چھپنے کیلئے من و عن وے دیں' ایک پیراگراف بھی تبدیل نہیں کیا۔ یکسوئی تھی' شائد اس لئے روانی تھی۔ پہلی کتاب چھپنے کے بعد دیکھا تو میں خود حیران تھا کہ یہ میں نے لکھی ہے۔ نہرو نے کہیں لکھا تھا کہ میں نے جیل میں لکھی ہوئی اپنی کتاب پڑھی تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ یہ شاید جیل میں یکسوئی کی وجہ سے ہوتا ہے' چیزیں خود بخود اندر سے باہر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ جس کی خود بھی خبر نہیں ہوتی میں نے یہ سب کچھ پتہ نہیں انہماک کے عالم میں لکھا ہے یا بے خبری کے عالم میں اس کا جو بھی رنگ بنا چھپنے کے بعد ہی پتہ چلا۔ اب وہ جو کچھ بھی ہے پبلک پراپرٹی ہے۔ لیکن میں اپنی دونوں کتابوں کے طرز تحریر سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں' میں سمجھتا ہوں میں اس سے بہتر کر سکتا تھا۔

سوال: آپ اسلامی جمعیت طلبہ میں رہے‘ ظاہر ہے مولانا مودودی کی فکر سے متاثر تھے لیکن آپ جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہوئے‘ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: میں اسلامی جمعیت طلبہ کو طلبہ کی خدمت کرنے والی عظیم تنظیم سمجھتا ہوں‘ تعلیمی اداروں میں طلبہ کی کردار سازی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ بعد میں تو مجھے پتہ نہیں صورتحال کیا رہی۔ لیکن میں کبھی اس کا رکن نہیں رہا‘ ان کے کارکن کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ سید مودودی کو میں پیر روشن ضمیر کہتا ہوں اور مانتا ہوں۔ میری تربیت اور مزاج میں‘ میری کھڑے رہنے میں ان کی فکر کا حصہ ہے۔ ایک دن میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے کہا کہ میں جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہونا چاہتا‘ آپ کیلئے مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ میں تحریک استقلال میں شامل ہو رہا ہوں‘ آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ میں اپنے مشن اور اپنی سوچ پر قائم رہوں۔ انہوں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کام لے۔ میں نے مولانا سے اجازت لیکر اور ان کی دعا لیکر جماعت اسلامی میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان کی سوچ نے علامہ اقبال کی طرح دنیا میں اسلام کا روشن چہرہ عصری زبان میں متعارف کرایا‘ میں نے جیل میں پھر ان کو پڑھا‘ بہت ساری باتوں پر یقین پختہ ہوا اور بھی سکالرز کو پڑھا جنہوں نے اسلام کو جدید اسلوب میں بیان کیا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے ان سے روشنی حاصل کی ہے۔ لیکن میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ جماعت اسلامی کو نظریاتی نرسری کا کام کرنا چاہئے۔ اس سوچ پر لوگوں کو تیار کرنا چاہئے‘ ہر شعبے میں کام کرنا چاہئے اور یہاں سے لوگ عملی طور پر دوسرے شعبوں میں گئے ہیں‘ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جماعت کو اب بھی ایک آئیڈیل جماعت کے طور پر رہنا چاہئے۔ انہیں سیاسی Compromises کرنا پڑے تو لوگوں کے ذہنوں میں وہ آئیڈیل دھندلا جائے گا۔ جماعت کو اس حوالے سے اور سخت ہونا چاہئے‘ باقی ان کی اپنی پالیسیاں ہیں۔ ہماری مسلم لیگ ایک مسلمانوں کی سیاسی جماعت ہے۔ اس کا نظریہ اور سوچ جماعت سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں معاشرے کا ہر طبقۂ فکر موجود ہے جو معاشرہ میں ہے وہی پارٹی میں ہے۔ ہم مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو سیاسی نظام کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں۔

سوال: آپ ملک میں Icon of resistance بن کر ابھرے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ جس مقصد کیلئے آپ نے جیلیں کاٹیں‘ اذیتیں سہیں وہ کسی نہ کسی حد تک پورے ہوئے؟

جواب: 12 اکتوبر کو ہماری حکومت برطرف ہوئ اور میں ملتان آیا تو میں نے اپنے دوستوں کو بلایا کہ میر نے فیصلہ کیا ہے کہ اس اقدام کو چیلنج کروں گا۔ میر لئے یہ ناقابل برداشت ہے کہ ایسا معاشرہ ہو جس می لوگوں کو گولی سے ڈرایا جائے‘ لاٹھی سے ہانکا جائے‘ عظمت انسانی کی توہین ہے۔ پرویز مشرف کی فو مداخلت سے ملک کی پیشانی پر آمریت کا بڑا داغ لگ گ تھا۔ احباب نے کہا کہ یہ دور بھی طویل ہوگا میں نے بھ کہا کہ ہاں شاید مجھے زندگی میں سول سوسائٹی کی بالاد دیکھنا نصیب نہ ہو۔ جب پورا ملک قبرستان بن گیا تو م نے اذان دینے کا فیصلہ کیا اور یہ عزم کیا کہ اس را میں جو تکلیفیں آئیں گی جھیل لیں گے میں تو سوچتا تھا شاید میری آنے والی نسلیں یہ منظر دیکھ پائیں گی لیکن م سمجھتا ہوں کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان تکلیف اور قربانیوں کا صلہ بہت جلد مل گیا‘ آج پورے ملک آمریت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ہے اور

سول سوسائٹی نے بندوق اور جبر کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اصول و قانون کی بالادستی کی بات ہو رہی ہے۔ اب میں اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھ رہا۔ یہ شاید میری ان نواؤں کا صلہ ہے کہ میں اپنی جدوجہد کے شجر کو بار آور ہوتے دیکھ رہا ہوں۔

سوال: کچھ لوگ اپنی جرأت اور قربانیوں کی وجہ سے عوام میں زیادہ مقبول ہو جاتے ہیں ان کا سیاسی قد بہت بڑھ جاتا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتیں ابھی اتنی Mauture نہیں ہوئیں ان کے اندر گروپنگ بھی ہوتی ہے اور کھینچا تانی بھی کچھ لوگ خواہ مخواہ حسد کرنے لگتے ہیں کیا آپ کو ایسے حالات سے واسطہ پڑا ہے۔؟

جواب: میں تو اپنی جماعت کو اپنا خاندان سمجھتا ہوں‘ یہ میری فیملی ہے۔ فیملی میں بھی اختلاف ہوتا ہے کوئی تحمل سے بات کرتا ہے‘ کوئی بچہ شرارتیں کر رہا ہوتا ہے آپ نے ماں اور بہو میں توازن رکھنا ہوتا ہے‘ ماں کے احساسات ہوتے ہیں بیوی کا بھی دعویٰ ہوتا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتیں وقت کیساتھ ساتھ Mauture ہو رہی ہیں۔ میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ اگر کسی انسان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے اس کے کردار کے کچھ پہلو ایسے ہوں جن سے آپ کو گھن آئے لیکن کئی ایسے پہلو ضرور ہوتے ہیں جن کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہوتی ہے مجھے اپنی پارٹی کے اندر کبھی گھٹن محسوس نہیں ہوئی‘ میں کبھی Uncomfortable نہیں ہوا۔ اختلاف رائے اور رویوں سے ناراضگی تو ہر گھر میں ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک کا اپنا مزاج ہوتا ہے‘ بھائیوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ مختلف مزاجوں کو لے کر چلنا ہی اصل کام ہوتا ہے اور سب کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو یکجا کر کے معاشرے کیلئے فائدہ مند بنانا ہوتا ہے۔ اگر کسی پارٹی میں اختلاف رائے نہ ہو‘ کھینچا تانی نہ ہو تو وہ سیاسی جماعت ہی نہیں ہے یہ بڑے صبر آزما لمحات ہوتے ہیں جو ان سے تحمل سے گزرتے ہیں ان کی Acceptibility بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کو منفی انداز سے دیکھنے کے بجائے ہر مرحلے پر اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ کہاں میری کوتاہی ہے۔ اگر کسی سے فاصلہ بڑھ رہا ہے تو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں میرا کتنے فیصد حصہ ہے۔ مجھے پارٹی کے اندر کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میری خواہش ہے اور اللہ کرے کہ دوسرے بھی جرأت اور قربانی کے راستے پر چلیں تو مجھے خوشی ہو گی۔ ہمیں یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ صرف ہم ہی اچھا فیصلہ نہیں کر سکتے‘ دوسرے کی رائے بھی بہتر ہو سکتی ہے۔ اپنی رائے کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم جتنا Debate کریں گے بحث و تمحیص کریں گے تو اختلاف‘ رحمت بنتا جاتا ہے۔

سوال: آپ نے ہمیشہ جرأت اور عزیمت کا راستہ اختیار کیا جبکہ 12 اکتوبر کو فوجی مداخلت کے بعد جو حالات بنے اس میں آپ کی پارٹی مسلم لیگ (ن) کے سربراہ ایک مفاہمت کے نتیجے میں باہر چلے گئے‘ آپ اپنے لیڈر کے عمل کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: دیکھئے اس سے ہٹ کر کہ وہ میری پارٹی کے سربراہ ہیں نواز شریف کا سیاسی کردار بڑا شاندار ہے۔ ان کا کردار ایک مزاحمت کرنے والے لیڈر کا کردار ہے۔ ابھی ہمارے کچھ سیاستدان اور دانشور اس کردار کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ انہیں سمجھنے میں مشکل اس لئے پیش آتی ہے کہ میاں نواز شریف نے ایک صنعتکار کی حیثیت سے Originate کیا ہے۔ میں تاریخ کے ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے پورے وثوق سے کہوں گا

کہ نواز شریف نے مزاحمت کی جو جنگ لڑی ہے وہ تاریخ میں کم کم لوگوں نے لڑی ہے۔ اس ملک میں سب کو پتہ ہے کہ کمانڈر انچیف کسی وقت بھی صدر بن جاتا ہے۔ لیکن نواز شریف نے ان کی بالادستی نہیں مانی لوگ عجیب و غریب بات کرتے ہیں کہ وہ ہر ایک سے لڑتا ہے۔ یہی اس کی استقامت ہے کہ اس نے جرنیلوں سے کہا کہ وہ اپنی آئینی حدود میں رہیں اگر وہ کہہ رہا ہے کہ جناب اسلم بیگ آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے کہ آپ حکومت کی پالیسی کے خلاف بیانات دیں۔ یہی بات اگر ماؤزے تنگ کرتا، نیلسن منڈیلا کرتا تو ہم کہتے کہ کمال کر دیا ہے۔ ہمارا ایک Mindest بنا ہوا ہے ہم اس کی تصویر اسی چوکھٹے میں لے کر بیٹھے ہیں اور اپنی خواہش کے تحت تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔ میں بھی عراق کی حمایت میں تھا لیکن کمانڈر انچیف کا کام نہیں ہے کہ وہ وزیر اعظم کی پالیسی کے خلاف بیان دیتا پھرے۔ پھر آصف جنجوعہ آئے انہوں نے شاہ بندر پر خود ہی ایکشن کر دیا کہ میں صفائی کردوں گا۔ نواز شریف نے کہا کہ یہ آپ کا کام نہیں ہے، تو کیا اس نے غلط کیا؟ وحید کاکڑ آئے، نواز شریف نے ان کا کردار ماننے سے انکار کیا۔ پھر جہانگیر کرامت آئے انہوں نے کہا کہ ہمیں Powershare چاہئے، انہوں نے سیکورٹی کونسل کی تجویز دے دی، نواز شریف نے انکار کیا۔ پھر پرویز مشرف آئے انہوں نے معرکہ کارگل کر ڈالا لیکن اس کے باوجود میاں صاحب نے ان کے ساتھ نبھا کرنے کی حتیٰ الوسع کوشش کی لیکن وہ بڑھتے گئے بڑھتے گئے تو نواز شریف نے اپنا آئینی اختیار استعمال کیا یہ کہنا کہ یوں نہیں کرنا چاہئے ایسا کرنا چاہئے تھا ٹھیک ہے لیکن ان کا اقدام تو آئینی تھا نا! یہ تو ان کا جرنیلوں کے ساتھ اختلاف کا پس منظر تھا اب دیکھئے! جب ملک سے باہر گئے تو مجھے قائم مقام صدر بنایا۔ اگر وہ سرنڈر کرنا چاہتے تو قائمقام مجھے بناتے؟ اگر کوئی کمپرومائز ہوتا تو مزاحمت کرنے والے کو قائمقام صدر نہ بناتے۔ نواز شریف نے نہ سیاست سے سرنڈر کیا ہے، نہ موقف سے کیا ہے، نہ پارٹی سے کیا ہے، نہ قیادت کمپرومائز کرنے والی بنائی، آپ کیسے کہہ سکتے ہیں وہ کمپرومائز کرنے والا ہے اور میں فائٹر ہوں۔ آپ فرض کریں کہ وہ پارٹی فورم یا پلیٹ فارم ہی نہ رہنے دیتا تو ہم جیسے متوسط طبقے کے لوگ کدھر جاتے، کیا ق لیگ میں رسوا ہوتے؟ اس نے ہمیں فورم دیئے رکھا ہم تو اس کے شکر گزار ہیں۔ چھ سال کی قائمقامی کے بعد پارٹی بہتر صورت میں ہے۔ اس سارے عرصے کے دوران میاں نواز شریف ہمارا Source of Inspiration رہا ہے۔ اس لئے تاریخ جب نواز شریف کے کردار کو دیکھے گی تو وہ بہت جگمگاتا ہوا نظر آئے گا۔

سوال: (ق) لیگ کے رہنماء کہتے ہیں کہ جب نواز شریف ملک سے چلے گئے تو ہمیں تو سیاست کے میدان میں رہنا تھا اور مسلم لیگ کی سیاست کرنا تھی، اس لئے ہم نے سب کو اکٹھا کر کے مسلم لیگ (ق) بنالی، قصوروار ہم نہیں ہیں، قصوروار ملک سے چلے جانے والے ہیں؟

جواب: جناب! پارٹی تو انہوں نے نواز شریف کے یہاں ہوتے ہوئے ہی بنالی تھی۔ میاں نواز شریف اٹک قلعے میں تھے تو انہوں نے ہمارا وفد بھیجا جس میں میں، تہمینہ دولتانہ، سعد رفیق شامل تھے۔ ہم چوہدری شجاعت حسین کے گھر گئے تو انہوں نے کنونشن بلایا ہوا تھا اور نئی پارٹی کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ اس کے بعد ہماری جنرل مجید ملک کے گھر پر میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں الٰہی بخش سومرو، گوہر ایوب خان، وسیم سجاد، سرتاج عزیز اور راجہ ظفر الحق تھے میں بھی موجود تھا اس میں چوہدری شجاعت نے کہا کہ اگر وہ قائمقام صدر راجہ ظفر الحق کو بنائیں تو ہم کھڑے ہونے کیلئے تیار ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کی یہی شرط ہے تو بالکل! آپ راجہ صاحب کو بنالیں۔ اسی دوران چوہدری شجاعت کو آب پارہ والوں (خفیہ ایجنسی کے دفاتر) نے بلالیا۔ ہم پانچ چھ گھنٹے ان کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ وہ ایسی جگہ گئے ہیں کہ ابھی تک وہاں سے نہیں آئے ہم ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دوسری بات! چوہدری شجاعت حسین نے پارٹی اجلاس میں کئی دفعہ کہا کہ جو اس دفعہ فوجیوں کے ساتھ مل کر سیاست کرے گا وہ اپنی سیاسی موت کے پروانے پر مہر لگائے گا۔ میں نے ان کی یہ بات کئی دفعہ پبلک میں کہی لیکن انہوں نے کبھی تردید نہیں کی۔ اچھا! پارٹی انہوں نے بنالی لیکن یہ کس نے کہا کہ حکومت سنبھالنے والے جرنیل کی قیادت قبول کریں۔ کیا نواز شریف کے جانے کے بعد پرویز مشرف کی قیادت ان کیلئے لازمی ہو گئی تھی۔ مارشل لاء کا ساتھ دینا کیا ظاہر کر رہا تھا اور انہوں نے پارٹی بنائی بھی نہیں وہ تو اوروں نے بنائی۔ 18 ماہ تک پارلیمنٹ کو معطل رکھا کہ ممبران نواز شریف کو چھوڑ کر آجائیں تو یہ اسمبلی بحال ہو سکتی ہے لیکن ایم این ایز نے کہا کہ ہم نواز شریف کے علاوہ کسی اور کو لیڈر نہیں چنیں گے تو پھر مجبوراً انہوں نے اسمبلی کو توڑا۔ وہ پارلیمنٹ بحال کرنے کو تیار تھے لیکن ایم این ایز نے نواز شریف کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا انہوں نے عزیمت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ان لوگوں نے بہت بڑا گناہ کیا کہ جب عام ایم این اے نے بھی مارشل لاء کا سہارا بننے سے انکار کر دیا تھا، یہ لوگ ساتھ مل گئے، حالانکہ ایک ایم این اے کیلئے الیکشن بہت خوفناک مرحلہ ہوتا ہے غلام حیدر وائیں جیسا بے ضرر انسان بھی قتل ہو جاتا ہے۔ پورے آٹھ سال تک یہ لوگ مارشل لاء کی بیساکھی بنے رہے۔ اگر تو چوہدری شجاعت یہ کہتے کہ نواز شریف چلے گئے ہیں، ہم اس آمریت کا مقابلہ کریں گے، پارٹی بناتے قیادت سنبھالتے ہم بھی کہتے کہ وہ پارٹی کیلئے مخلص ہیں انہیں اپنی نہیں پارٹی کی فکر ہے یہ تو آمریت کے سامنے مٹی کا ڈھیر ہو گئے۔

سوال: بینظیر بھٹو کے والد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور کی بات کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب میں لکھا کہ بھٹو مرحوم کے دور میں آپ پر چار سو مقدمات بنے اور پنجاب کا شاید ہی کوئی ضلع ہو جہاں گرفتار نہ ہوئے ہوں۔ اب اتنے سالوں بعد جب بہت ساری چیزیں سامنے آگئی ہیں آپ بھٹو کو کیسا لیڈر سمجھتے ہیں ان کا دور کیسا تھا؟۔

جواب: جب بھٹو صاحب ملتان آئے تو میں نے ایک سٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ بہت ساری تصاویر اب بھی موجود ہیں، وہ تصویر آپ نے دیکھی ہوگی جس میں وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خطاب کر رہے ہیں۔ جب وہ جدوجہد کر رہے تھے تو ہم ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ لیکن جب انہیں حکومت ملی تو بلاشبہ انہوں نے بڑے اچھے بھی فیصلے کئے لیکن ہماری سیاست کا یہ المیہ رہا ہے کہ ہمارے سویلین حکمرانوں نے بھی جرنیلی انداز حکمرانی اپنایا اور انہوں نے بھی اپنے مخالفین کو برداشت نہیں کیا۔ بھٹو صاحب کا دوران کے سیاسی مخالفین کیلئے بدترین دور تھا۔ وہ اپنے آپ کو تمام تر اختیارات کا منبع بنانے کیلئے آئینی ترامیم کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ خود تو انہوں نے بھگتا ہی لیکن ایک لیڈر کی غلطیوں کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ جب ہمارے سویلین سیاستدان برسراقتدار آتے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو تمام چیزوں سے ماوراء سمجھتے ہیں خود کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے۔ میں اس کا قصور بھی جرنیلی

سیاست کو سمجھتا ہوں کیونکہ جب ایک سیاستدان عوام کا سامنا کرتے کرتے Maturity حاصل کرتا ہے تو جرنیل اسے خطرہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب یہ طاقتور ہو گیا، اب ہمارے احکامات کو نہیں مانے گا۔ ہماری لائن پر نہیں چلے گا تو اس کو ہٹا دیتے ہیں، بھٹو کیساتھ یہی ہوا۔ بھٹو اچھا لیڈر تھا مگر جمہوریت کیلئے جو کچھ کرنا چاہئے تھا اس سے الٹ کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بھٹو ایک نئی دنیا تخلیق کرنے کا ذہن رکھتے تھے، وہ عبقری تھے، ویژنری تھے۔ امریکہ مخالف دنیا کھڑی کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ امریکہ کو قابل قبول نہیں تھے۔ وہی خارجہ پالیسی میں چائنا فیکٹر کو لے کر آیا۔

سوال: آپ قومی اتحاد کی تحریک میں بہت سرگرم تھے۔ اس تحریک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں امریکی سی آئی اے کا کردار تھا۔ کیا آپ نے بھی کبھی محسوس کیا کہ منصوبہ بندی کہیں اور ہو رہی ہے اور کہیں اور سے فنڈز آ رہے ہیں؟

جواب: ایسی باتیں بعد میں ہوتی رہتی ہیں۔ تحریک کے دوران بھٹو صاحب خود کہہ رہے تھے کہ یہ Shopkeepers کا Counter revolution ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس تحریک میں چھوٹے تاجر چھوٹے صنعتی یونٹوں کے مالکان جن سے کارخانے چھین لئے گئے تھے سب سے متحرک تھے منڈیاں تھیں وہ فنڈنگ کر رہی تھیں کیونکہ بھٹو صاحب نے انہیں کرش کر کے رکھ دیا تھا۔ بھٹو صاحب تباہ کن آئینی ترامیم لائے، ان کی اقتصادی پالیسیاں بھی ملک کیلئے تباہ کن تھیں۔ اس کے اثرات چھوٹے چھوٹے کھوکھے والوں پر بھی پڑے اور ردعمل کے طور پر وہ بھی قومی اتحاد کا جھنڈا لگا کر بیٹھتے تھے۔ تحریک میں باہر سے کوئی فنڈنگ نہیں تھی۔ دراصل ہماری منصوبہ بندی اور ٹائمنگ بالکل صحیح تھیں۔ ہم نے کسی وکیل کو ٹکٹ دیا تو اس کے پیچھے بار تھی ہم نے منڈی والے کو دیا پیچھے منڈی تھی، ہم نے نوجوانوں کو ٹکٹ دیئے۔ ہم نے تحریک کو بہتر آرگنائز کیا۔ اسے آسانی سے کسی اور کے کھاتے میں کیسے ڈال سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے اتنی سیاسی مخالفتیں پیدا کر لی تھیں کہ سب اپنے اپنے دکھ سے متحرک تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمیں گھر پر گولی مارنے کے بجائے سڑک پر گولی مار دیں۔ بینظیر بھٹو بھی والد کی اقتصادی پالیسیوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکیں بلکہ اس سے اُلٹ ڈی نیشنلائزیشن کی پالیسی اپنائی۔

سوال: تو اس تحریک میں کوئی امریکی کردار نہیں تھا؟

جواب: نہیں نہیں! ایسا کچھ نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بھٹو کو ایٹم بم شروع کرنے کی وجہ سے اتارا گیا اور مارا گیا۔ بھٹو نے تو صرف ایٹم بم Concieve کیا تھا، ساری تیاری تو جنرل ضیاء الحق دور میں ہوئی اور چلایا نواز شریف نے۔ امریکہ کو کیا ملا، کیا وہ ایٹم بم روک سکا؟ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے ہم اپنی جنگ لڑ رہے ہوں اور فائدہ امریکہ اٹھا رہا ہو لیکن اس وقت وہ ملک کی ہر چیز قبضے میں لیتے جا رہے تھے۔

سوال: تو وہ جو Horrible Example بنانے والی بات کہی جاتی ہے؟

جواب: وہ تو ہنری کسنجر نے خود کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی، اس نے بار بار تردید کی ہے۔ اب کچھ باتیں غلط العام ہو جاتی ہیں، یہ بھی شائد وہی ہے۔

سوال: مجموعی طور پر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی سیاست میں امریکی کردار ہوتا ہے جو بعض اوقات فیصلہ کن ہو جاتا ہے؟

جواب: دیکھئے! امریکی پوری دنیا کے معاملات میں ہوتے ہیں۔ وہ پسند کرتے ہیں کہ ہر جگہ Authoritarian قابض ہوں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد روس سے مقابلہ کرنے کیلئے امریکہ نے Authoritative حکمرانوں کو سپورٹ کیا تھا۔ ان کا صدارتی نظام ہے وہ پسند کرتے ہیں کہ اختیارات فرد واحد میں مرتکز ہو جائیں۔ وہاں تو Checks & balance کا نظام موجود ہے۔ لیکن دوسری جگہوں پر وہ یہ نہیں چاہتے۔ سپر پاور کے طور پر حکومتیں بنانے اور گرانے میں ملکوں کو بنانے اور توڑنے میں ان کا رول ہے۔ پاکستان کے توڑنے میں بھی ان کا رول ہے، اس میں حصہ دار ہیں۔ وہ معاشروں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کیلئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اتفاق سے مسلم ممالک میں انرجی کے بڑے ذخائر موجود ہیں اور اب تو وسطی ایشیائی ریاستوں میں بڑے ذخائر دریافت ہوئے ہیں وہ بھی مسلم ہیں۔ امریکہ کی نظر ان ذخائر پر ہے، اس لئے ان ممالک میں اپنا اثر و رسوخ چاہتا ہے لیکن اب اس کا ردعمل شدید ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنی پالیسیوں میں ناکام ہوا ہے۔ دراصل امریکہ جمہوری قوتوں کو روکتا ہے جس سے دوسری قوتیں مضبوط ہوتی ہیں اس کی پالیسیوں سے انتہا پسندی بڑھی ہے۔ اگر امریکہ جمہوری قوتوں کا ساتھ نہیں دے گا تو پھر اسے ان لوگوں سے بات کرنا پڑے گی۔ جن کے ہاتھ میں بم ہو گا۔ اس نے بڑی سیاسی جماعتوں کو Marginalize کیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کا قصور یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے گھر والوں سے نہیں بناتے بلکہ امریکہ کا آسان شکار بن جاتے ہیں۔

سوال: آپ نے جنرل ضیاء الحق کا ساتھ دیا، ان کی کابینہ میں شامل ہوئے، کہا جاتا ہے کہ سیاست کو جتنا نقصان ضیاء الحق دور میں ہوا اتنا کسی دور میں نہیں ہوا، معاشرہ کو depoliticize کر دیا گیا؟

جواب: میں اس سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔ میں دوستوں سے کہتا بھی ہوں کہ اس طرح کے سخت سوال کیا کریں۔ دیکھئے! جنرل ضیاء الحق ملک میں گیارہ سال برسر اقتدار رہے لیکن میں ان کی کابینہ میں شروع کے صرف نو مہینے رہا ہوں باقی ساری مدت میں ان کی سیاست کا ناقد رہا ہوں، ریکارڈ پر موجود ہے۔ یہ بالکل درست بات ہے کہ سیاست کو سب سے زیادہ نقصان جنرل ضیاء الحق نے پہنچایا۔ ملک کو معاشرے کو Depoliticize کر دیا گیا۔

یہ جرنیلی سیاست ایک جیسی ہوتی ہے، میں تو کبھی جنرل مشرف کو جنرل ایوب کہہ دیتا ہوں کبھی جنرل ضیاء الحق کہہ دیتا ہوں۔ مجھے ان میں کوئی فرق نہیں لگتا، سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سارے جرنیل ایک ہی ڈگر پر چلتے ہیں، ان کا ایجنڈا ہی نہیں الفاظ بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بھٹو کے بعد جنرل ضیاء الحق کی جو کابینہ بنی اس کا مقصد یہ تھا کہ الیکشن کرائے اور رخصت ہو جائے۔ جب ہمیں انہوں نے کہا کہ الیکشن کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اب ہم الیکشن کا اعلان کرنے جا رہے ہیں۔ اس کیلئے نیوٹرل حکومت بنائیں گے، اس لئے جو انتخابات میں حصہ لینا چاہتے ہیں کابینہ سے مستعفی ہو جائیں۔ البتہ تین وزراء مجھے، محی الدین بلوچ اور علی احمد تالپور کو کہا کہ آپ ایک ماہ کے اندر فیصلہ کر کے بتا دیں۔ چنانچہ ساری جماعتوں کے وزراء سے استعفے لے لئے گئے۔ یہ تمام جماعتیں ان نو مہینوں کیلئے حکومت کا حصہ بنیں تھیں، اکیلا میں نہیں بنا تھا۔ میں نے کہا اس میں مہینہ سوچنے کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، چنانچہ میں نے اسی شام پریس کانفرنس میں مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا حالانکہ مجھے جنرل کے ایم عارف نے کہا کہ آپ جاری

رکھیں، کوئی الیکشن نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن میں نے کہا نہیں ہم الیکشن کروانے آئے تھے۔ بعد میں واقعی انہوں نے نہیں کرائے میں ساری مدت جنرل ضیاء الحق کا ناقد رہا۔ کوئی عہدہ نہیں لیا، ان کی شوریٰ میں نہیں گیا۔ 85ء میں آزاد ایم این اے بنا اور اسمبلی میں 6 جون کو پہلی تقریر میں کہا کہ

Mr. Martial law, attention about turn quick march, go back to your barracks and never come again.

جب وہ تقریر کرنے آئے تو میں نے اٹھ کر کہا کہ آپ **decorum** کو توڑ کر بندوق کے زور پر تقریر کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو جرأت کیسے ہوئی۔ اسی دور میں میرے بہنوئی کو، عزیز و اقارب کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ جنرل ضیاء کیا کرتے تھے کہ سزا دینے کا میرا اپنا طریقہ ہے۔ مجھے کہا کہ میں تمہیں ملتان میں نمٹوں گا۔ ہمارے مخالفین کو ابھارا، مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جنرل ضیاء الحق کی الیکشن کابینہ میں شامل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس وقت میری عمر 27,28 سال تھی میں نے وہ فیصلہ خود کیا تھا لیکن غلط کیا تھا۔ مجھے ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کہ یہ الیکشن کرا دیں گے۔

سوال: آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟

جواب: دیکھئے! میرے بھائی مختار ہاشمی کا انتقال ہوا ہے۔ میرا دل وہاں اٹکا ہوا ہے مجھے تو ابھی رونے دھونے میں لگا ہونا چاہئے تھا لیکن میں اپنے نظریات کی بات کر رہا ہوں، تقریریں بھی کر رہا ہوں انٹرویو بھی دے رہا ہوں۔ نظریات کیلئے تو بہت قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ لیکن اپنے اقتدار کیلئے دوسروں کو بری طرح دھکیل کر رستے بنانا سیاست نہیں ہے، وہ ہوس ہے، ہوس اور سیاست میں فرق ہے۔ سیاست لوگوں کے معاملات کو احسن طریقے سے چلانے کا نام ہے لوگوں کی نظر میں سیاست کا صحیح تصور یا تصویر نہیں آئی۔ جس سیاست کو ہم پسند کرتے ہیں وہ اب انشاء اللہ آہستہ آہستہ ابھر رہی ہے۔ مغرب والے ایک دوسرے کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے لیکن قومی معاملات پر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں، سیاست کا دل قوم کیلئے دھڑکنا چاہئے لیکن ہوس والی سیاست کے سینے میں واقعی دل نہیں ہوتا۔ ○

نمکین غزل

ساتھ موبائل کے کنکشن مفت ہے
اور ساتھ ڈراموں کے فیشن مفت ہے
ساتھ دودھ کے پانی مفت ہے
پولیس کے ساتھ رشوت کھانی مفت ہے
ساتھ حکومت کے مہنگائی مفت ہے
اور امریکہ کے ساتھ لڑائی مفت ہے
ساتھ سونے کے انگڑائی مفت ہے
فلموں کے ساتھ بے حیائی مفت ہے
ساتھ تعلیم کے عقل مفت ہے
اور امتحان میں نقل مفت ہے
یوں تو آتش مہنگائی ہے کتنی زیادہ
لیکن سوچیں تو اتنا کچھ مفت ہے

عاصم لطیف، خانیوال

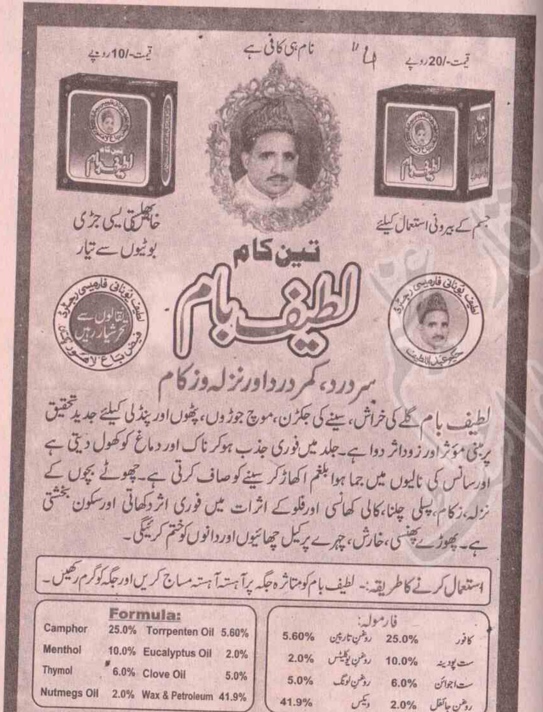

قیمت -/10 روپے

نام ہی کافی ہے

قیمت -/20 روپے

خالص دیسی جڑی بوٹیوں سے تیار

جسم کے بیرونی استعمال کیلئے

تین کام

لطیف بام

لطیف یونانی فارمیسی رجسٹرڈ
نقالوں سے ہوشیار رہیں
فیض باغ لاہور

لطیف یونانی فارمیسی رجسٹرڈ
حکیم عبداللطیف

سر درد، کمر درد اور نزلہ و زکام

لطیف بام گلے کی خراش، سینے کی جکڑن، موچ جوڑوں، پٹھوں اور پنڈلی کیلئے جدید تحقیق پر مبنی موثر اور زود اثر دوا ہے۔ جلد میں فوری جذب ہو کر ناک اور دماغ کو کھول دیتی ہے اور سانس کی نالیوں میں جما ہوا بلغم اکھاڑ کر سینے کو صاف کرتی ہے۔ چھوٹے بچوں کے نزلہ، زکام، پسلی چلنا، کالی کھانسی اور فلو کے اثرات میں فوری اثر دکھاتی اور سکون بخشتی ہے۔ پھوڑے پھنسی، خارش، چہرے پر کیل چھائیوں اور دانوں کو ختم کریگی۔

استعمال کرنے کا طریقہ:۔ لطیف بام کو متاثرہ جگہ پر آہستہ آہستہ مساج کریں اور جگہ کو گرم رکھیں۔

فارمولہ:

کافور	25.0%	روغن تارپین	5.60%
ست پودینہ	10.0%	روغن یوکلپٹس	2.0%
ست اجوائن	6.0%	روغن لونگ	5.0%
روغن جائفل	2.0%	ویکس	41.9%

Formula:

Camphor	25.0%	Torrpenten Oil	5.60%
Menthol	10.0%	Eucalyptus Oil	2.0%
Thymol	6.0%	Clove Oil	5.0%
Nutmegs Oil	2.0%	Wax & Petroleum	41.9%

لطیف یونانی فارمیسی رجسٹرڈ
فیض باغ لاہور فون: 7283072, 6276524 فیکس: 6260675
برانچ آفس: سرہندی مارکیٹ، بالمقابل نگار سینما، بھاٹی چوک، لاہور

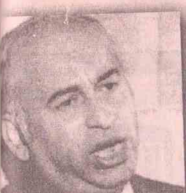

بھٹو کی موت سے میرا دل آج بھی بوجھل ہے

چیف جسٹس اور میں نے بھٹو کی جان بچانے کیلئے دو مرتبہ کوشش کی

مسعود محمود کی گواہی وزنی ثابت ہوئی جو بھٹو کو **سزائے موت** تک لے گئی

چار جج صاحبان ہائی کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھنے کے حق میں تھے، تین کا نقطہ نظر مختلف تھا

ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) کی طرف سے ہائیکورٹ کے فیصلے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کردہ اپیل اور عدالت کے فیصلے پر جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ نے اپنی خودنوشت سوانح ''کچھ یادیں اور تاثرات'' میں سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ وہ سپریم کورٹ کے اس بنچ میں شامل تھے جس نے ان کی سزائے موت برقرار رکھنے کا فیصلہ دیا۔ لیکن پس پردہ بھٹو کی جان بچانے کیلئے جو کوششیں کی گئیں ان پر سے ان کی کتاب کے باب ''سزائے موت کے خلاف اپیل'' میں پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ باب تاریخ کے ہر طالب علم کیلئے دلچسپی کا سامان رکھتا ہے۔ زیر نظر اقتباسات جناب نسیم حسن شاہ کی خودنوشت سے لئے گئے ہیں جس کا اردو ترجمہ جناب ذوالقرنین نے کیا ہے۔ (ادارہ)

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کے فیصلہ پر جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ کے تاثرات

سزائے موت کے خلاف معزول وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل 1978ء کے موسم خزاں میں

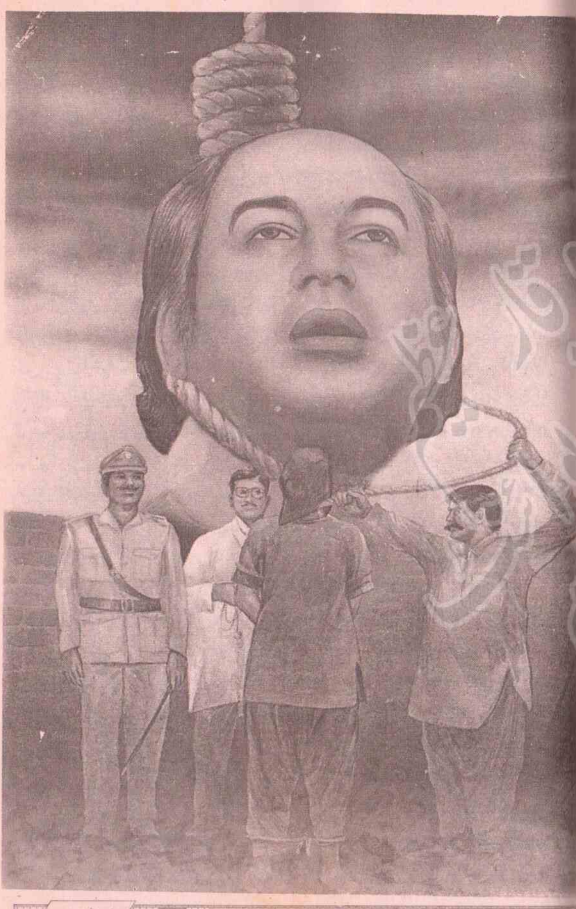

سپریم کورٹ میں سماعت کیلئے پیش ہوئی۔ لاہور ہائیکورٹ نے مسٹر بھٹو کو اس جرم میں سزا سنائی تھی کہ وہ زاب احمد خان کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔ اس مقدمے میں مرحوم نواب احمد خان کے بیٹے احمد رضا خان قصوری استغاثہ کی جانب سے مرکزی کردار بن کر سامنے آئے۔ وہ 1960ء کے عشرے میں طالب علم رہنما کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور جب پیپلز پارٹی وجود میں آئی تو اس میں شامل ہوگئے۔ 1969-70ء کے دوران انہوں نے مسٹر بھٹو کی قیادت میں سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور 1970ء میں انہیں اپنے آبائی شہر قصور کی نشست سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنے کیلئے پیپلز پارٹی کا ٹکٹ دیا گیا۔ 1971ء میں وہ پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر تحریک استقلال میں شامل ہوگئے جس میں انہیں ایک اہم عہدہ بھی دیا گیا۔ انہوں نے عوامی نیشنل پارٹی کے رہنما عبدالولی خان کے ہمراہ اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ طویل القامت اور تنومند احمد رضا نے اپنی گرجدار آواز، بے باکانہ انداز میں جارحانہ طرز عمل کے ساتھ وزیراعظم مسٹر بھٹو کو قومی اسمبلی میں ٹوکنا اور ان سے الجھنا شروع کردیا۔

جون 1974ء میں قومی اسمبلی کے ایک اجلاس کے دوران مسٹر بھٹو نے غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ”تم چپ رہو۔ بہت ہو چکی ۔ تم سراسر زہریلے ہو۔ میں تمہاری بیہودگی مزید برداشت نہیں کروں گا۔“ احمد رضا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں بھی تمہارا یہ انداز برداشت نہیں کر سکتا۔“ مسٹر بھٹو نے پھر چلا کر کہا ”میں اس شخص کو بہت برداشت کر چکا ہوں یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟“

مسعود محمود جو اعلیٰ درجے کا پیشہ ور پولیس افسر اور فیڈرل سیکورٹی فورس کا ڈائریکٹر جنرل تھا، اس وقت پارلیمنٹ میں موجود تھا۔ اس نے یہ مکالمہ سنا۔ مسعود محمود نے جو بعد میں اس مقدمے میں استغاثے کی طرف سے بطور وعدہ معاف گواہ کے پیش ہوا، عدالت میں یہ بیان دیا کہ وزیراعظم نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کام کرنے کیلئے اپنے نائبین میں سے ایک یعنی میاں عباس کو ساتھ لو اور قصوری کی لاش پیش کرو۔ وزیراعظم نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں اس حکم کی تعمیل کے سلسلے میں تمہیں ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھوں گا مسعود محمود کہتا ہے کہ میں نے اس حکم کے خلاف یہ کہہ کر احتجاج کیا کہ یہ میرے ضمیر اور احکام الٰہی کے خلاف ہے لیکن وزیراعظم غصہ سے بے قابو ہو گئے اور کہا کہ میں مسعود محمود سے اس بارے میں کوئی بک بک نہیں سنوں گا۔ پارلیمنٹ میں یہ فقروں کا تبادلہ اور وزیراعظم اور ڈائریکٹر ایف ایس ایف کے درمیان معلوم ہونے والی باتیں ہائیکورٹ میں مقدمے کی سماعت کے دوران ذہنوں پر چھائی رہیں۔

11 نومبر 1974ء کو نصف شب کے وقت احمد رضا شادمان کالونی لاہور میں شادی کی ایک تقریب میں شرکت ۔کے بعد اپنی کار میں واپس گھر جا رہے تھے۔ کار میں ان کے علاوہ ان کے ساتھ والی نشست پر ان کے والد اور عقبی نشست پر ان کی والدہ اور ہمشیرہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ خودکار ہتھیاروں سے متعدد شاٹ فائر کیے گئے اور ان کی کار کو متعدد مقامات پر گولیاں لگیں۔ احمد رضا کے والد نواب محمد احمد خان کو سر میں

گولی لگی جبکہ کار میں سوار دوسرے تینوں افراد کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ احمد رضا گاڑی کو سیدھا یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال لے گئے یہ جائے حادثہ سے زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ نواب محمد احمد خان زخموں کی تاب نہ لائے اور صبح 2 بج کر 55 منٹ پر دم توڑ گئے۔ نامعلوم حملہ آوروں کی شناخت نہ ہو سکی۔ اپنے والد کی وفات کے چند منٹ بعد ہی احمد رضا نے ایف آئی آر درج کرائی۔ احمد رضا نے زور دے کر کہا کہ فائرنگ درحقیقت انہیں سیاسی وجوہ کی بنا پر اور پارلیمنٹ میں وزیراعظم کے خلاف ”گستاخی“ (Defiance) کی سزا دینے کیلئے کی گئی ہے انہوں نے اپنے قتل کی سازش میں وزیراعظم کو نامزد کر دیا۔ درحقیقت احمد رضا نے اس واقعے کے ایک روز بعد 5 جون کو پارلیمنٹ میں ایک تحریک استحقاق پیش کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ انہیں فون پر یہ دھمکیاں دی جا رہی ہیں کہ کل ایوان میں وزیراعظم سے جھڑپ کے بعد نتائج بھگتنے کیلئے تیار رہو۔

17 اکتوبر 1975ء میں اس مقدمہ کو آئی جی پنجاب پولیس کی طرف سے ہدایات کے بعد اس تبصرے کے ساتھ داخل دفتر کر دیا گیا کہ اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ تاہم جولائی 1977ء میں مارشل لاء لگنے کے بعد یہ مقدمہ دوبارہ شروع کیا گیا اور ایف آئی اے کو حکم دیا گیا کہ وہ ایف ایس ایف (وفاقی تحقیقاتی ایجنسی) کے طریق کار، اس کے افسروں اور مختلف سیاسی ہلاکتوں اور اغواء کے واقعات سے متعلق الزامات کی تفتیش کرے۔

تحقیقات کے دوران احمد رضا کے والد کے قتل کے بارے میں دو سب انسپکٹروں سے تفتیش کی گئی اور 26 جولائی 1977ء کو انہیں حراست میں لے لیا گیا۔ انہوں نے ایک اعترافی بیان پر دستخط کر دیئے۔ مسعود محمود اور ان کے جونیئر افسروں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان سب سے اعتراف جرم پر مشتمل بیانات لئے گئے۔

مسٹر بھٹو کو کراچی میں گرفتار کر کے لاہور لایا گیا، جہاں مقدمے کے دوران انہیں جیل میں رکھا گیا۔ لاہور ہائیکورٹ کے ایک جج نے ان کی ضمانت منظور کر لی لیکن چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے حکم پر انہیں فوری طور پر ایک مارشل لاء ریگولیشن کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

محمد مسعود وعدہ معاف گواہ بن گئے اور یہ انہی کی گواہی تھی جو ہائیکورٹ میں سماعت کے دوران وزنی ثابت ہوئی اور مسٹر بھٹو کو سزائے موت تک لے گئی۔ مقدمے کی سماعت مکمل ہونے کے بعد مسعود محمود کو قید سے رہا کر دیا گیا اور وہ کیلی فورنیا جا کر آباد ہو گئے۔ 90ء کے عشرے کے اوائل میں ان کا انتقال ہو گیا۔

پنجاب ہائیکورٹ کے پانچ ججوں پر مشتمل ایک بنچ نے مقدمے کی سماعت کی، جس کی صدارت چیف جسٹس انوارالحق کر رہے تھے۔ عدالت نے شہادتوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ استغاثہ اپنا یہ موقف ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ مسٹر بھٹو کے تعلقات احمد رضا سے کشیدہ تھے اور یہ کشیدگی احمد رضا سے نجات حاصل کرنے کا محرک بن گئی۔ ہائیکورٹ نے قرار دیا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے فیڈرل سیکورٹی فورس کے سربراہ مسعود محمود سے مل کر یہ سازش تیار کی

اور اسلام آباد میں احمد رضا قصوری پر حملہ بھی اسی آپریشن کا حصہ تھا۔ لاہور میں قصوری کی کار پر حملہ بھی، جس میں ان کے والد مارے گئے، اسی سازش کی تکمیل کیلئے کیا گیا۔ عدالتی فیصلے میں مزید کہا گیا کہ اس مقدمے میں ابتدائی تحقیقات دیانتدارانہ نہیں تھیں اور مختلف سطحوں پر تحقیقات کو صحیح رخ سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تاکہ اصل مجرموں پر پردہ ڈالا جا سکے۔ آخر میں ہائیکورٹ نے نشاندہی کی کہ ملزم کے حق میں ایسے حالات بھی نہیں تھے جنہیں جرم کی شدت میں کمی کا باعث تصور کیا جا سکے۔ ذوالفقار علی بھٹو ملک کے وزیراعظم تھے اور پاکستان کے شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا، ان کا فرض تھا اس میں یہ بھی نشاندہی کی گئی کہ زیڈ اے بھٹو کے لیے اپنے مخالفوں سے جان چھڑانے کی خاطر ایف ایس ایف کو استعمال کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہائیکورٹ نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ فیڈرل سیکورٹی فورس کے وہ ارکان جنہوں نے اس حکم پر عملدرآمد کیا، ان پر افسران کے غیر قانونی احکامات ماننے کے سلسلے میں کوئی جبر نہیں تھا اور اس بارے میں ان کا موقف قانونی طور پر جائز دفاع فراہم نہیں کرتا۔ مسٹر بھٹو پر قتل کا جرم عائد کیا گیا اور انہیں سزائے موت سنائی گئی۔

مسٹر بھٹو نے سزائے موت کے خلاف اپیل دائر کی۔ اس وقت تک میں سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج تھا۔ لہٰذا اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ میں کسی ایسی اپیل کی سماعت میں بھی شامل ہوں گا۔ ایسے اہم مقدمات کبھی ایڈہاک ججوں کے سامنے پیش نہیں کئے گئے تھے اور معمول کے مطابق توقع تھی کہ مستقل ججوں پر مشتمل بنچ ہی اس کیس کی سماعت کے لئے تشکیل دیا جائے گا۔ لیکن اس مقدمے میں اس معمول کے مطابق عمل نہ کیا گیا۔ اپریل 1978ء کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے کہ میں شام کے وقت ایک تقریب میں شرکت کیلئے تیار ہو رہا تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی کہ پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مسٹر مشتاق حسین اور اٹارنی جنرل مسٹر شریف الدین پیرزادہ مجھ سے ملنے کیلئے آئے ہیں۔ میں ان سے ملنے کے لیے مہمانوں کے کمرے میں پہنچا، باہمی خیریت معلوم کرنے کیلئے رسمی کلمات کے بعد انہوں نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ مجھے بھی سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کی اپیل کی سماعت کرنے والے اپیلیٹ بنچ میں شامل کیا جائے۔ میں نے ان سے کہا میں ایڈہاک جج ہوں، اس لئے میرا اس بنچ میں بیٹھنا نامناسب ہوگا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے دونوں مہمان جو اس مقدمے میں فریق بن چکے ہیں، ان کا طرز عمل درست نہیں، انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس موضوع پر مجھ سے سلسلہ کلام کا آغاز کریں۔ وہ اس صورتحال سے پوری طرح آگاہ تھے لیکن پھر بھی انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے اس بنچ میں بیٹھنا چاہیے۔ میں اس پر اتفاق کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ بہرحال مختصر سی بحث کے بعد میں، یہ سوچ کر کہ چیف جسٹس عدالتی معاملات میں نہایت دیانتدار آدمی ہیں اور یہ دو معزز حضرات ان کے ساتھ مراسم کے باوجود یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کرنے کی جسارت نہیں کرینگے، ان سے کہا کہ میں چیف جسٹس کی ہدایات کے مطابق کام کروں گا۔ لیکن چند روز بعد چیف جسٹس نے مجھے مطلع کیا کہ پوری عدالت 9 ججوں پر مشتمل ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ تعداد برقرار رہے اور چونکہ تم 9ویں جج ہو، اس لئے تمہیں بھی اپیل کی سماعت کرنے والے بنچ میں بیٹھنا ہوگا۔

سپریم کورٹ میں نو ججوں پر مشتمل بنچ نے مقدمے کی سماعت شروع کی جو 30 جولائی 1978ء تک جاری رہی اور اسی روز مسٹر جسٹس قیصر خان، جن کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا اور جو بظاہر بھٹو کی اپیل منظور کرنے کے حق میں نظر آتے تھے، 65 برس کی عمر پوری ہونے پر ریٹائر ہو گئے۔ تاہم باقی آٹھ ججوں نے 20 نومبر 1978ء تک سماعت جاری رکھی، بدقسمتی سے جسٹس وحید الدین جن کا تعلق کراچی سے تھا اور جو مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں میرے چیف جسٹس رہ چکے تھے، دل کا دورہ پڑنے سے سخت بیمار ہو گئے۔ دل کے دورے سے ان کی نظر، قوت گویائی اور عام جسمانی حرکات بری طرح متاثر ہوئیں اور چند ہفتے اپنی صحت یابی کا انتظار کرنے کے بعد انہیں بنچ سے دستبردار ہو جانا پڑا۔ مسٹر وحید الدین کی علالت اور بنچ سے دستبرداری کے باعث بھٹو کے نقطہ نظر سے مقدمے کو شدید دھچکا لگا، اس لیے کہ وہ کھل کر اور بڑے زور دار طریقے سے ہائیکورٹ کے فیصلے کی مخالفت کرتے تھے اور مسٹر بھٹو کے نقطہ نظر کے شدت سے حامی نظر آتے تھے۔ یوں بنچ صرف سات ججوں پر مشتمل رہ گیا۔ ان میں سے چار کا تعلق پنجاب سے تھا۔ چیف جسٹس انوار الحق، جسٹس ایم اکرم، جسٹس کرم الٰہی چوہان اور میں باقی تین جج دوسرے صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جسٹس دراب پٹیل اور جسٹس ایم حلیم سندھ سے اور جسٹس صفدر شاہ سرحد سے تھے۔

مقدر کی ستم ظریفی دیکھئے جو بے مثال تو نہیں لیکن تعجب خیز ضرور ہے کہ اپیل کی سماعت کے موقع پر تینوں بنیادی کردار یعنی چیف پبلک پراسیکیوٹر مسٹر اعجاز حسین بٹالوی، سابقہ اٹارنی جنرل اور سب سے بڑے وکیل دفاع مسٹر یحییٰ بختیار اور سب سے بڑے ملزم یعنی معزول وزیراعظم، تینوں لندن بار میں رفیق کار رہ چکے تھے اور لکنز ان میں کم و بیش ایک دوسرے کے ہم عصر تھے۔ مسٹر بھٹو اور مسٹر بٹالوی دونوں نے 1953ء میں بار کا امتحان پاس کیا اور مسٹر یحییٰ بختیار نے ان سے تین برس پہلے مسٹر اعجاز حسین بٹالوی اس وقت تک ایک بڑے فوجداری وکیل کی حیثیت سے نام کما چکے تھے اور عام طور پر مدعا علیہ کی طرف سے پیش ہوتے تھے۔ دراز قد، چھریرے بدن اور عقابی ناک والے اعجاز بٹالوی کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہے اور وہ عدالت میں زوردار خطابت کی بے پناہ صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ بیرون ملک مقدمے کی رپورٹنگ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بین الاقوامی صحافی ان کی خطابت سے یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے۔ وہ ایک زمانے میں مسٹر بھٹو کے بڑے اچھے دوست تھے اور مسٹر بھٹو نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے انہیں کئی مرتبہ بیرون ملک پاکستان کی نمائندگی کرنے والے وفود کیلئے نامزد کیا۔ شروع میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے سابق

یحییٰ بختیار نے درشت لہجہ میں کہا ”مجھے اس کے سوا کسی اور بات سے غرض نہیں کہ میں یہ ثابت کرنا چاہوں کہ بھٹو بے گناہ ہیں

ایڈووکیٹ جنرل مسٹر انور کو پبلک پراسیکیوٹر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ بھی مسٹر بھٹو کے قریبی دوست رہ چکے تھے، لیکن جب انہوں نے لاہور میں وکلاء کے ایک اجتماع میں ججوں کے بارے میں نامناسب تبصرہ کیا تو وہ مسٹر بھٹو کے مخالف ہوگئے۔ مسٹر انور لاہور ہائیکورٹ میں مقدمے کی سماعت کے دوران انتقال کرگئے اور ان کی جگہ مسٹر بٹالوی کو مقرر کردیا گیا۔ مسٹر بٹالوی نے، اپنے سابقہ دوست کے خلاف مقدمہ لڑنے میں اس لئے کوئی خلش محسوس نہ کی کہ انہیں یقین تھا کہ مسٹر بھٹو نے فیڈرل سیکورٹی فورس کو ناجائز استعمال کیا تھا۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر مسٹر بھٹو کی سزائے موت معاف کردی جاتی تو آج پاکستان کا سیاسی نقشہ کیا ہوتا! معافی کے لیے سپریم کورٹ نے صدر جنرل ضیاء الحق سے سفارش کی تھی۔ مسٹر یحیٰی بختیار، کوئٹہ، بلوچستان کے ایک دولت مند اور جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ طویل القامت، وجیہہ اور دلکش انداز گفتگو کے مالک یحیٰی بختیار نے لاہور میں تعلیم پائی اور زمانہ طالب علمی میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نوجوان بیرسٹر کی حیثیت سے انہوں نے بلوچستان اور کوئٹہ میں بڑا نام کمایا لیکن سپریم کورٹ یا مغربی پاکستان ہائیکورٹ کی سطح پر وہ زیادہ سامنے نہیں آئے تھے۔ بہر حال مسٹر بھٹو نے انہیں دسمبر 1971ء میں اٹارنی جنرل مقرر کیا۔ وہ مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے جانے تک اس عہدے پر قائم رہے۔

میں اب پہلی بار یہ انکشاف کرسکتا ہوں کہ کس طرح چیف جسٹس اور میں نے مسٹر بھٹو کی زندگی بچانے کوشش کی۔ چار جج صاحبان (جن کا تعلق پنجاب سے تھا) بظاہر ہائیکورٹ کا فیصلہ برقرار رکھنے کے حق میں تھے، جس کے مطابق مسٹر بھٹو کا جرم ثابت ہوچکا تھا اور انہیں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ باقی تین ججوں کا نقطہ نظر مختلف تھا جس کی بنا پر ساری ذمہ داری کا بھاری بوجھ چیف جسٹس انوار الحق کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ وہ نہایت محبّ وطن شخص تھے اور ان خبروں سے سخت پریشان تھے کہ اگر عدالت نے بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ برقرار رکھا تو دوسرے صوبوں پر خصوصاً سندھ پر اس کے نہایت منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں کہ اس صورت میں صوبوں کے درمیان دراڑ پیدا ہوجائے گی، ان میں مصالحت کرانا مشکل ہوجائے گا اور مستقبل میں وہ یکجہتی کیساتھ کام کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ پاکستان کی وحدت کے حوالے سے ایک تباہ کن نقشہ کھینچا جارہا تھا۔ چیف جسٹس انوار الحق سمجھتے تھے کہ ایسی صورتحال بہت افسوسناک ہوگی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے یہ چاہتے تھے کہ ممکن حد اس سے بچنے کی کوشش کیا جائے۔ اس بات پر گہرے غور وفکر کے بعد اس مشکل صورتحال کا وہ حل کیا ہوسکتا ہے، جس کے ذریعے ایک طرف انصاف کے تقاضے پورے ہوجائیں تو دوسری طرف وفاق پاکستان کی وخدت پر پڑنے والے تباہ کن اثرات سے بھی بچا جاسکے، انہوں نے ایک طریق کار تجویز کیا جو ان کے خیال میں صورتحال کو تباہ کن ہونے سے بچا سکتا تھا، اس پر عمل درآمد میں اہم کردار ادا کرنے کیلئے انہوں نے مجھے منتخب کیا۔ وہ جانتے تھے کہ جسٹس دراب پٹیل کے ساتھ میرے اچھے دوستانہ مراسم ہیں اور یہ بھی کہ میں نے مقدمے کی سماعت کے دوران کبھی واضح انداز میں اپنا عندیہ دیا نہ مقدمے کے کسی پہلو پر کھل کر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا تھا۔ مقدمے کی رپورٹنگ کرنے والے اخبار نویسوں نے بھی متعدد مرتبہ یہ لکھا کہ میرے حتمی نقطہ نظر کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ سو مجھے مشورہ دیا گیا کہ مجھے مقدمے اور ملک کی عمومی صورتحال کے بارے میں جسٹس دراب پٹیل سے تفصیلی گفتگو کرنی چاہئے۔ مسٹر بھٹو کو قصوروار نہ سمجھنے والے دھڑے میں وہ سب سے سینئر جج تھے اور اس ناتے وہ صورتحال سے نمٹنے میں سب سے زیادہ موثر کردار ادا کرسکتے تھے۔ چیف جسٹس انوار الحق کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ صوبوں کے درمیان تلخی اور منافرت سے بچنے کیلئے عدالت کی طرف سے متفقہ فیصلہ سنایا جائے۔ اس تجویز کے مطابق زیادہ قرین عدل یہ فیصلہ تصور کیا گیا کہ پنجاب کے ججوں کو مسٹر بھٹو کی سزا میں تخفیف کا قائل کیا جائے (اور یوں مسٹر بھٹو کی جان بچالی جائے) جبکہ مسٹر بھٹو کے حامی جج انہیں نواب احمد خان کی موت کا ذمہ دار قرار دینے سے اتفاق کرلیں۔

اس خیال سے متفق ہونے اور مسٹر بھٹو کی زندگی بچانے میں گہری دلچسپی کے سبب میں نے بلا تامل جسٹس دراب پٹیل سے ملنے اور اس تجویز کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کرنے کی حامی بھرلی۔

چنانچہ میں نے ان سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کیلئے وقت مانگا اور انہیں مطلع کیا کہ میں اس مقدمے کے بعض پہلوؤں کے بارے میں ان سے تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مہربانی کی اور مجھے اگلی شام ہی ڈِنر پر مدعو کرلیا۔ میں یہاں یہ ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ مسٹر بھٹو ذاتی طور پر مجھ پر بہت مہربان رہے تھے۔ انہوں نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے وفد کی قیادت کیلئے مجھے منتخب کیا اور سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج کے طور پر بھی میرا انتخاب کیا۔

چھوٹے قد کے دبلے پتلے اور جسمانی اعتبار سے کمزور دراب پٹیل کا چہرہ پارسیوں کے مخصوص نقوش کا حامل تھا۔ وہ پاکستان میں پارسی برادری کے ایک ممتاز فرد تھے۔ پارسی ان زرتشتیوں کی اولاد ہیں، جنہوں نے 700ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایران کی تسخیر کے بعد اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔

اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ پر ہماری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بہت عمدہ ڈِنر کا اہتمام کیا تھا جس کے دوران یہ سارا معاملہ زیر بحث آیا لیکن بدقسمتی سے اس شام اس سے زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ جسٹس دراب پٹیل، چیف جسٹس انوار الحق کی تجویز سے اتفاق کرنے پر بالکل آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی جج کا فیصلہ ایک ایسا معاملہ ہے جو اس کے ضمیر سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا اس پر کوئی تبادلہ خیال نہیں ہوسکتا۔ میں نے چیف جسٹس انوار الحق کی پیشکش کے منصفانہ ہونے پر زور دیا اور یہ نشاندہی کی کہ وہ حقیقی اور قانون کے مطابق ہے اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ

دفعہ 302 پی پی سی کے تحت ملزم کے قصوروار ثابت ہونے کے بعد موت کی سزا مناسب ہے یا نہیں تو یہ معاملہ ہر جج کی صوابدید پر منحصر ہے۔ تاہم وفاق پاکستان کے وسیع تر مفادات کی خاطر ججوں کے مابین یکجہتی کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ صوابدیدی اختیار کو کم تر سزا دینے کے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جسٹس دراب پٹیل کو بتایا کہ مسٹر بھٹو کو ''بے قصور'' قرار دیا جانا پنجاب کے چار ججوں کی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتا، اس بنا پر کہ وہ چاروں اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ارتکاب قتل میں شامل فیڈرل سکیورٹی فورس کے اہلکاروں کی ہائیکورٹ میں گواہی نے ان کا جرم ثابت کر دیا ہے اور احمد رضا قصوری کے خلاف ان اہلکاروں کے پاس کوئی ذاتی محرک نہیں تھا۔ بلاشبہ انہوں نے صرف اور صرف مسٹر بھٹو کی خواہش کے مطابق کارروائی کی۔ لہٰذا میں نے زور دے کر کہا کہ کسی جج کے فیصلے میں رد و بدل یا اس میں ترمیم کرنے کی کوشش نہیں کی جا رہی۔ لیکن دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں 80 منٹ کی طویل گفتگو کے باوجود، بدقسمتی سے ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کو اپنے خیالات کے منصفانہ ہونے کا قائل نہ کر سکا۔ میں بہت ناامید ہو کر گھر واپس لوٹا۔

اگلے روز جب یحییٰ بختیار کی طرف سے مسٹر بھٹو کے حق میں دلائل کا سلسلہ جاری تھا، میں نے ان سے کہا کہ وہ سزا اور اس میں تخفیف کے بارے میں عدالت سے خطاب کریں۔ انہوں نے میری مداخلت کو بالکل نظر انداز کر دیا بلکہ درشت لہجے میں کہا: مجھے اس کے سوا کسی بات سے غرض نہیں کہ میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ مسٹر بھٹو بے گناہ ہیں اور بری کئے جانے کے مستحق ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ چیف جسٹس اور میں نے مسٹر بھٹو کی زندگی بچانے کیلئے دو مرتبہ ہاتھ بڑھایا لیکن بنچ میں ان کے حامیوں، خصوصاً جسٹس دراب پٹیل اور ان کے وکلاء کے پینل نے اسے جھٹک دیا۔ بھٹو خاندان اور اس کے حامیوں نے چار پنجابی ججوں کو اس المناک ڈرامے میں ولن قرار دیا، جبکہ حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے۔ اس ''یونانی المیے'' کے اصل ذمہ دار مسٹر بھٹو کے وہ دوست اور ہمدرد ہیں جو ہٹ دھرمی سے ایک غیر دانشمندانہ اور غلط لائحہ عمل پر اڑے رہے۔

اکثریت کا فیصلہ، جس کے ذریعے مسٹر بھٹو کو سزا سنائی گئی اور ان کی اپیل مسترد کر دی گئی، تقریباً 750 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بڑے گہرے غور و فکر سے کیا گیا فیصلہ ہے جس میں قانون شہادت اور قابل اطلاق قوانین کی تفصیلات بیان کرنے میں بڑی مہارت سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں فیڈرل سکیورٹی فورس کے ارکان کے اقبال جرم سے متعلق بیانات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، جن کا انہوں نے کھلی عدالت میں بھی اعادہ کیا۔ اگرچہ اکثریتی فیصلہ چیف جسٹس انوار الحق کے نام سے لکھا گیا لیکن فی الحقیقت یہ ان چاروں ججوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ تھا، جن کے نزدیک مسٹر بھٹو قصوروار تھے۔ چیف جسٹس نے مقدمے کے مختلف موضوعات اپنے رفقائے کار کے سپرد کر دیئے تھے، جنہوں نے اپنے اپنے حصہ کے بارے میں فیصلہ تحریر کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ لہٰذا اکثریتی فیصلہ ایک مشترکہ کوشش کا

نتیجہ تھا، جس کے تمام اجزاء کو مناسب چھان پھٹک کے بعد چیف جسٹس نے ایک مربوط کل کی صورت میں سمو دیا۔ اقلیتی فیصلہ درحقیقت تین فیصلوں پر مشتمل تھا۔ اختلافی فیصلہ جسٹس دراب پٹیل نے لکھا جس کی مزید تائید جسٹس حلیم اور جسٹس جی صفدر شاہ کے فیصلوں سے کی گئی۔ اس میں وعدہ معاف گواہوں کی گواہی پر انحصار نہیں کیا گیا تھا۔ اگرچہ بعض دوسرے مواد کو اکثریت نے ''ایف ایس ایف'' کے ملزموں کا جرم ثابت کرنے کیلئے قابل قبول قرار دیا۔ عدالت نے تین کے مقابلے میں چار کی اکثریت سے یہ فیصلہ صادر کیا۔

اس یونانی المیے کے اصل ذمہ دار مسٹر بھٹو کے وہ دوست اور ہمدرد ہیں جو ہٹ دھرمی سے ایک غیر دانشمندانہ لائحہ عمل پر اڑے رہے

مسٹر بھٹو نے اس فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست دائر کی، جس میں ان کے قانونی مشیر نے یہ موقف پیش کیا کہ درخواست دہندہ کو مجرم ٹھہرائے جانے کے باوجود اس مقدمے میں اسے دفعہ 302 پی پی سی کے تحت (جسے دفعہ 109 اور دفعہ 111 کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے) آنے والے جرم کی پاداش میں کم تر سزا دی جا سکتی ہے اور اس کے اسباب یہ ہیں کہ درخواست دہندہ صرف اعانت مجرمانہ کا مرتکب ہے اور وہ قتل کے وقت جائے واردات پر موجود نہیں تھا۔ دوم سازش کا مقصد احمد رضا قصوری کو ہلاک کرنا تھا اور اس کے والد کو نہیں، جو اچانک زد میں آ گیا۔ سوم درخواست دہندہ کے جرم کے بارے میں اس عدالت کے فاضل ججوں میں اختلاف رائے پیدا ہو چکا ہے۔ چہارم یہ کہ ملک میں 12 ربیع الاول 1399 ہجری (10 فروری 1979ء) سے اسلامی قوانین کے متعارف کرائے جانے کے بعد غیر ارادی قتل پر سزائے موت دینا اسلامی قانون کے منافی ہو گا۔ خصوصاً اس صورت میں کہ شرعی قوانین وعدہ معاف گواہ کی گواہی کو تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور ان کی رو سے جب تک گواہ اپنی دیانت و امانت اور کردار کے بارے میں مقررہ کڑی شرائط پر پورا نہیں اترتے، ان کی گواہی پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ پنجم یہ حقیقت کہ درخواست دہندہ کو مقدمے کی کارروائی کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور کیا گیا اور ان کا یہ عمل سزا پر بھی اثر انداز ہوا۔

عدالت کا موقف یہ تھا کہ اپیل کی سماعت کے دوران مسٹر بھٹو کے فاضل وکیل نے ان میں سے کوئی سوا نہیں اُٹھایا، حالانکہ بنچ کے ارکان میں درخواست دہندہ کے مجرم ہونے کے بارے میں اختلاف رائے کے سوال یہ سب عوامل اس وقت بھی ریکارڈ کا حصہ تھے۔

ہائیکورٹ میں فاضل جج صاحبان نے سزا کے مسئلے پر بحث کیلئے متعدد پیرے وقف کیے تھے اور اپیل کی سماعت کے دوران بھی اسے موضوع بحث بنایا گیا۔ مسٹر یحییٰ بختیار نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہائیکورٹ کے فیصلے کے پیرا 610 سے پیرا 661 تک میں درخواست دہندہ کے ذاتی اعتقادات کے بارے میں عدالت کے تبصرے اور ایک مسلمان حکمران کیلئے اسلام کے مقرر طرز عمل کے معیارات سے متعلق وعظ سے نہ صرف درخواست دہندہ کے خلاف عدالت کے

تعصب کی نشاندہی ہوتی ہے، بلکہ اس کا ہائی کورٹ میں مقدمے کی تکمیل سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ درخواست دہندہ کا یہ دعویٰ تو مسترد کر دیا گیا کہ ہائی کورٹ کا یہ تبصرہ تعصب کا ثبوت ہے، تاہم متنازعہ پیراگراف جن میں جرم کے حالات اور مسٹر بھٹو کی ذمہ داری کے بارے میں بحث کی گئی تھی، ہائی کورٹ کے فیصلے میں خارج کر دیئے گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اپیل کی سماعت کے دوران سزا کا مسئلہ عدالت میں پوری طرح سامنے آچکا تھا۔ اس صورت حال میں درخواست دہندہ کے فاضل وکیل کا فرض تھا کہ وہ مناسب وقت پر ان تمام نکات پر زور دیتے۔ اس سلسلے میں ان کی یہ وضاحت قابل قبول نہیں کہ اس وقت انہیں ہائی کورٹ کی طرف سے سنائی گئی سزا میں تخفیف سے زیادہ درخواست دہندہ کو بری کرانے کی فکر لاحق تھی، اس لئے کہ فوجداری مقدمات میں سزا کا سوال اثبات جرم سے کم اہم نہیں ہوتا اور اگر سزا کے نقطے پر زور نہ دیا جائے تو یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ملزم کے وکلاء کے پاس اس سلسلے میں کہنے کو کچھ نہیں اور سزا برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

حتمی طور پر اس قانونی پوزیشن سے کوئی مفر نہیں کہ قانون میں بیان کردہ انتہائی سزا دینے یا نہ دینے کا فیصلہ زیر بحث مقدمے کے مخصوص حالات کی روشنی ہی میں سنایا جا سکتا ہے اور کم تر سزا صرف اسی صورت میں دی جا سکتی ہے کہ حالات ملزم کے نقطہ نظر سے کم سنگین ہوں۔ اس نقطے پر اکثریتی فیصلے میں بڑے غور و فکر کے بعد مذکورہ بالا نتائج اخذ کئے گئے۔

جہاں تک 10 فروری 1979ء سے پاکستان میں نافذ ہونے والے بعض شرعی قوانین کے حوالے سے مسٹر یحییٰ بختیار کے دلائل کا تعلق ہے یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ درخواست دہندہ کا مقدمہ 10 فروری 1979ء سے قبل عام ملکی قانون کے تحت چلایا گیا تھا اور اپیل بھی اسی عام قانون یعنی ضابطہ تعزیرات پاکستان اور 1973ء کے دستور کے متعلقہ احکام کے تحت دائر کی گئی تھی۔ جس فیصلے پر نظر ثانی کی جا رہی تھی، وہ بھی 10 فروری 1979ء سے قبل سنایا جا چکا تھا۔ 10 فروری 1979ء کو نافذ کردہ شرعی قوانین میں قتل کا جرم شامل نہیں تھا۔ علاوہ ازیں آئینی ترمیمی حکم 1979ء (صدر کا حکم نمبر 3 مجریہ 1979ء) کے آرٹیکل 203 ڈی میں واضح طور پر یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ زیر سماعت مقدمات کی کارروائی حسب سابق جاری رہے گی اور زیر بحث نکات کا فیصلہ وقتی طور پر نافذ العمل قانون کے مطابق ہی ہو گا۔ ان حالات میں عدالت کیلئے اس مقدمے میں دی گئی سزا کے سوال پر شرعی قانون کے بعض احکام کے حوالے سے نظر ثانی کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے کہ ہائیکورٹ میں مقدمے کی سماعت کے کسی مرحلے پر یا اس عدالت میں اپیل کی سماعت کے دوران کبھی ان احکامات کو لاگو کیا گیا نہ آئندہ ہونے والی کارروائیوں کیلئے قابل اطلاق بنایا گیا۔ چنانچہ بنچ میں شامل ساتوں ججوں نے اتفاق رائے سے یہ موقف مسترد کر دیا۔

جسٹس دراب پٹیل نے مسٹر بھٹو کو سنائی گئی سزائے موت سے بحث کرتے ہوئے مسٹر یحییٰ بختیار کے دلائل کا حوالہ دیا جن کے مطابق ان کا موقف یہ تھا کہ سزائے موت ہمیشہ صرف ایسے شخص کو سنائی جاتی رہی ہے جو عملاً کسی شخص کے قتل کے جرم میں شریک رہا ہو، جبکہ کم تر سزا ایسے فرد یا افراد کو دی جاتی رہی ہے جو ترغیب جرم یا اعانت مجرمانہ کے مرتکب ہوئے ہوں۔ جسٹس دراب پٹیل نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ایسے فیصلے موجود ہیں جن میں اپیل کی سماعت کرنے والی عدالت میں اختلاف رائے کی بنا پر قتل کی کم تر سزا سنائی گئی، تاہم ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ تمام سوالات مسٹر یحییٰ بختیار کی طرف سے اس وقت اُٹھائے جانا چاہئیں تھے۔ جب مسٹر بھٹو کی سزا کے خلاف اصل اپیل کی سماعت کی جا رہی تھی، لیکن بدقسمتی سے اصل اپیل کی سماعت کے دوران اس بنیاد پر کبھی استدلال نہیں کیا گیا۔ جسٹس دراب پٹیل نے کہا ”فاضل وکیل نے اصل زور اس حقیقت پر دیا کہ جیسا کہ استغاثہ کے مطابق بھی وہ مسٹر بھٹو نہیں تھے، جنہوں نے مسٹر قصوری کی کار پر مہلک فائرنگ کی اور اس جرم کا نشانہ بننے والا شخص بھی وہ نہیں تھا جسے مسٹر بھٹو نے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن طے شدہ قانون کی رو سے سزا میں تخفیف کیلئے استدلال کا تعلق حالات و کوائف کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا فاضل کونسل کو چاہئے تھا کہ وہ مسٹر بھٹو کی اثبات جرم کے خلاف اپیل کی سماعت کے دوران اپنے دلائل میں ان کا حوالہ دیتے اور یہ اس لئے اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ سزا کا مسئلہ عدالت کی صوابدید پر منحصر ہے۔ سپریم کورٹ یا ہائی کورٹوں میں میں سنائے جانے والا کوئی ایسا مقدمہ بھی میرے علم میں نہیں، جس میں درخواست دہندہ کے وکیل نے قتل کی سزا کو چیلنج کرتے ہوئے سزا کے مسئلے پر متبادل صورتوں کے حق میں دلائل پیش نہ کئے ہوں۔ انہوں نے اپنی بات ان الفاظ پر ختم کی ”لہٰذا میں فاضل چیف جسٹس کے اس موقف سے متفق ہوں کہ نظر ثانی کی درخواست میں سزا کا سوال نہیں اُٹھایا جا سکتا اور اگر ہم اس نظر ثانی میں سزا کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ طے شدہ قانون میں تبدیلی لانے کے مترادف ہو گا، اگرچہ سزا پر نظر ثانی کے سلسلے میں قانون ہماری راہ میں حائل ہے، تاہم سزا میں تخفیف کیلئے مسٹر یحییٰ بختیار کی طرف سے پیش کیے جانے والے دلائل، رحم کی بنیاد پر سزا میں تخفیف کا خصوصی استحقاق رکھنے والے حکام کے لیے قابل غور ہونا چاہئیں۔“

چیف جسٹس انوار الحق نے عدالتی فیصلے میں سے یہ خصوصی مشورہ دیا کہ انتظامیہ کو چاہئے کہ وہ مسٹر بھٹو کے معاملے میں رحم سے کام لے اور ان کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دے۔ میں نے اس حکم کی مکمل تائید کی۔

مزاجاً بدگمان عناصر کے واویلے سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ بنچ میں شامل تمام ارکان مسٹر بھٹو کے بارے میں بہت اچھے جذبات رکھتے تھے۔ تمام ججوں کا طرز عمل نہایت شریفانہ تھا۔ سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کے خلاف استغاثے کی طرف سے پیش ہونے والے وکلاء اور حکام نے بے مثال تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا۔ شاید اس سے قبل کسی ملزم کو ایسے موافق و مہربان جج بھی میسر نہ ہوئے ہوں گے جیسے مسٹر بھٹو کو دستیاب ہوئے اور اگر ان میں سے ایک جج دوران سماعت ریٹائر اور دوسرے صاحب فراش نہ ہو جاتے تو پینل اکثریت کے ساتھ ان کے حق میں ہوتا۔ اگر اکثریت نے مسٹر بھٹو کو مجرم قرار دیا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ عدل اور عقل سلیم کا حلیہ بگاڑے بغیر انہیں بری نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسٹر بھٹو کو 4 اپریل 1979ء کو

پھانسی دی گئی۔ ان کی موت سے میرا دل آج بھی بوجھل ہے۔

مقدمے کی سماعت کے دوران "دی اکانومسٹ لندن" نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ یہ مقدمہ کرامویل کے دور میں "چارلس اول" کے مقدمے سے مشابہہ ہے۔ میں نے اس پر از راہ مذاق تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہمیں معلوم ہے کہ کرامویل کا اس کی برطرفی کے بعد کیا انجام ہوا، لیکن "میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ججوں کا کیا ہوا"

جہاں تک ہمارا تعلق ہے جب بینظیر بھٹو اقتدار میں آئیں تو انہوں نے بڑے پختہ عزم کے ساتھ کہا کہ وہ مجھے یعنی مسٹر بھٹو کو مجرم قرار دینے والے بنچ میں سے زندہ رہنے والے واحد جج کو تہس نہس کر دیں گی۔ میں نے ان کے اس طرز عمل کو عدالتی بے نیازی کے ساتھ برداشت کیا جو ججوں کی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کا تقاضا ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ از سر نو مقدمہ چلوائیں گی اور ججوں کا ایسا پینل مقرر کریں گی جو مسٹر بھٹو سے ہمدردی رکھتا ہو۔ وہ دو مرتبہ بطور وزیر اعظم بر سر اقتدار آئیں، اٹارنی جنرل ان کا پسندیدہ شخص تھا اور پہلی بار مسٹر یحییٰ بختیار تھے جو مسٹر بھٹو کے سب سے بڑے وکیل صفائی تھے لیکن انہوں نے از سر نو مقدمہ چلانے کی ہرگز کوشش نہ کی۔

مسٹر جسٹس حلیم کو جنہوں نے اختلافی فیصلہ لکھا، جنرل ضیاء الحق نے چیف جسٹس مقرر کیا تھا اور بطور چیف جسٹس وہ اس عہدے پر اپنے کسی بھی پیشرو سے زیادہ مدت تک برقرار رہے۔

……☆☆☆……

بقیہ بے نظیر کی آصف زرداری سے شادی کا فیصلہ

سے بہت کم ہیں۔ خالدہ ضیاء بدقسمتی سے بیوہ ہو چکی ہیں جبکہ حسینہ واجد بچوں کی ماں بننے کے بعد سیاست میں سرگرم ہوئی ہیں۔ بے نظیر نے سیاست کی خاردار وادی میں ایسے وقت قدم رکھا جب وہ کنواری تھیں۔ اُنہوں نے شادی کیلئے اُس وقت تک انتظار کیا جب حالات اُنہیں اِس کی اجازت دیں۔ شوہر بھی ایسا منتخب کیا جو مددگار اور محافظ ہو، اور اُنکی سیاست میں حائل نہ ہو۔ دو سال کے دوران وہ ایسا انداز اختیار کرنے میں کامیاب رہی ہیں جو اُنہیں ایک قدامت پسند مسلمان معاشرے میں قابل قبول بنا سکے۔

مذکورہ حقائق کے پیش نظر کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ "آصف علی زرداری" باشعور، صاحب ثروت، ہمدرد اور بااعتماد شخصیت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا خوف

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے رو دیا، وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں لوٹ جائے (مطلب یہ ہے کہ جس طرح دودھ تھنوں میں واپس نہیں جا سکتا اِسی طرح اللہ کے خوف سے رونے والا دوزخ میں نہیں جائے گا) اور کسی شخص پر اللہ کی راہ کا غبار اور دوزخ کا دھواں جمع نہیں ہو سکتا۔

مرسلہ: انجم فاروق، لاہور

"میری گڑیا مجھ کو لوٹا دے"

وہ بات بہت وہ سنتی تھی
جو بول کہے مدہوشی میں
وہ بول بہت وہ سنتی تھی
میں اپنے نسب سے باغی تھا
وہ سرکش تھی اپنے گھر سے
سب رشتے ناطے توڑ کے وہ
وابستہ ہوئی میرے گھر سے
وہ ربط وہ لمحے وہ گڑیاں
وہ سب کے سب تھے سیل رواں
وہ رت رنگیلی وہ خوش موسم
سب کے سب تھے میلے جواں
وہ وقت کے چلتے دھارے پر
اپنوں کے ساتھ انمول رہے
ہر سمت رہی پھولوں کی بہار
گلشن کے عجب ماحول رہے
وہ ملنے کے تھے ایسے سماں
ہم ہجر و جفا سب بھول گئے
وہ دور وفا کچھ ایسا تھا
ہم قہر و سزا سب بھول گئے
آنکھوں میں تھے ایسے بیٹھے سحر
چلمن کی ادائیں ایسی تھیں
کچھ یاد نہ تھے صحرا کے سفر
بارش کی گھٹائیں ایسی تھیں
ہر دن تھا عجب رنگینی کا
ہر رات تھی رنگ رنگیلی سی
بس عہد تھے اور پیمان وفا
ہر سو تھی سج سجیلی سی
اک روز عجب سی دھول اٹھی
اشجار سے پتے جھڑنے گ
سورج کی شعاعیں تپنے لگیں
اور ریت سے صحرا جلنے گ
وہ باد صبا اب گلشن میں
کچھ خار اور ٹہنی چھوڑ گئی
سب خاک ہوئی پھولوں کی مہک
بس یادیں اپنی چھوڑ گئی
جو ساتھ تھے میرے سیل رواں
وہ ساتھی سارے چھوٹ گئے
وہ عہد وفا کے پیمانے
سب باری باری ٹوٹ گئے
نہ شرمندہ تعبیر ہوئیں
وہ ساتھ نبھانے کی قسمیں
اب ہجر ہوئیں ناسور ہوئیں
وہ عہد جوانی کی رسمیں
وہ جان جو جان جاناں تھی
اک تیز ہوا کے جھونکے میں
میری ساری دنیا لوٹ گئی
میری گڑیا مجھ سے روٹھ گئی
کوئی مفتی دیں کوئی۔ امامِ زماں
میری بابو رابعی اور فاطی
میری دنیا مجھ کو لوٹا دے
میری گڑیا مجھ کو لوٹا دے
سڑکوں پہ نشاں جو ڈھونڈتا ہوں
سب راستے مجھ کو دکھلا دے
اے رب جہاں اے مو لائے دیں
میری گڑیا مجھ کو لوٹا دے

شاعر: س ص عباس

الیکشن میں نواز شریف کی کامیابی اولیائے کرام کا فیضان ہے

انہیں اولیائے کرام سے خصوصی لگاؤ ہے ملک واپس آتے ہی انہوں نے داتا صاحب کے مزار پر حاضری دی

وہ حضرت محمد برکت علی لدھیانویؒ سے بھی بہت عقیدت رکھتے ہیں
1990ء میں وہ ان کی ہی دعاؤں سے پہلی بار وزیراعظم بنے

حضرت محمد برکت علی لدھیانویؒ میاں نواز شریف کے سر پر دست شفقت پھیر رہے ہیں اور دوسری تصویر میں ان کیلئے دعا کر رہے ہیں

نواز شریف کی شاندار کامیابی اولیائے کرام کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ میاں صاحب کو اولیائے کرام سے خصوصی لگاؤ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ طویل جلاوطنی کے بعد جب ملک واپس آئے تو انہوں نے روضہ رسول سے سیدھے داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار پر حاضری دی اور عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ ہم یہ بات بھی بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ میاں نواز شریف فیصل آباد کی ایک بہت بڑی روحانی شخصیت حضرت محمد برکت علی لدھیانویؒ کے بھی بہت بڑے عقیدت مند ہیں۔ نواز شریف جب وزیراعلیٰ پنجاب تھے اس وقت سے ان کا وہاں آنا جانا شروع ہوا، اور جب یہ پہلی بار وزیراعظم بنے تو انہوں نے ہر پندرہ دن بعد کیمپ دارالاحسان جانا شروع کر دیا یہ کیمپ سمندری روڈ پر فیصل آباد سے تقریباً سات، آٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ 1990ء میں الیکشن کے دوران میاں نواز شریف حضرت صوفی محمد برکت علی لدھیانویؒ کے پاس گئے اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ حضرت برکت علی لدھیانویؒ نے ایک روحانی شخصیت خان عبدالصمد خان جن کا تعلق رحیم یار خان سے تھا اور وہ چالیس سال سے ان کے پاس تھے۔ باباجی نے ان سے دعا کیلئے کہا پہلے تو وہ دعا کیلئے تیار نہ ہوئے لیکن پھر باباجی سرکار کے کہنے پر خان عبدالصمد خان نے باباجی کے ساتھ مل کر نواز شریف کیلئے دعا کی۔ اس دعا کے بعد باباجی نے نواز شریف سے کہا تھا کہ میاں صاحب آپ کو سرداری مبارک' نواز شریف کو اس الیکشن میں دوتہائی اکثریت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ وزیراعظم بن گئے تھے۔ دوسری مرتبہ پھر وہ باباجی کی دعاؤں سے وزیراعظم بن گئے۔ جنوری 1997 میں باباجی وصال پا گئے لیکن ان کا فیض آج بھی اسی طرح جاری و ساری ہے۔ میاں تواز شریف کا جلاوطنی کے بعد دوبارہ پاکستان آنا اور ان کی پارٹی کا کامیابی سے ہمکنار ہونا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب باباجی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ہمارا میاں نواز شریف کو مشورہ ہے کہ

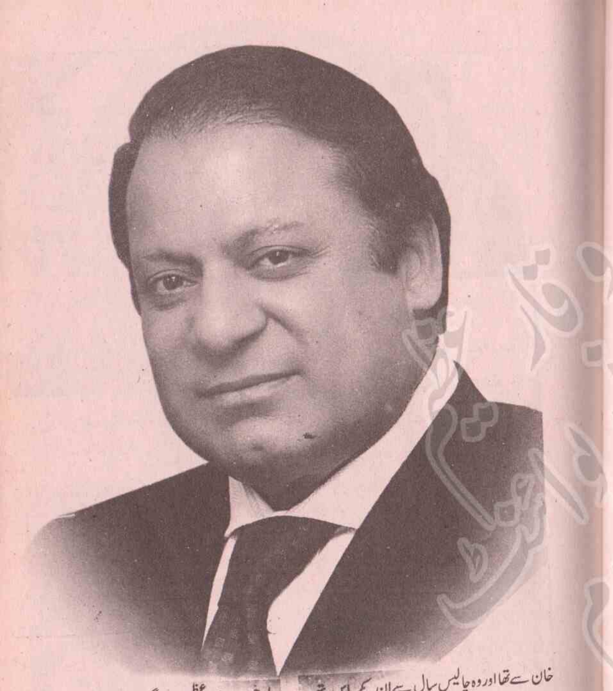

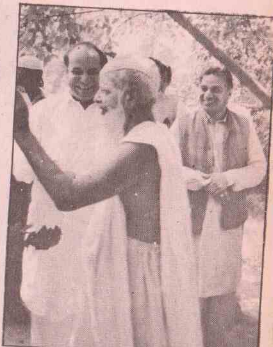

میاں نواز شریف باباجی سرکارؒ سے گلے مل رہے ہیں
اُن کے ساتھ حاجی محمد اکرم بھی کھڑے ہیں

وہ باباجی سرکار کے مزار پر بھی ضرور حاضری دیں جب سے وہ جلاوطنی کے بعد واپس پاکستان آئے ہیں وہ وہاں نہیں جاسکے ہیں ان کو تھوڑا وقت نکال کر باباجی کے مزار پر ضرور جانا چاہیئے۔ ہم قارئین کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ نواز شریف کے وزارت عظمیٰ کے دوران ہم نے حضرت صوفی برکت علی لدھیانوی کی شخصیت ان کی کرامات اور دینی خدمات کے حوالے سے مون ڈائجسٹ کے جو خصوصی شمارے شائع کیے تھے اس پر میاں نواز شریف نے مون ڈائجسٹ کے چیف ایڈیٹر ادیب جاودانی کو ایک تعریفی خط بھی لکھا تھا۔ ادیب جاودانی نے میاں نواز شریف کے اس لیٹر کو مون ڈائجسٹ کی ایک اشاعت میں شائع بھی کیا تھا۔

* * *

عورت

عورت محبت کا پھول اور پیار کا ساگر ہے عورت ایسا پھول ہے جو مرد کے سائے میں خوشبو دیتا ہے۔ عورت جب پیار کرتی ہے تو اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے عورت محبت اور پیار کا مجسمہ ہے۔ عورت کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ عورت زندگی میں ایک بار پیار کرتی ہے۔ عورت کی عزت ملک اور قوم کی عزت ہے۔ زندگی کے دشوار راستے عورت کے تعاون کے بغیر طے نہیں ہوتے۔ سچی محبت کرنے والی عورت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردینا چاہیئے۔ عورت ایک ماں ایک بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کی عزت کریں، مثل مشہور ہے کہ ماں کے بغیر گھر قبرستان ہے۔ تو اس پیارے گھر کو قبرستان نہ بنائیں اور ماں باپ کی عزت کریں اسی میں ہماری بہتری ہے۔ اور دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

شہناز نسیم......لاہور

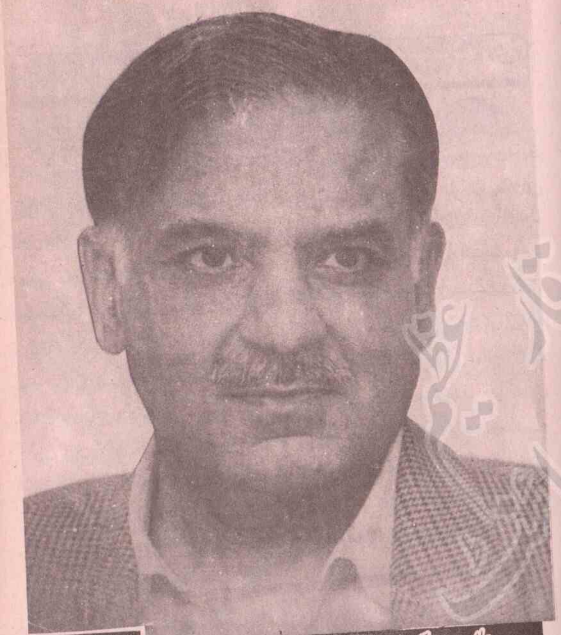

وزیراعلیٰ پنجاب کیلئے

میاں شہباز شریف

سے بہتر اور کوئی امیدوار نہیں ہوسکتا

چوہدری پرویز الٰہی کی میاں شہباز شریف کے خلاف اشتہاری مہم کا فائدہ انہیں ہی پہنچا

پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ میاں شہباز شریف زبردست ایڈمنسٹریٹر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ حالیہ

میاں شہباز شریف کا وزیراعلیٰ پنجاب بننا خوش آئند ہے مگر کیا وہ عوام کی توقعات پر پورا اتر سکیں گے؟

عوام کے دیرینہ مسائل حل کر کے ہی (ن) لیگ اور پیپلز پارٹی عوام کی توقعات پوری کر سکتی ہیں

انتخابات میں مسلم لیگ (ن) کی پنجاب میں شاندار کامیابی اور پھر پیپلز پارٹی سے مفاہمت کے بعد اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ میاں شہباز شریف ایک مرتبہ پھر پنجاب کے وزیراعلیٰ بن جائیں گے وہ جب پہلی بار پنجاب کے وزیراعلیٰ بنے تو انہوں نے پنجاب میں ریکارڈ ترقیاتی کام کروائے۔ ان کے دور حکومت میں بلاشبہ عوام کے کئی مسائل حل ہوئے اور اس کے علاوہ ان کے دور میں امن و امان کی صورت حال بھی بہت بہتر رہی۔ جرائم کی شرح کم رہی اور پنجاب میں خوشحالی کا دور رہا۔ میاں شہباز شریف نے بیوروکریسی کا قبلہ درست کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور واقعی وہ کسی حد تک بیوروکریسی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے سب سے پہلے تمام بیوروکریٹس سے بڑی گاڑی واپس لیکر انہیں چھوٹی گاڑیاں دیں اور خود بھی چھوٹی گاڑی استعمال کی۔ سرکاری گاڑیوں کو نیلام کر کے پنجاب کے ریونیو میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور اس رقم کو پنجاب میں ترقیاتی کاموں پر صرف کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ پنجاب میں مختلف سطح کے امتحانات سے نقل ختم کرنا ہے۔ یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے انہوں نے ثابت کیا کہ اگر کوئی چاہے تو ناممکن کام بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کی حکومت نہایت اچھے انداز سے چل رہی تھی کہ۔ جنرل مشرف مرکز میں میاں نواز شریف اور پنجاب میں میاں شہباز شریف کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور شریف فیملی کو ملک بدر کر دیا گیا۔ ان کی غیر موجودگی میں سابقہ حکومت نے میاں شہباز شریف کے خلاف سبزہ زار پولیس تھانہ میں ایک خود ساختہ مقدمہ قائم کر دیا کہ ان کے ایماء پر پولیس نے ایک نوجوان کو پولیس مقابلہ میں ہلاک کر دیا تھا۔ اس مقدمے کو بڑے پیمانے پر اچھالا گیا اور میاں صاحب کو سزا دلانے کی کوشش کی گئی۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں عدالت عالیہ نے ان کو طلب کیا حالانکہ ان کو صدر مشرف کی طرف سے ملک میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اپنے دفاع کیلئے وہ نہایت جرات اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین سال قبل وطن واپس لوٹ آئے۔ ان کے آنے سے ملک بھر میں مسلم لیگ (ن) متحرک ہوگئی۔ حکومت اس صورت حال سے بوکھلا گئی اور اس نے میاں شہباز شریف کو ایئر پورٹ سے ہی واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان کی عوامی مقبولیت سے خائف تھی۔ پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی نے اس مقدمہ کو حالیہ انتخابی مہم میں خوب اچھالا اور کوشش کی کہ اس طرح میاں شہباز شریف کی کردار کشی کی جائے۔ انہوں نے واقعہ کو ایک زبردست ایشو بنایا اور انتخابی مہم کے دوران مقتول نوجوان کے باپ کی طرف سے اخبارات میں لاکھوں روپے کی اپیلیں بھی شائع کروائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لاکھوں روپے کوئی غریب شخص ادا نہیں کر سکتا۔ یہ ادائیگی چوہدری پرویز الٰہی اپنے ذرائع سے کرتے رہے۔ اس کے علاوہ بھی چوہدری برادران نے شریف برادران کے خلاف کروڑوں روپے صرف کر کے اشتہاری مہم چلائی تاکہ لوگوں کو ان سے متنفر کیا جا سکے مگر ق لیگ کے رہنماؤں کی اس اشتہاری مہم سے مسلم لیگ (ن) اور شریف برادران کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ انتخابی نتائج نے یہ ثابت کیا ہے کہ سابق حکومت کی میڈیا کمپین جو مسلم لیگ (ن) کے خلاف تھی اس کا فائدہ ق لیگ کی بجائے ن لیگ کو ہی پہنچا۔ عوام نے ان کے کسی بھی اشتہار پر کان نہیں دھرا اور اپنا ووٹ شریف برادران کی جھولی میں ڈال دیا اور اس طرح مسلم لیگ (ن) ایک بڑی اکثریتی اور مقبول پارٹی کی صورت میں سامنے آئی ہے اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کا آپس میں معاہدہ ہوگیا ہے کہ مرکز میں پیپلز پارٹی حکومت بنائے گی اور اس کا وزیراعظم ہوگا جبکہ پنجاب میں (ن) لیگ کا وزیراعلیٰ ہوگا اور اس کیلئے یقیناً میاں شہباز شریف سے بہتر اور کوئی امیدوار نہیں ہوسکتا۔

پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کی کامیابی سے قوی امکانات ہیں کہ پنجاب کے آئندہ وزیراعلیٰ میاں شہباز شریف ہی ہوں گے

انہوں نے اپنے دور میں بیوروکریسی کا قبلہ درست کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی

پنجاب میں مختلف سطح کے امتحانات سے نقل کا مکمل خاتمہ ان کا شاندار کارنامہ ہے

مسلم لیگ (ن) کو پنجاب میں پہلے ہی زبردست کامیابی اور اکثریت حاصل ہے آزاد امیدواروں کے ان کے ساتھ ملنے سے ان کی اکثریت اور حاقت میں اور زیادہ اضافہ ہو چکا ہے اور چند دن تک مزید ارکان اور خاص طور پر مسلم لیگ (ق) کے ارکان صوبائی اسمبلی مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو جائیں گے۔ اس کے واضح امکانات نظر آ رہے ہیں اس طرح مسلم لیگ (ن) کی پوزیشن پنجاب میں اور زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔

میاں شہباز شریف کا پنجاب کا دوبارہ وزیراعلیٰ بننا خوش آئند بات ہے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) چاروں صوبوں میں عوام کو درپیش مسائل کو کیسے حل کرتی ہیں نئی آنے والی حکومتوں کو مہنگائی، بے روزگاری، بدامنی اور دہشت گردی کو روکنے کیلئے موثر اقدامات کرنا ہوں گے۔ ایسا کرنے سے ہی پیپلز پارٹی اور (ن) لیگ عوام کی توقعات پر پورا اترے گی اور اگر اب بھی عوام کے مسائل حل نہ ہوئے تو عوام کا اعتماد سیاستدانوں اور سیاسی عمل سے اٹھ جائے گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوسکتے ہیں۔

○

سول حکومت ہو یا مارشل لاء

پولیس پر سیاسی دباؤ ہمیشہ رہتا ہے

میں نے اپنے افسروں اور ڈی پی اوز کو ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ میرٹ پر کام کریں

جرائم میں اضافہ کی بنیادی وجہ غربت، بے روزگاری اور آبادی میں اضافہ ہے

پولیس کی کارکردگی بہتر ہو تو معاشرے میں جرائم کم ہو سکتے ہیں

گوجرانوالہ ریجن II کے آر پی او تحسین انور علی سے ادیب جاودانی کا انٹرویو

سوال: گوجرانوالہ ریجن کے 5 اضلاع میں امن و امان کی کیا صورت حال ہے؟

جواب: ہمارے ریجن میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہے۔ گذشتہ سال کے مقابلے میں مختلف جرائم کے 3540 کیسز کم رجسٹرڈ ہوئے ہیں اور جو کیسز رجسٹرڈ ہوئے ہیں ان میں سے 89 فیصد کے چالان مکمل ہو چکے ہیں۔ ہم نے 49 ہزار 899 ملزم گرفتار کیے جبکہ 7 ہزار مفرور ہیں۔ مزید اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ Crime against person کم ہوئے ہیں۔ ان میں قتل، غارت وغیرہ شامل ہیں۔ اس کیٹیگری میں پورے ریجن میں 1337 کیسز کم درج ہوئے 84 فیصد چالان ہو چکے ہیں۔ 14 ہزار 764 ملزم گرفتار ہوئے جبکہ 3 ہزار مفرور ہیں۔ Crime against property مثلاً ڈکیتی، چوری، راہزنی کے ضمن میں 1940 کیسز کم درج ہوئے، 62 فیصد چالان ہوئے، 7 ہزار 744 ملزم گرفتار کیے جبکہ 3400 مفرور ہیں۔

گذشتہ سال قتل کے 32 کیسز کم درج ہوئے، زیادتی اور اجتماعی زیادتی کے 42 کیسز کم ہوئے 87 فیصد چالان کیے، ڈکیتی کے 111 کیسز کم ہوئے، 66 فیصد چالان ہوئے۔ راہزنی کے 178 کیسز کم ہوئے 63 فیصد چالان ہوئے۔ اغواء برائے تاوان کی وارداتوں میں اضافہ ہوا اور اس سال 26 کیسز زیادہ ہوئے۔ ریجن میں ہم نے 42 مقابلے کیے جن میں 28 ملزم مارے گئے، 70 گرفتار ہوئے ان مقابلوں میں 3 پولیس افسر شہید اور 10 زخمی ہوئے۔ ہم نے 342 گینگ پکڑے اور 1300 ملزم گرفتار کیے اس عرصہ میں 9 کروڑ 39 لاکھ 59 ہزار روپے مالیت کے سامان کی ریکوری کی۔ 10 ہزار اشتہاریوں میں سے 8 ہزار گرفتار ہو چکے ہیں جبکہ 9931 عدالتی مفروروں میں سے 7 ہزار پکڑے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے بھاری مقدار میں غیر قانونی اسلحہ اور منشیات بھی برآمد کی ہے۔

سوال: بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد امن و امان کی صورت حال سے نمٹنے کیلئے آپ نے کیا کیا؟

جواب: مجموعی طور پر صورت حال قابو میں رہی تھی صرف اکا دکا واقعات ہوئے تھے سیالکوٹ میں ضلع ناظم کا دفتر جلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہم نے پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ سے رابطہ کیا اور ان سے گزارش کی کہ پبلک

بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد میرے ریجن میں صورت حال قابو میں رہی

ادیب جاودانی اور کاشف ادیب کا گوجرانوالہ ریجن کے آر پی او تحسین انور علی کے ہمراہ گروپ فوٹو

پراپرٹی کو جلانا اور توڑ پھوڑ کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہم سب آپ کے دکھ میں شریک ہیں۔ اس پر پارٹی لیڈر شپ نے ہمارے ساتھ بھر پور تعاون کیا۔ راولپنڈی میں لالہ موسیٰ کے توقیر کائرہ بھی شہید ہوئے تھے۔ ان کی نماز جنازہ میں 15 ہزار سے زائد افراد شریک تھے۔ اس وقت اگر وہ مشتعل ہو جاتے تو امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا تاہم پارٹی لیڈر شپ نے خود اپنے کارکنوں کو سمجھایا کہ وہ گھیراؤ جلاؤ ہرگز نہ کریں یوں مجموعی طور پر صورت حال کنٹرول میں رہی۔

ہمارے ریجن میں امن و امان کی صورت حال گذشتہ سال کے مقابلے میں بہت بہتر ہے

سوال: کیا آپ پر با اثر سیاسی شخصیات کا کوئی دباؤ تو نہیں ہوتا؟

جواب: پولیس پر سیاسی دباؤ ہر زمانے میں ہوتا ہے چاہے سول حکومت ہو یا مارشل لاء، ہم ہر دور میں پریشرز کا سامنا کرتے ہیں۔ میں نے اپنے افسروں اور ڈی پی اوز کو ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ میرٹ پر کام کریں اگر کام میرٹ پر ہو تو ویسا دباؤ نہیں رہتا۔

سوال: سابق حکومت کے دور میں پولیس کی مراعات میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے کیا اس کی کارکردگی بھی اسی حساب سے بڑھی ہے اور جرائم میں کمی واقع ہوئی ہے؟

جواب: پولیس کی مراعات بڑھنے کا جرائم میں کمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اپنی کارکردگی Detection of crime سے چیک کرتے ہیں۔ نیویارک میں ایک سال کے دوران جتنے قتل ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے ریجن میں ہوئے ہیں۔ جرائم کی بنیادی وجوہات میں غربت، بے روزگاری، آبادی کا بڑھنا اور دیگر شامل ہیں۔ پولیس کی نااہلی بھی جرائم میں کسی قدر اضافے کا باعث بنتی ہے۔ پولیس کی کارکردگی بہتر ہو تو بعض جرائم کم ہو سکتے ہیں۔ البتہ غربت و بے روزگاری کا خاتمہ پولیس نہیں کر سکتی۔ جہاں تک مراعات کا تعلق ہے تو یہ بھی اس لیول پر نہیں آئیں جو ہونی چاہئیں۔ عام طور پر ہائی وے موٹر وے پولیس کی مثال دی جاتی ہے لیکن وہاں 8 گھنٹے ڈیوٹی ہوتی ہے ہم ابھی تک اپنے تھانوں میں 8 گھنٹے ڈیوٹی اور ہفتہ وار چھٹی کا نفاذ نہیں کر سکے اگر ایسا ہو جائے تو یقیناً بہتر نتائج نکلیں گے۔

ادیب جاودانی گوجرانوالہ ریجن کے آر پی او تحسین انور علی سے انٹرویو کررہے ہیں

سوال: اعلیٰ عدالتیں اکثر پولیس کے خلاف سخت ریمارکس دیتی رہتی ہیں بعض اوقات مجرموں کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی مجرم بنا دیا جاتا ہے اس سے عوام میں منفی پیغام جاتا ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اعلیٰ عدالتیں جو آبزرویشن دیتی ہیں وہ کسی خاص کیس کے حوالے سے بالکل درست ہوتی ہیں کیونکہ ہم میں کمی یا کوتاہی ہوتی ہے تو سائل ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ جو ریلیف تھانے سے ملنا چاہیئے تھا وہ عدالتوں سے جا کر ملا۔ عدالتیں اس حوالے سے جو ریمارکس دیتی ہیں مناسب سمجھ کر دیتی ہیں میں نے اس چیز کو کبھی نیگیٹو نہیں

لیا۔ میں نے تمام تھانوں کو چٹھی لکھ کر کہا ہے کہ جن کیسز کے بارے میں عدالتوں میں رٹ درخواستیں دائر ہوئی ہیں ان کی تفصیلات مجھے بھجوائیں تاکہ پتہ چلے کہ کوتاہی کہاں ہوئی۔ بعض اوقات تفتیش ٹھیک نہیں ہوتی ملزم گرفتار نہیں ہوتے یہ کوتاہی نچلے لیول پر Exist کرتی ہے۔ اگر میں اسے تھوڑا سا Justify کروں تو یہ کہ سکتا ہوں کہ بعض اوقات کام کا رش زیادہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ 100 میں سے دو چار کیسز Neglect ہو جاتے ہیں۔ عدالتیں جب کسی چیز کا نوٹس لیتی ہیں تو وہ کسی ایک افسر کی غفلت کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن جو ریمارکس آتے ہیں وہ پورے ڈیپارٹمنٹ سے متعلق ہوتے ہیں اس سے واقعی منفی پیغام آ جاتا ہے۔ میں اس چیز کو اس انداز سے لیتا ہوں کہ ہمیں اپنی اصلاح کرنا ہے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنا ہے۔ ہم نے اپنے افسروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ فری رجسٹریشن آف کیسز کی آڑ میں جھوٹے پرچے درج نہ کریں۔

عدالتیں پولیس کے خلاف جو ریمارکس دیتی ہیں وہ مناسب سمجھ کر دیتی ہیں

سوال: کیا آپ کھلی کچہریاں لگا رہے ہیں؟

جواب: میں نے اپنے افسروں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ باقاعدگی سے کھلی کچہریاں لگائیں میں نے 25 اکتوبر کو یہ عہدہ سنبھالا تھا پہلے ایمرجنسی لگ گئی پھر بے نظیر بھٹو کی شہادت، پھر محرم الحرام اور اب الیکشن کی مصروفیات کی وجہ سے خود کوئی کھلی کچہری نہیں لگا سکا کیونکہ جہاں آر پی او کچہری لگاتا ہے وہاں کا ڈی پی او اور دیگر پولیس افسران بھی انوالو ہو جاتے ہیں۔ البتہ میں نے اوپن ڈور پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ جو بھی میرے پاس آتا ہے اسے عزت سے بٹھاتا ہوں، اس کی بات سنتا ہوں اور اسے گائیڈ بھی کرتا ہوں۔

سوال: تھانہ کلچر میں تبدیلی کی بڑی بات کی جاتی ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ قتل وغیرہ کے مقدمات تو درج ہو جاتے ہیں لیکن ڈکیتی، چوری کا پرچہ درج کرانے کیلئے عوام کو بہت خوار ہونا پڑتا ہے؟

جواب: قتل میں اکثر ملزم نامزد ہوتے ہیں جبکہ ڈکیتی، چوری میں پرچہ نامعلوم ملزموں کے خلاف ہوتا ہے اصل میں پولیس کی کارکردگی Crime against property کی تفتیش کرنے میں ہی سامنے آتی ہے کیونکہ یہ کافی محنت طلب کام ہوتا ہے آپ کی یہ بات درست ہے کہ تھانے لیول پر اکثر ڈکیتی و چوری کے مقدمے کے اندراج میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ڈکیتی کو رابری اور رابری کو چوری بنا دیا جاتا ہے میرے پاس ایسی کوئی شکایت آئے تو میں اس کا نوٹس لیتا ہوں اور براہ راست ڈی پی او سے جواب طلب کرتا ہوں کہ کیس درج کیوں نہیں ہوا۔ اب ویسے بھی لوگوں میں شعور آ گیا ہے ان کا کیس درج نہ ہو تو وہ خاموش نہیں بیٹھتے اور اعلیٰ افسروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

سوال: آپ اپنے حوالے سے بتائیں کہاں پیدا ہوئے تعلیم کہاں سے حاصل کی اور پولیس سروس میں کیسے آئے؟

جواب: میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ گورنمنٹ کالج سے گریجوائشن اور ایم اے انگلش پنجاب یونیورسٹی سے کیا 1981ء میں پولیس سروس جوائن کی۔ فیصل آباد میں اے ایس پی، لاہور میں ایس پی ایڈمنسٹریشن رہا، نارووال جب ضلع بنا تو میں اس کا پہلا ایس پی تھا۔ پھر بطور ایس ایس پی کے طور پر کام کیا۔ فارن پولیسنگ میں تقرری ہوئی تو جاپان چلا گیا وہاں پاکستانی سفارتخانے میں قونصلر کے طور پر کام کیا واپسی پر ایف آئی اے کے پاسپورٹ سرکل میں انسانی سمگلنگ کے معاملے کو ڈیل کرتا رہا۔ دوبارہ پولیس میں آیا تو پہلے اے آئی جی ڈویلپمنٹ اینڈ فنانس اور 2005ء میں پنجاب کانسٹیبلری کا ڈپٹی کمانڈنٹ بنا۔ 25 اکتوبر کو میں نے ریجنل پولیس آفیسر گوجرانوالہ کا عہدہ سنبھالا اور تا حال اسی پر کام کر رہا ہوں۔

یہ درست ہے کہ تھانوں میں ڈکیتی اور چوری کے مقدمے درج کرتے وقت ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے

○ ○

تقدیر

کیا شکوہ ہو جو پیش آیا تقدیر ہماری اپنی تھی
ہیں زخم اضافی جھولی میں تقدیر ہماری اپنی تھی
ہم تھام کے سائے پاؤں کے آغاز سفر میں بیٹھ گئے
ہم سفروں سے ناراض نہیں تاخیر ہماری اپنی تھی
ہے رنگت اجڑی چہرے کی ویسی ہی اداسی چھائی ہے
مشکل سے جب پہچان ہوئی تقدیر ہماری اپنی تھی
اس نے تو ہمیں سمجھایا تھا پر اپنی سمجھ میں نہ آیا
تاعمر جدائی کا غم سہیں گے تقدیر ہماری اپنی تھی
اک عمر ہمارے اوپر کیوں ایثار فانی کھل نہ سکے
سب لفظ ہمارے اپنے تھے تفصیل ہماری اپنی تھی

محمد فیصل لاہور

بے نظیر بھٹو کے قتل؟ کا ذمہ دار کون

وہ دہشت گردی اور انتہاء پسندی کے ناسور کو جمہوری طاقت
کے ذریعے جڑ سے اکھاڑنے کا عزم دہراتی رہیں

امریکہ نے انہیں حفاظت کی یقین دہانی کروائی
مگر ان کی سیکورٹی کیلئے کوئی اقدام نہ اٹھایا

بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پاکستان
مزید سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوا ہے

سکاٹ لینڈ یارڈ کی رپورٹ اور حکومتی مؤقف کے برخلاف پیپلز پارٹی
ان کی موت کی تحقیقات اقوام متحدہ سے کروانے پر بضد ہے

امریکہ اور کونڈا لیزا رائس کی وعدہ خلافی سے خدشہ ہے کہ بش انتظامیہ بھی ان کے قتل میں ملوث ہے

مون ڈائجسٹ کی چونکا دینے والی رپورٹ

شہید بے نظیر بھٹو اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ یہ ایک ایسی دل سوز اور تلخ حقیقت ہے جس نے پوری قوم کو رُلا دیا ہے۔ دل و دماغ تسلیم کرنے پر تیار نہیں کہ وہ بے نظیر جو اجلے لباس میں دمکتے چہرے کے ساتھ گلے میں پھولوں کا ہار پہنے اپنے ہزاروں عقیدت مندوں سے مخاطب تھیں، اگلے ہی لمحے ایک سفاکانہ واردات میں موت کے اندھیروں میں گم ہو کر کروڑوں لوگوں کو سوگوار کر جائیں گی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے آٹھ سالہ جلاوطنی کے بعد جب اپنی دھرتی پر قدم رکھا تو موت بھی ان کے تعاقب میں چل نکلی۔ وہ یہی کہتی رہیں کہ میری زندگی کو خطرہ ہے۔ کچھ لوگ میری جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بعض لوگوں کی نشاندہی بھی کی مگر حکومت ان لوگوں تک پہنچنے میں کامیاب تو نہ ہو سکی لیکن محترمہ کی سیکیورٹی کے انتظامات کے دعوے ضرور کرتی رہی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو خاتون ہو کر بھی دہشت گردوں اور انتہاء پسندوں کو للکارتی رہیں۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے ناسور کو جمہوری طاقت کے ذریعہ جڑ سے اکھاڑ دینے کا عزم دہراتی رہیں۔ ان کی المناک موت کے بعد اب یہ سوال اٹھ رہا ہے کیا واقعی محترمہ کو ان شر پسند اور انتہا پسند قوتوں نے نشانہ بنایا کہ جن کے خاتمے کی وہ باتیں کر رہی ں یا ان کے بیانات سے فائدہ اٹھا کر نادیدہ ہاتھوں نے اپنا کام کر دکھایا اور قوم کو ایک عہد، ایک جدوجہد سے

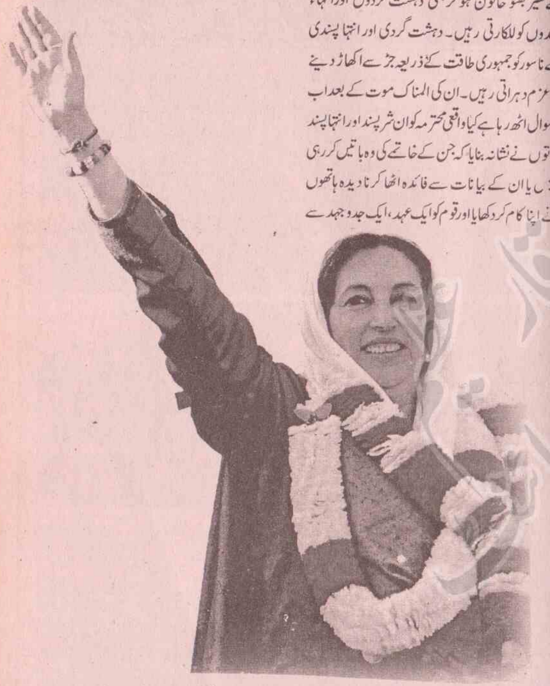

محروم کر دیا جس انسان کو یہ یقین ہو کہ جس راستے پر وہ چل رہا ہے اس کے آگے موت اس کی منتظر ہے لیکن وہ پھر بھی عزم و استقلال کے ساتھ اپنے مقصد کو مقدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتا جائے تو اس کی عظمت، ہمت اور جرات کو سلام ہے۔ محترمہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گی۔

اصل سوال یہ ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کو کس نے مارا؟ قاتل کو کس نے اور کیوں بھیجا؟ قیاس آرائیوں کے اس ماحول میں بہت سی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومت کہتی ہے کہ محترمہ کے قتل کے پیچھے القاعدہ یا طالبان یا پھر دونوں کا ہاتھ ہے کیونکہ جس انداز میں خودکش حملہ کیا گیا ہے یہ طریقہ القاعدہ اور طالبان کا ہی ہے لیکن اگر القاعدہ اس میں ملوث ہے تو اس کے

بے نظیر بھٹو کی موت کو ایک معمہ بنانے کی کوشش کی گئی جس سے تلخیاں مزید بڑھی ہیں

بارے میں یہ تاثر ہے اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ ایسی کوئی کارروائی کرنے کے بعد یہ تنظیم تھوڑے وقفے کے بعد ذمہ داری قبول کرتی ہے اور ساتھ ہی انٹرنیٹ پر اس کی طرف سے اعترافی بیان بھی جاری کر دیا جاتا ہے تاہم محترمہ بینظیر کے قتل کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ دوسری بات جو سامنے آرہی ہے اس میں پیپلز پارٹی اور بعض دیگر حلقے اس بہیمانہ واردات کا الزام بعض حکومتی حلقوں پر عائد کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق ایسے حلقوں کو یقین ہو گیا تھا کہ محترمہ بینظیر بھٹو پہلے سے زیادہ مقبول ہیں اور ان کے بھاری اکثریت سے کامیابی کے امکانات بھی ہیں۔ اگر وہ اقتدار میں آگئیں تو غیر معمولی اقدامات اٹھائیں گی۔ تاہم یہ سب قیاس آرائیاں ہیں جن کی بنیاد پر کوئی بھی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا نہ ہی کرنا چاہیے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ شہید لیاقت علی خان کی المناک موت کی طرح بینظیر کی شہادت کو بھی ایک معمہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے ایسی کوشش زخموں پر مرہم نہیں رکھے گی بلکہ تلخیاں بڑھائے گی۔

وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈیئر ریٹائرڈ جاوید اقبال چیمہ کا کہنا ہے کے بے نظیر بھٹو کا قتل خودکش حملے کے نتیجے میں گاڑی کا لیور گرنے سے ہوا ہے اور اس خودکش حملے کے لئے حکومت نے قبائلی شدت پسند رہنماء بیت اللہ محسود کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور ایک ٹیپ کا حوالہ بھی دیا ہے جو مبینہ طور پر بیت اللہ محسود اور ایک مولوی صاحب کے درمیان گفتگو پر مبنی ہے۔ جبکہ دوسری جانب پیپلز پارٹی کی سیکرٹری اطلاعات شیری رحمان حکومت کے موقف سے متفق نہیں اور انہوں نے ذرائع ابلاغ کو بتایا ہے کہ بے نظیر بھٹو کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ اس ٹیم میں شامل تھیں جس نے بے نظیر کو غسل دیا اور ان کی گردن پر گولی کا نشان تھا۔ ادھر بیت اللہ محسود کے ترجمان مولوی محمد عمر نے حکومتی الزامات کو مسترد کرتے ہوئے ذرائع ابلاغ کو بتایا ہے کہ طالبان یا بیت اللہ محسود بے نظیر بھٹو کے قتل میں ملوث نہیں اور حکومت آزاد ذرائع سے اس کی تحقیقات کرے اور جو ٹیپ وزارت داخلہ نے جاری کی ہے اسے بھی طالبان کے ترجمان نے جعلی قرار دیا ہے۔

ان متضاد دعووں نے عام لوگوں کو کنفیوژن میں مبتلا کر دیا ہے کہ عوام کس کی بات پر یقین کریں اور کس کی بات پر یقین نہ کریں اس معمے کے حل کے لئے ضروری ہے کہ حکومت اور پیپلز پارٹی ایک ایسی تحقیقاتی ٹیم پر متفق ہو جائیں، جس پر حکومت اور پیپلز پارٹی کو اعتماد ہو اور وہ یہ تحقیقات کر کے اصل حقائق قوم کے سامنے لائیں کہ وہ کون سے عناصر ہیں جو پاکستان کے عدم استحکام کے درپے ہیں اور کسی بھی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دے رہے ہیں۔ ملک میں کبھی چینی باشندوں کو قتل کیا جارہا ہے اور کبھی سیکورٹی فورسز پر حملے ہو رہے ہیں بین الاقوامی ماہرین یا اقوام متحدہ سے تحقیقات کرنے سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور اس سے بین الاقوامی لوگ تحقیقات اپنے مفادات کی طرف موڑ دیں گے جس سے پاکستان میں ایک بار پھر نئے سوالات جنم لیں گے ضروری امر یہ ہے کہ پاکستان کے اندر موجودہ تحقیقاتی اداروں کے ایماندار افسران اس کی تحقیقات حکومت اور پیپلز پارٹی کے مشورے سے کریں نہ کہ بین الاقوامی

پاکستان
MODREN

پاکستان
MODREN

وہ آٹھ سالہ جلاوطنی کے بعد جب وطن واپس لوٹیں تو موت بھی ان کے تعاقب میں چل نکلی

تحقیقاتی اداروں سے کیونکہ پھر پاکستان کے اندر ہونے والے ہر واقعے میں بین الاقوامی تحقیقاتی ادارے گھس آنے کی کوشش کریں گے۔ بے نظیر بھٹو کی پالیسیاں اپنی جگہ لیکن بے نظیر نے ہمیشہ پاکستان کو متحد کرنے کیلئے کام کیا ہے اور جب انہیں قتل کیا گیا تو ملک میں شدید ردعمل بھی اس کی گواہی دیتا ہے۔

دریں اثناء بیت اللہ محسود نے ایک برطانوی خبر رساں ایجنسی سے نامعلوم مقام سے ٹیلیفون پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم قبائلی روایات کے تحت عورتوں پر حملے نہیں کرتے اس قتل میں ان کا کسی بھی طور پر کوئی تعلق نہیں۔ دریں اثناء بی بی سی کے مطابق تحریک طالبان پاکستان نے وزارت داخلہ کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ وہ بے نظیر بھٹو کے قتل میں ملوث ہے، حال ہی میں قائم ہونے والی تحریک طالبان پاکستان کے ترجمان مولوی عمر نے نامعلوم مقام سے بی بی سی سے بات کرتے ہوئے کہا چونکہ بے نظیر بھٹو کا قتل سیاسی معاملہ ہے اس لئے ہوسکتا ہے اس میں حکومت یا اس کی ایجنسیاں ملوث ہوں، ان کا کہنا تھا کہ بھٹو خاندان کے ساتھ کافی عرصہ سے یہ سلسلہ جاری ہے پہلے اس خاندان کے تین افراد ذوالفقار علی بھٹو، شاہ نواز بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو کو قتل کیا گیا اور اب بے نظیر کو ہلاک کیا گیا تو یہ وہی پرانی دشمنی کا تسلسل ہے جو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کیلئے کیا گیا ہے۔ مولوی عمر کے مطابق حکومت قبائلیوں کیلئے مشکلات پیدا کرنے اور انہیں کچلنے کیلئے اس قسم کے الزامات لگا رہی ہے، پہلے بھی حکومت نے یہ الزام لگایا کہ اسامہ بن لادن باجوڑ میں ہیں اور اب یہ الزام عائد کیا گیا ہے تو ان سب باتوں کا مقصد قبائلیوں کو بدنام کرنا ہے۔ این این آئی کے مطابق ترجمان نے کہا کہ حکومت پیپلز پارٹی اور پاکستانی عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کیلئے ایسے الزامات عائد کر رہی ہے انہوں نے کہا کہ ہماری جنگ براہ راست امریکہ سے ہے پاکستانی سیاستدانوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں مولوی عمر نے کہا کہ تحریک طالبان پاکستان یا امیر بیت اللہ محسود کو بے نظیر بھٹو کے کراچی میں قافلہ پر حملے اور راولپنڈی میں قتل میں ملوث کیا جانا بالکل غلط ہے انہوں نے کہا ہم سیکیورٹی فورسز کے اہلکاروں کا اغواء بھی اپنے مطالبات کی منظوری کیلئے کرتے ہیں ان کو قتل کرنے کیلئے نہیں جبکہ مطالبات کی منظور کے بعد انہیں رہا کر دیا جاتا ہے۔

پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے سابق صدر ڈاکٹر سعید الٰہی نے کہا ہے بے نظیر بھٹو کا قتل کوئی روڈ ایکسیڈنٹ نہیں تھا کہ اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جاتا بلکہ یہ ایک قتل کا کیس تھا اور قتل کے کیس میں پوسٹ مارٹم رپورٹ از حد ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں جب کیس اسپتال میں آتا ہے تو اندراج میں ہی یہ تحریر کیا جاتا ہے کہ یہ میڈیکولیگل کیس ہے اور میڈیکولیگل کیس کو دیکھنا سی ایم او کا کام ہوتا ہے جو میڈیکل رپورٹ سامنے آئی ہے اس رپورٹ میں سی ایم او کا ذکر ہی موجود نہیں جو قانونی طور پر سقم بھی اور جرم بھی۔

یہ رپورٹ غیر متعلقہ ڈاکٹروں نے لکھی ہے اور ماہرین کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ حکومت نے سرکاری ملازم ڈاکٹروں سے زبردستی رپورٹ لکھوائی ہے۔ محترمہ

ان کے قتل کا الزام القاعدہ اور طالبان پر لگایا جاتا ہے تاہم پیپلز پارٹی اسے تسلیم نہیں کرتی

کے سر میں شدید زخم کے باوجود نیورو سرجن کو بلا گیا نہ ہی رپورٹ میں اس کا ذکر ہے۔

میڈیکولیگل کیس ہونے کے باوجود فورنسک ماہرین کو کسی بھی مرحلے میں شریک مشورہ نہیں کیا گیا۔ محترمہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے وفات پا چکی تھیں۔ رپورٹ کے مطابق ان کی نبض بند تھی، سانس بند تھا، رنگت زرد تھی، آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی اور فکس تھیں، ای سی جی فلیٹ تھی۔ اس کے باوجود تنفس کو بحال کرنے کیلئے چھاتی کی مالش اور بجلی کے جھٹکے دیئے گئے، یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن چھاتی کی بیرونی، مالش میں ناکامی کے بعد محترمہ کا سینہ کاٹ کر وال کی مالش کی گئی جس کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ جنرل آصف نواز کی موت کے بعد سینئر جرنیلوں کے کہنے کے باوجود سرجن جنرل پاکستان آرمی نے ان کا سینہ کھول کر مالش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ زخم کے بعد محترمہ کا دماغ پگھل کر بہہ رہا تھا اور ان کے تمام کپڑے خون سے تر تھے، صرف دماغ پر چوٹ لگنے سے ایسا نہیں ہوتا۔ میڈیکولیگل سرٹیفکیٹ تیار نہیں کیا گیا جبکہ یہ بنیادی ضرورت تھی۔ طبی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ جسم پر گولی کے داخلے کا زخم تو مل جاتا ہے مگر گولی کے خروج کا کوئی زخم لاش میں نہیں ملتا۔ محترمہ کی لاش کی تصاویر بنائی جانی بھی ضروری تھیں لیکن ایسا بھی نہیں کیا گیا۔ محترمہ کی میڈیکل رپورٹ لکھنے والے ڈاکٹرز صرف علاج کرنے کے اہل تھے اور رپورٹ لکھنا ان کے فرائض منصبی میں شامل نہ تھا۔ لاش لواحقین کے حوالے کر کے کوئی رسید حاصل نہیں کی گئی جو کہ خود ایک جرم ہے۔ محترمہ کے سر کے زخم کو گہرا زخم کہا گیا ہے۔ اس میں موجود کئی چھوٹے زخم گولیوں کے ہو سکتے ہیں۔ تنفس کو بحال کرنے کیلئے بجلی کے جھٹکوں سے ان کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ ان حالات میں جبکہ موت کی وجہ سے دماغ کی چوٹ نظر آ رہی ہے اس غیر انسانی فعل کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ سر کے ایکسرے کے مطابق کھوپڑی میں دو سے تین سوراخ تھے جو گولی کے زخم ہو سکتے ہیں کچھ ثبوت اور تحریری مواد کے نتیجے میں فورنسک ماہرین اور پیتھالوجسٹ وجوہات کا تعین کر سکتے ہیں۔ بڑی میڈیکل رپورٹ اور سینئر ڈاکٹرز کو الجھائے بغیر یہ تمام مراحل سی ایم او طے کر سکتا تھا اور یہ اس کی ذمہ داری بھی تھی۔

ڈاکٹر سعید الٰہی نے مزید کہا کہ یہ کوئی معمولی کیس نہیں چونکہ سی ایم او کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن، بدقسمتی سے اس رپورٹ میں سی ایم او کے بجائے دوسرے ڈاکٹرز کا تذکرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کے اسباب کے چشم دید گواہ یہ لوگ ہیں اور جس طرح حکومت نے ان کو اوپن کیا ہے، ان کی جانوں کو خطرہ ہے چونکہ جب تفتیش کا عمل آگے چلے گا اور سوال در سوال کا سلسلہ دراز ہو گا تو یہی لوگ ہیں جو پوسٹ مارٹم کی عدم موجودگی میں تمام معلومات دے سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ رپورٹ بے حیثیت ہے حقیقت یہ ہے کہ تین رپورٹس پہلے لکھی اور پھر ضائع کی گئیں اور یہ آخری رپورٹ بھی مجبور لوگوں کی تحریر دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر مصدق خان کو انتہائی جونیئر ہونے کے باوجود راجہ بشارت کی سفارش پر پرنسپل لگایا گیا ہے، تو ایسے لوگوں سے نافرمانی کی توقع نہیں کی جا سکتی، بس جیسے ہدایات ملتی رہیں، یہ عمل آگے بڑھتا رہا۔

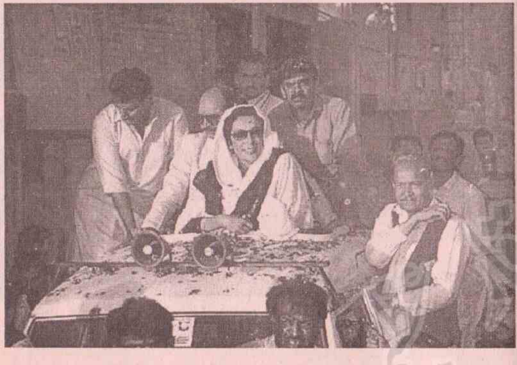

ان سے پوچھا گیا کہ حکومت نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی آپ کے نزدیک کیا وجہ ہو سکتی ہے تو انہوں نے کہا پاکستان جیسے ملک میں جہاں قتل و غارت گری اور بم دھماکے بدقسمتی سے معمول بنتے جا رہے ہیں، جہاں انسانی جان انتہائی ارزاں ہے اور لاپروائی بھی معمول بن چکی ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد محسوس یوں ہوتا ہے کہ حکومت کی خواہش تھی کہ لاش کو جلد از جلد راولپنڈی سے باہر نکال دیا جائے تاکہ ردعمل کا کوئی مرکز نہ بنے چونکہ اگر محترمہ کی لاش اسپتال میں زیادہ دیر تک رہتی تو لوگ جس تیزی سے وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ موت کا اعلان ہونے کے بعد ان کے ردعمل میں شدت بھی آ سکتی تھی۔ میرے نزدیک عوامی ردعمل سے خائف حکمرانوں نے بے نظیر کو جلد ان کے آبائی گھر بھیجنے میں ہی عافیت سمجھی۔ دوسرا امر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت نے دھماکے کو فوری طور پر چونکہ خودکش دھماکہ قرار دے دیا تھا یعنی مارنے والا بھی مر گیا تو تفتیش کیسی؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر قاتل کے پیچھے ماسٹر مائنڈ یا مرکزی کردار کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا جائے تو یہ عمل نہیں رک سکتا۔ لیاقت علی خان کے قاتل کو بھی مرکزی کرداروں نے موقع پر ہی مروا کر تفتیشی عمل رکوا دیا تھا اور محسوس یوں ہو رہا ہے کہ حکومت بھی تفتیشی عمل کو آگے چلانے میں شاید سنجیدہ نہ تھی جو اتنی جلدی کی گئی۔

دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی نے راولپنڈی جنرل ہسپتال کے سات رکنی میڈیکل بورڈ کی ایک رپورٹ میڈیا کو فراہم کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بینظیر بھٹو کو لیزر بیم کے ذریعے شہید کیا گیا ہے، ان کے سر میں زخم کے نیچے تابکار مادہ تھا جو ان کی موت کا باعث بنا، ہم سانحہ راولپنڈی کی تحقیقات کیلئے اقوام متحدہ سے رجوع کریں گے، یہ بات پارٹی کے سیکرٹری مالیات سینیٹر بابر اعوان ایڈووکیٹ نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے کہا کہ قوم قاتلوں کے

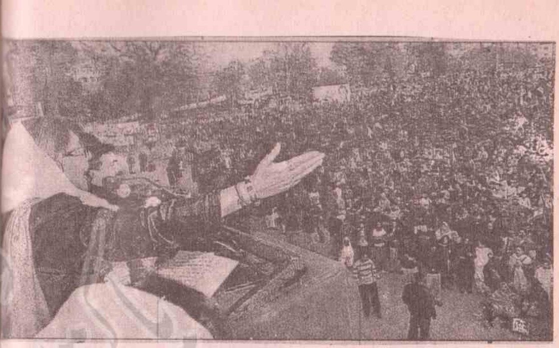

خودکش حملے سے چند منٹ پہلے بے نظیر بھٹو جلسہ عام سے خطاب کر رہی ہیں

کھرے پہچانتی ہے' فوج محترمہ کی شہادت میں شریک نہیں' صدر مشرف افواج پاکستان کے نمائندہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کی تفتیش مشرف کی موجودگی میں ہو یا اس کے بعد اقوام متحدہ کے کمیشن کے ذریعے ہی کرائی جائے گی۔

بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پاکستان مزید سیاسی عدم استحکام کا شکار ہو چکا ہے اور ملک کی بقاء اور سالمیت کے بارے میں طرح طرح کے سوالات اٹھ رہے ہیں اور تجزیہ نگار پاکستان کے مستقبل پر اس کے منفی اثرات مرتب ہونے کے خدشات بھی ظاہر کر رہے ہیں' اس لیے بہتر یہی ہے کہ حکومت پاکستان بالخصوص صدر پرویز مشرف موجودہ حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے قومی مفاد میں اقوام متحدہ کی ٹیم سے بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات کرانے کا اعلان کریں تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے۔

ایک غیر ملکی جریدہ اکانومسٹ نے پاکستان کو دنیا کا خطرناک ترین خطہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ برداشت اور اعتدال پسندی جیسی فخریہ روایات والی مسلمانوں کی دوسری بڑی مملکت آج کل انتہا پسندی کے خطرات کے سائے میں ہے اور دو مرتبہ وزیراعظم رہنے والی بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد پاکستان ایک خوفناک جگہ نظر آتی ہے۔ جریدہ کا کہنا ہے کہ دو چیزیں پاکستان کو انارکی کی طرف لے جانے سے بچا سکتی ہیں ایک بے نظیر بھٹو کے قتل کی شفاف تحقیقات اور دوسرا آزادانہ اور منصفانہ انتخابات۔ آزادانہ انتخابات اسلام پسندوں کی کمزوریوں کا پردہ فاش کر دیں گے اور ایک منتخب حکومت فوج میں موجود اعتدال پسند' سیکولر اور پیشہ افراد سے مل کر بہتر کام کر سکتی ہے۔

دریں اثناء محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے حوالے سے بہت سی باتیں سامنے آ رہی ہیں تاہم بیرونی میڈیا خصوصاً امریکہ کا اپنا میڈیا بھی محترمہ کے قتل میں بش انتظامیہ کی سنگین غلطیوں کو اہم وجہ قرار دے رہا ہے اس حوالے سے ایک امریکی اخبار اور ایک سینئر امریکی صحافی کے مطابق پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن کے قتل کی ذمہ داری سے بش انتظامیہ کو کسی بھی طور بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دوسری طرف ایک برطانوی نشریاتی ادارے ''کیپیٹل بل بلیو'' نامی ویب نے اس حوالے سے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل میں بش انتظامیہ ملوث ہے۔ امریکی خفیہ اداروں نے بش کو خبردار کیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان بھیجا گیا تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے باوجود بش انتظامیہ نے بے نظیر بھٹو کو پاکستان بھیجنے کیلئے کونڈا لیزا رائس کو خصوصی طور پر لندن بھیجا جہاں کونڈا لیزا رائس نے بے نظیر بھٹو کو یقین دہانی کرائی تھی کہ پاکستان آنے پر ان کو سی آئی اے تحفظ فراہم کرنے میں معاونت کرے گی لیکن بش انتظامیہ نے وعدے کے مطابق ایسا نہیں کیا۔ متعلقہ ویب سائٹ نے انٹیلی جنس ذرائع کے حوالے سے لکھا ہے کہ بش انتظامیہ کو پاکستان میں امریکی خفیہ ادارے سنٹرل انٹیلی جنس سی آئی اے کے ایجنٹوں نے خبردار کیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان نہ بھیجا جائے کیونکہ اس وقت پاکستان کی صورت حال ایسی ہے کہ انہیں وہاں پہنچتے ہی قتل کرنے کے خدشات موجود ہیں لیکن بش انتظامیہ نے خفیہ اداروں کی طرف سے خبردار کئے جانے کو نظر انداز کر دیا اور خطرات کے باوجود بے نظیر بھٹو کو پاکستان بھیجنے کیلئے وزیر خارجہ کونڈا لیزا رائس کو لندن بھیجا جہاں اس نے بے نظیر بھٹو سے ملاقات کی اور انہیں پاکستان جانے پر آمادہ کیا۔ کونڈا لیزا رائس نے بے نظیر بھٹو کو ملاقات میں یقین دلایا تھا کہ ان کو ملک واپسی پر مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا لیکن بعد ازاں انہوں نے اپنے وعدے کے برخلاف ان کی سیکورٹی بڑھانے کے سلسلے میں کسی قسم کی معاونت فراہم نہیں کی جس سے یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے قتل میں بش انتظامیہ بھی ملوث ہے۔

* * *

شہید بے نظیر بھٹو کی نذر

خود کو اِس دشت کی ہیبت میں اُتارا کیوں ہے
اتنے گھبرائے ہوئے ہو، اُسے مارا کیوں ہے
لوگ آ پہنچے ہیں ظالم، تری شہ رگ کے قریب
وہ تو خاموش تھے، تو نے اُنہیں مارا کیوں ہے
اِس گھرانے کو سدا سُولیاں کرتی ہیں سلام
آزمائش سے اِسے تُو نے گزارا کیوں ہے
یہ تو سب کرتے رہے آگ کے دریا کو عبور
پاک وطن بتا تجھ کو سنوارا کیوں ہے
تجھ پہ آوازے کسیں گی تری نیندیں سُن لو
آل فرعوان کا آخر تُو سہارا کیوں ہے
تلملاتے ہیں ابھی تک بھری دنیا کے رئیس
یہ وطن دنیا کے نقشے پہ اُبھارہ کیوں ہے
حاکمِ شہر بتا، رنج ہے کیا اِس کے خلاف
یہی اک جرم غریبوں کا سہارا کیوں ہے
سوچتا رہتا ہوں اکثر شب تنہائی میں
اک بھٹو ہی مری آنکھ کا تارا کیوں ہے
ہم تو شرمندہ ہیں اب تک میرے قائد اے سلیم
تیری فرقت میں ہمیں جینا گوارا کیوں ہے

شاعر: صفدر سلیم سیال

بینظیر کا سفر آخرت

ان کے جسد خاکی کو سی ون تھرٹی طیارے کے ذریعے راولپنڈی سے سکھر لایا گیا

اپنے آخری خطاب میں انہوں نے کہا کہ وہ وطن کی عزت کی خاطر جان قربان کردیں گی

محترمہ بے نظیر سیاست کے پیچھے نہیں تھیں بلکہ سیاست ان کے پیچھے پیچھے تھی

بے نظیر بھٹو کو سپرد خاک کیے جانے کے بعد بھٹو خاندان کی اب 70 قبریں ہوگئی ہیں

بے نظیر بھٹو کی المناک موت اور تدفین پر

مون ڈائجسٹ کی خصوصی رپورٹ

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو اب ہمارے درمیان نہیں رہیں۔ اُن کی شہادت ایک ایسا سانحہ ہے جس نے قومی سیاست کا مستقبل ایک بار پھر تاریک کردیا ہے۔ وہ اپنے قول کی کس قدر پکی تھیں کہ اپنے آخری خطاب کے آخری الفاظ میں اُنہوں نے لاکھوں کے ہجوم میں یہ عہد کیا کہ وطن کی عزت کی خاطر وہ اپنی جان قربان کردیں گی اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اپنے عہد کو اُنہوں نے اگلے ہی چند لمحوں میں اِس طرح سے نبھایا کہ خود سینے پر گولیاں کھا کر اِس ملک کے وفاق کی حرمت اور سیاست کی لاج رکھ

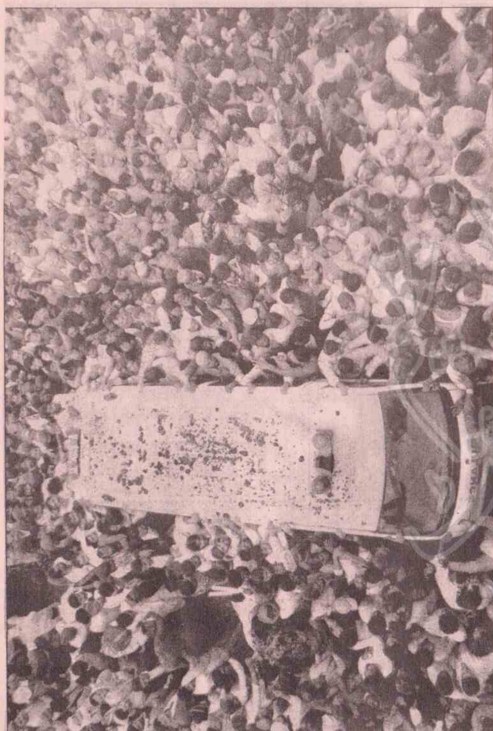

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن اور سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی میت تدفین کیلئے لاڑکانہ کے قریب گڑھی خدا بخش کے آبائی قبرستان لے جایا جا رہا ہے۔ مرحومہ کو ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا

انہوں نے اپنی طلسماتی شخصیت اور اعلیٰ سیاسی بصیرت کے باعث بھٹو خاندان کو زندہ رکھا

لی۔ 18 اکتوبر کو جب دختر مشرق پاکستان آئیں تو اُسے سیاسی مخالفین نے حکومت سے ڈیل کا نتیجہ قرار دیا اور یہاں تک کہا گیا کہ اُنہوں نے شاید حکومت سے کوئی سمجھوتہ کرلیا ہے مگر وقت نے ثابت کیا کہ ایسا نہیں تھا بلکہ اِسے بے نظیر کا کارنامہ ہی کہا جائے گا کہ ملک میں پچھلے 8 سال سے جو سیاسی جمود اور گھٹن تھی، لوگ حقیقی جمہوریت کیلئے ترس رہے تھے، بے نظیر نے سیاسی بصیرت سے جمہور کی فضا قائم کی، بلکہ اُن کی آمد کے بعد دوسری بڑی پارٹی کے لیڈر کی بھی وطن واپسی کیلئے راہ ہموار ہوئی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو سیاست کے پیچھے نہیں بلکہ سیاست اُن کے پیچھے پیچھے تھی جس کا زندہ ثبوت اُن کے پچھلے دنوں ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والے غیر معمولی جلسے ہیں جن میں عوام کی بھرپور شرکت نے آئندہ کی سیاسی صورتحال کے بارے میں واضح اشارہ دے دیا تھا۔ تاہم اِسی دوران بڑا قومی سانحہ اِس طرح سے ہوا کہ عوام کی یہ مقبول ترین لیڈر دہشت گردوں کا نشانہ بن گئی۔ موت جو 18 اکتوبر سے اُنکے تعاقب میں تھی، اُس نے بالآخر 27 دسمبر کو عین غروبِ آفتاب کے وقت دختر مشرق کی زندگی کا سورج غروب کردیا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کا جسد خاکی سی ون تھرٹی طیارے کے ذریعے راولپنڈی سے سکھر لایا گیا۔ میت کے ہمراہ اُنکے شوہر آصف علی زرداری اور تینوں بچے بھی سکھر آئے جہاں سے بے نظیر بھٹو کے جسد خاکی کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے لاڑکانہ لے جایا گیا۔ گڑھی خدا بخش میں تقریباً تین بجے بعد نماز جمعہ شہید بھٹو کمپلیکس کے کھلے میدان میں نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ نماز جنازہ کے بعد ایمبولینس کے ذریعے میت بھٹو کے مزار پر لے جائی گئی اور اُنہیں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں اُن کی وصیت کے مطابق سپرد خاک کیا گیا۔ بھٹو خاندان کے اِس قدیم آبائی قبرستان میں پہلے سے 69 قبریں موجود تھیں۔

بے نظیر بھٹو کو سپرد خاک کئے جانے کے بعد یہاں بھٹو خاندان کی اب 70 قبریں ہوگئیں۔ بے نظیر بھٹو کی تدفین کا عمل شام ساڑھے چار بجے مکمل کیا گیا۔ تدفین کے موقع پر بھٹو خاندان کے افراد، پیپلز پارٹی کی مرکزی اور صوبائی قیادت موجود تھی۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ (ن) اور خاکسار تحریک کے مقامی رہنما بھی موجود تھے۔ تدفین کے بعد بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری اور بھٹو خاندان کے افراد نوڈیرو بھٹو ہاؤس روانہ ہوگئے جہاں اُنہوں نے ملک بھر سے آنے والے افراد سے تعزیتیں وصول کیں۔ بے نظیر بھٹو کی میت کو ہزاروں افراد کی موجودگی میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِس دوران انتہائی رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ درجنوں افراد شدت غم سے نڈھال ہوکر بے ہوش ہوگئے۔ اِس موقع پر لوگوں نے سخت نعرے بازی کی۔

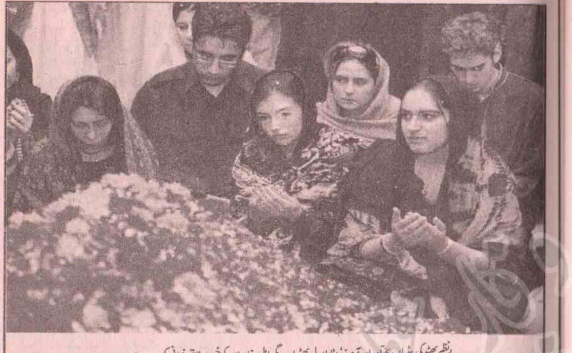

بے نظیر بھٹو کی بیٹیاں بختاور اور آصفہ، بیٹا بلاول بھٹو اور دیگر اہل خانہ ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کررہے ہیں

آصف علی زرداری اور بلاول بھٹو غمزدہ بیٹھے ہیں

بے نظیر بھٹو کے تابوت کو لوگ دفنانے کیلئے جارہے ہیں

ان کے قتل کے بعد ملک بھر میں زبردست ہنگامے پھوٹ پڑے
اور لمحوں میں ملک کا اربوں روپے کا نقصان ہوگیا

تدفین میں سب سے آخر میں بے نظیر بھٹو کی بہن صنم بھٹو لندن سے پہنچیں۔ ایک اطلاع کے مطابق بے نظیر بھٹو کی تدفین میں سابق وزیر اعظم، پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں نواز شریف اور اُن کے بھائی شہباز شریف بھی شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن اُنہیں محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری نے سکیورٹی کے نقطہ نظر سے روک دیا۔

بے نظیر بھٹو کی میت کو لاڑکانہ لانے اور تدفین کے دوران پولیس اور رینجر وہاں موجود نہیں تھی۔ سیکورٹی کے انتظامات پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے سنبھال رکھے تھے۔ بے نظیر بھٹو جو کہ مسلم دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم تھیں اور اُنہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ حقیقی جمہوریت کے قیام کی جدوجہد میں گذرا، اُن کی بے وقت شہادت کے بعد ملک میں صورتحال انتہائی کشیدہ ہوگئی اور ایک مرتبہ پھر ملک غیر یقینی کی سنگین کیفیت میں مبتلا ہوگیا ہے۔ موجودہ نازک اور مشکل حالات کے پیش نظر عام انتخابات 18 فروری 2008ء کو کرانے کا اعلان کیا گیا ہے

بے نظیر بھٹو کی جمعرات کی شام کو فائرنگ اور بم دھماکے میں ہلاکت کی اطلاع پر کراچی اور اندرون سندھ میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ کراچی میں تمام سڑکیں اور گلیاں ویران ہوگئیں۔ چار روز تک مکمل طور پر بازار بند رہے۔ شہر میں مواصلاتی نظام درہم برہم ہوگیا۔ مشتعل افراد نے 500 گاڑیاں، 0 بینک 50 پٹرول پمپ، 2 تھانے، 5 پولیس چوکیاں، ٹیلی فون ایکسچینج، 11 فیکٹریاں، 40 دوکانیں، 30 سے زائد گھروں کو نذر آتش کردیا۔ دادو میں سابق وفاقی وزیر لیاقت علی جتوئی کے گھر کو بھی نذر آتش کردیا گیا۔ جمعرات کی شب گورنر ہاؤس میں گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کی صدارت میں سندھ میں امن وامان کے حوالے سے اہم اجلاس جاری رہا جس میں سندھ کے حساس علاقوں میں فوج طلب کرنے اور اسٹینڈ بائی میں رکھنے کے حوالے سے اہم فیصلے کیے گئے جبکہ متحدہ قومی موومنٹ سمیت دیگر سیاسی جماعتوں نے 3 روز کے سوگ کا اعلان کیا۔ اِس موقع پر متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے ایک ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ”سندھ کے تیسرے وزیر اعظم کو شہید کردیا گیا“......

اگر بے نظیر بھٹو کے قتل کی منصوبہ بندی کرنے والوں کو سامنے نہ لایا گیا تو خاکم بدہن پاکستان کی سلامتی کو خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔ اِس سانحہ پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ بے نظیر بھٹو کی شہادت پاکستان کا بہت بڑا نقصان ہے۔ یہ اُن کا نقصان ہے جو ملک میں جمہوریت چاہتے ہیں۔

ان کے قاتلوں کو منظر عام پر نہ لایا گیا تو پاکستان کی سلامتی کو خطرات لاحق ہوسکتے ہیں

بے نظیر کی شہادت پر ملک کا ہر فرد اشکبار تھا

تدفین کے دوران رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے درجنوں افراد شرکت غم سے بے ہوش ہوگئے

بے نظیر کا 10 سال بعد لیاقت باغ میں ہونے والا جلسہ اُنکی زندگی کا آخری جلسہ ثابت ہوا۔ بے نظیر بھٹو نے کچھ عرصہ قبل صدر مملکت جنرل پرویز مشرف کو ایک خط لکھا، جس میں اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ ”مجھے تین شخصیات قتل کرواسکتی ہیں لیکن اُنہوں نے مرتے دم تک اُن افراد کے نام کسی کو نہیں بتائے تھے۔

بینظیر بھٹو کی شہادت پر ہر آدمی، چاہے اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے بھی ہو، کی آنکھ اشکبار ہے۔

آہ بے نظیر بھٹو

ایک خوشبو ہوئی گلاب میں گم
خون ناحق ہوا حجاب میں گم
تیرگی پھیلتی ہے سینے میں
یوں اُجالا ہوا سراب میں گم
آگہی رو رہی ہے جانے کیوں
ایک منظر ہوا حباب میں گم
یوں اجل آگئی ہے سڑکوں پر
جیسے چہرہ کوئی نقاب میں گم
ڈھل رہے ہیں چراغ آنکھوں سے
رات پوشیدہ آفتاب میں گم
یوں اچانک اُجڑ گئے ہیں دل
ساری خوشیاں ہوئیں عذاب میں گم
پھول، پتے، بکھر رہے ہیں سعد
پھول چہرہ ہوا شباب میں گم

شاعر: سعد الدین سعد

اقوال زریں

☆ جھوٹ بولنا بدی کی راہ دکھاتا ہے اور بدی دوزخ میں لے جاتی ہے۔ (حضور پاکؐ)

☆ گناہ جوان کا اگرچہ بد ہے لیکن بوڑھے کا بدتر ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیق ؓ)

☆ غصے کا گھونٹ پینا شہد اور دودھ کے گھونٹ پینے سے بہتر ہے۔ (حضرت عمرؓ)

☆ موت سے بڑھ کر سچی اور اُمید سے بڑھ کر جھوٹی کوئی چیز نہیں۔ (حضرت علیؓ)

☆ تمام خوبیوں کا مجموعہ علم سیکھنا اور عمل کرنا اور پھر اوروں کو سکھانا ہے۔ (غوث الاعظمؒ)

☆ قدرت انتقام رکھتے ہوئے غصے کو پی جانا افضل ترین جہاد ہے۔ (امام جعفر صادقؒ)

مرسلہ: حسن رضا جعفری لاہور

بینظیر بھٹو

’’عالمی گریٹ گیم‘‘ کا شکار ہوئیں

بینظیر بھٹو کا قتل امریکی پلان بی کا حصہ تھا

ان کا پہلا پلان پاکستان میں سپیشل ٹاسک فورس کی تعیناتی تھا

بینظیر بھٹو کے قتل کا سب سے زیادہ فائدہ امریکہ کو حاصل ہوا ہے

یو ایس اسپیشل فورسز کو پاکستان کے اندر قیام کی اجازت ملنے پر بینظیر کو کنارے لگانے کا امریکی منصوبہ کامیاب ہو گیا

عالمی تناظر میں بینظیر کے قتل کے محرکات اور امریکی ماہر تجزیہ نگار کی ایک چشم کشا رپورٹ

گذشتہ چند برسوں کے دوران پاکستان کی داخلی سیاسی صورتحال مکمل طور پر عالمی سیاسی صورتحال سے منسلک ہو چکی ہے۔ اِس لئے وطن عزیز میں ہونے والے ہر بڑے واقعہ کو عالمی سیاسی تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے المناک واقعہ کو بھی بین الاقوامی سیاسی صورتحال کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ ہر کوئی اِس سوال کے جواب کی تلاش میں سرگرداں ہے کہ بے نظیر کے قتل میں اصل ماسٹر مائنڈ کون ہے؟ پیپلز پارٹی اور اسٹیبلشمنٹ ایک دوسرے پر الزام عائد کر رہے ہیں۔ حکومت نے پہلے القائدہ اور طالبان کو اِس واقعہ میں ملوث قرار دیا مگر بیت اللہ محسود اور طالبان کی جانب سے تردید کے بعد اِس جانب کسی نے رخ نہیں کیا۔ خود پیپلز پارٹی کی قیادت نے القائدہ اور طالبان کے ملوث ہونے کے دعویٰ کو مسترد کر دیا۔ امریکہ سکاٹ لینڈ یارڈ کی تفتیشی ٹیم کے آنے کے بعد اِس بات کا برملا اظہار کر رہا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے قتل میں القائدہ کا ہاتھ نظر نہیں آتا...... تو پھر قاتل کون ہو سکتا ہے؟ صاف محسوس ہوتا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو عالمی ’’گریٹ گیم‘‘ کا شکار ہوئی ہیں...... یقینی بات ہے کہ اگر اِس سارے معاملے میں بین الاقوامی کھیل ہی اصل وجہ ہے تو پھر

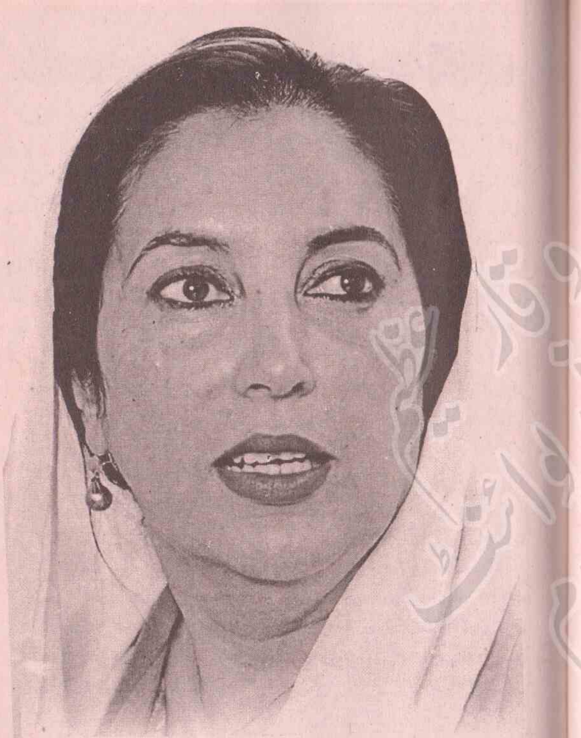

اِس واردات میں مقامی ذرائع ہی استعمال کیے گئے ہوں گے مگر اصل مسئلہ ’’ماسٹر مائنڈ‘‘ کا ہے۔ اِس کا تعین کون کرے گا اور کیسے کیا جائے گا...... پاکستان واپسی سے قبل بے نظیر بھٹو اور امریکی وزیر خارجہ کونڈا لیزا رائس کے درمیان کس قسم کی یقین دہانیاں عمل میں لائی گئی تھیں؟ امریکہ اور برطانیہ نے بے نظیر بھٹو کے سیکورٹی مطالبے سے کیوں صرف نظر کیا؟ اسرائیلی صدر شمعون پیریز نے بے نظیر کی موت کو بڑا نقصان کیوں قرار دیا اور وطن عزیز کو انتہا پسندوں کا گڑھ ثابت کر کے اصل فوائد کون حاصل کرنا چاہتا ہے

امریکہ اور برطانیہ نے بے نظیر کے سیکورٹی کے مطالبے سے صَرفِ نظر کیوں کیا

......صاف نظر آرہا ہے کہ لیاقت باغ راولپنڈی میں ہونے والی تاریخ کی یہ دوسری بڑی قتل کی واردات بھی پہلی واردات کی طرح سرکاری فائلوں کا بوجھ بن جائے گی......

صورتحال یہ ہے کہ وطن عزیز میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم بے نظیر بھٹو کے قتل کے سلسلے میں حکومتی مطالبے پر پاکستان آئی لیکن اِسکے باوجود آصف علی زرداری اور پاکستان پیپلز پارٹی کی دیگر قیادت بار بار اِس نوع کا مطالبہ کررہی ہے کہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات اقوام متحدہ کے ذریعے اِسی انداز میں کرائی جائیں جس طرح لبنان کے سابق صدر رفیق الحریری کے قتل کی تحقیقات کی گئی تھیں۔ لیکن اِس سلسلے میں متحدہ عرب امارات کے نامور اخبار ”الـخـلـیـج“ نے ”تحقیق دولی ل بوتو“ کے عنوان سے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ ”اگر بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری اور پیپلز پارٹی کا یہ مطالبہ زور پکڑتا ہے کہ بے نظیر بھٹو قتل کیس کی تحقیقات رفیق الحریری کیس کی طرح اقوام متحدہ کے ذریعے ہوں اور سلامتی کونسل میں اِس سلسلے میں کوئی قرارداد پیش کی جاتی ہے تو صدر مشرف کا سب سے بڑا پشتی بان امریکہ اُسے ویٹو کردے گا“......

محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد اچانک جس طرح ملکی حالات قابو سے باہر ہوئے تھے، اُس سے صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اِس ایک قتل سے کئی شکار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یقینی بات ہے کہ جو قوتیں اِس قتل کی اصل محرک ہیں وہ کسی طور پر بھی پاکستان کی خیر خواہ نہیں ہیں۔ خصوصاً سندھ میں لسانی اور نسلی فسادات کی باقاعدہ سازش تیار کی گئی جس میں بھارت کی خفیہ ایجنسی ”را“ کا نام لیا جاتا ہے۔ اِس سازش کے تحت انتہائی منصوبہ بندی کے تحت بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد سندھ میں غیر سندھیوں کی املاک جلائی گئیں اور لوٹ مار کی گئی تاکہ اِسکا ردعمل دیگر پاکستانی صوبوں میں بھی ہوسکے اور فسادات کی یہ لہر سارے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ ایسی صورتحال بلوچستان میں بھی پیدا کی گئی، یہاں بھی غیر بلوچیوں کی املاک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی مگر خوش قسمتی سے حالات اِس انداز میں خراب نہیں ہوئے جیسے دشمن کے عزائم تھے۔

بے نظیر بھٹو کو مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کہا جاتا تھا اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُنہوں نے بین الاقوامی سطح پر جس انداز میں شہرت حاصل کی، اُن کے والد ذوالفقار علی بھٹو کے بعد کسی اور پاکستانی لیڈر کو ایسی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ محترمہ پاکستان میں لبرل قوتوں کی سب سے بڑی نمائندہ تصور کی جاتی تھیں۔ اِسی وجہ سے اُنہیں مغرب میں زبردست پذیرائی حاصل رہی لیکن اِسکے باوجود اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ افغانستان میں پروان چڑھنے والی طالبان قوتیں اُنہی کے دورِ حکومت میں کابل تک جا پہنچیں، یعنی افغانستان میں جب انارکی اور فساد

کونڈالزا رائس اور بے نظیر کے درمیان کس قسم کی یقین دہانیاں عمل میں آئی تھیں؟

نے پوری طرح سر اُٹھالیا اور دیگر پاکستان دشمن قوتیں اس تناظر میں وہاں اپنے قدم جمانے کی منصوبہ بندی کرنے لگیں تو بے نظیر بھٹو کی حکومت کی جانب سے پاکستان نے طالبان کو ہر طرح سے امداد مہیا کی جسکی وجہ سے وہ انتہائی کم وقت میں افغانستان کے نوے فیصد علاقے پر قابض ہوئے اور کابل میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ یہ وہی طالبان ہیں جنہیں بعد میں امریکہ کے گرم سرد پر حاوی تیل کمپنیوں کی جانب سے بحیرہ قزوین کے تیل کی پائپ لائن کیلئے راہ داری دینے کیلئے دباؤ ڈالا جاتا رہا۔ امریکہ کی بڑی تیل کمپنی ''یونی کول'' کے دو اہم ملازمین حامد کرزئی کو بعد میں افغانستان کا صدر تعینات کیا گیا جبکہ زلمے خلیل زاد کو افغانستان اور عراق کے بعد اقوام متحدہ میں امریکہ کا سفیر مقرر کردیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تیل کی اس عالمی ''کارٹیل'' یا ''مافیا'' نے بے نظیر بھٹو حکومت کے اُس کردار کو کیا فراموش کردیا ہوگا جو اُنہوں نے طالبان کی تشکیل میں ادا کیا تھا اور جسکی وجہ سے طالبان کے سخت موقف نے اِس تیل مافیا کے خواب بحیرہ قزوین کے علاقے میں کئی سال پیچھے دھکیل دیئے تھے۔ اِسی تیل مافیا نے نہ صرف افغانستان بلکہ تمام مشرق وسطیٰ خصوصاً عراق کے تیل کو اپنے تصرف میں لانے کیلئے جو ہولناک منصوبہ بندی کی، اُس نے انسانیت کا وہ قتل عام کیا جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ 9/11 کا واقعہ تمہید بنایا گیا اور اُسکے بعد جو راستے میں آیا، اُسے روند دیا گیا۔ پہلے افغانستان اور اُسکے بعد عراق ''عالمی آئل کارٹیل'' کے مفادات کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ اس نازک مرحلے میں پاکستان کو ''گریٹ گیم'' میں اہم جگہ دی گئی۔ بے نظیر بھٹو نے جلاوطنی کے دوران ہی عالمی سیاست کے تناظر میں اہم کردار ادا کیا۔ اُنہوں نے بدلتے حالات کے تحت پاکستان میں موجود ''انتہا پسندوں'' کے خلاف سخت بیانات دیئے۔ لال مسجد کے مسئلے پر بھی وہ مشرف حکومت کی ترجمان بنی رہیں۔ اِس کردار کو بھی امریکہ میں بہت سراہا گیا۔

......اِنہی حالات کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے انتہا پسندوں کے خلاف بیانات کا جائزہ لیا جائے تو ایسا لگے گا کہ جیسے اُنہیں انتہا پسندوں نے قتل کیا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ چاہیے کہ پاکستان میں لبرل ازم کی سب سے بڑی علامت کو منظر سے ہٹا کر اصل فائدہ کس کو پہنچایا گیا ہے؟ امریکہ کی ''دہشت گردی'' کے خلاف نام نہاد جنگ میں پاکستان کو پھنسا کر نہ صرف اُسکے استحکام کو کمزور کرنے کی سازش کی گئی ہے بلکہ اس سلسلے میں پاک فوج کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا۔ یہ بات ہم پہلے بھی تسلسل سے کہتے رہے ہیں کہ پاک فوج اور پاکستانی عوام کے درمیان قریبی تعلق کی سی مثال دنیا میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ پاکستان مخالف قوتوں کی آنکھ میں ہمیشہ پاکستانی فوج اور اُسکے جوہری اثاثے کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ بھارت سمیت دیگر عالمی قوتیں پاکستان کے مقتدر اداروں میں ''انتہا پسندوں'' کے ہمدردوں کی موجودگی کا نام لے کر مشرف انتظامیہ پر دباؤ کی کیفیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اِس سارے منظرنامے میں صدر مشرف کی جانب سے حکمت سے کم اور انا پرستی سے زیادہ کام لیا گیا۔ بد قسمتی سے اُنہیں جو سیاسی کنبہ ورثے میں ملا، وہ چوہدری برادران اور ہمنواؤں کا تھا جو گجرات

بھارت نے بینظیر کے قتل کے بعد سندھ میں بڑے پیمانے پر فسادات کا منصوبہ بنایا تھا

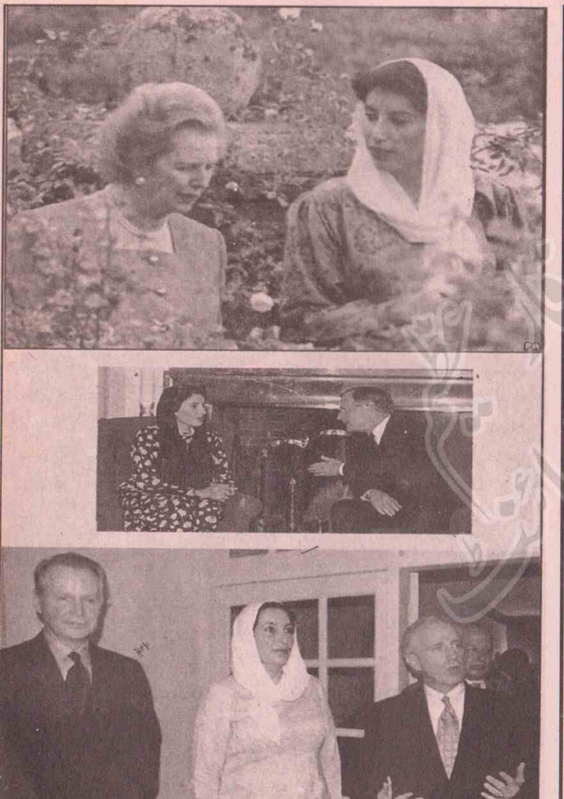

بے نظیر بھٹو مختلف بین الاقوامی شخصیات کے ہمراہ

اقوام متحدہ سے بے نظیر کے قتل کی تحقیق کے مطالبے کو امریکہ سلامتی کونسل میں ویٹو کردے گا

سے آگے سوچنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے، کجا یہ کہ وہ بین الاقوامی سازشوں کا ادراک کر سکیں۔

نامور امریکی دانشور اور عالمی تھنک ٹینک گلوبل ریسرچ سے منسلک اسٹریٹجک تجزیہ نگار ایف ولیم اینگ ڈاہل نے بے نظیر بھٹو کے قتل کی واردات کے حوالے سے اپنے سیر حاصل تجزیے میں کہا ہے کہ کسی ایسے سیاسی رہنما کو قتل کرنا جو عوامی حمایت بھی رکھتا ہو اور اہم بھی ہو اور اُسے بہترین سیکورٹی بھی حاصل ہو، آسان کام نہیں ہوتا۔ اِس کام کو سہل بنانے اور پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے انٹیلی جنس طاقت اور اِس کام کی پیشہ ورانہ تربیت کی بہت ضرورت ہوتی ہے تاکہ کام اختتام اور مطلوبہ شخص اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ اِس دوران اِس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ قتل کروانے والی طاقت یا شخص کا دوران تفتیش نام تک ظاہر نہ ہو اور قتل میں ملوث کوئی بھی شخص کم از کم زندہ گرفتار نہ ہو سکے۔

امریکی تجزیہ نگار ایف ولیم اینگ ڈاہل کا کہنا ہے کہ اُنہیں 27 دسمبر 2007 کو ہونے والے بے نظیر بھٹو کے قتل کی، سرائیوو میں جولائی 1914ء میں قتل ہونے والے ایک اہم رہنما Archduke Francls Ferdlinan,s کی موت میں مماثلت نظر آتی ہے۔ ایسی ہی مماثلت امریکی صدر جان ایف کینیڈی کے قتل سے بھی ظاہر ہوتی ہے جہاں پستول کا ٹرائیگر دبانے والا شخص صرف ایک مہرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا حالانکہ ایسی سازشیں انتہائی گہری ہوتی ہیں اور اُن کا سراغ لگانا عموماً آسان نہیں ہوتا۔

اب سوال یہاں بھی یہی اُٹھتا ہے کہ آخر بے نظیر بھٹو کے قتل سے کس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ ولیم اینگ ڈاہل کا استدلال ہے کہ بے نظیر بھٹو کا قتل ایک ایسے وقت میں سامنے آیا جبکہ اُنکی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی 8 جنوری 2008ء کو پاکستان میں ہونے والے عام انتخابات میں کامیابی کیلئے ہارٹ فیورٹ قرار دی جارہی تھی اور اِنکی کامیابی سے پاکستانی حکومت اور اُسکی اتحادی جماعت کو ایک بڑا خطرہ سامنے نظر آرہا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ پاکستانی حکومت نے عجلت کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے بے نظیر بھٹو کے قتل کی کاروائی کو القائدہ کا کارنامہ قرار دے دیا۔ یہ ایسا ہی الزام ہے جیسے کہ واشنگٹن نے نائن الیون کے فوری بعد اُسامہ بن لادن کی جماعت القائدہ کو ٹوئن ٹاور سے طیارے ٹکرانے کا ماسٹر مائنڈ بتایا تھا۔ چند دنوں کے بعد صدر مشرف نے یہ اعلان کیا کہ اُنہیں اِس بات میں کوئی شک وشبہ نظر نہیں آتا کہ اِس کاروائی کے پیچھے القائدہ ہی کا ہاتھ ہے۔ ولیم اینگ ڈاہل نے لکھا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی موت کی تفتیشی کاروائی کیلئے برطانوی تفتیشی ٹیم، اسکاٹ لینڈ یارڈ کی آمد پر حکومتی آمادگی امریکی دباؤ کا نتیجہ بتائی جاتی ہے۔ پاکستانی قبائلی جنگجو سردار بیت اللہ محسود کے خلاف جس کے القائدہ اور افغانستان کے طالبان کے ساتھ قریبی تعلقات بتائے جاتے ہیں، لگایا جانے والا بے نظیر بھٹو کے قتل کا الزام اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کاروائی اُنکی نہیں ہے کیونکہ اسلامی انتہا پسندوں کی خاصیت ہے کہ وہ اپنی کسی بھی کاروائی کی فوراً ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔ بیت اللہ محسود نے

اس الزام کی تردید کی ہے۔ بیت اللہ محسود اور القائدہ پر لگائے جانے والے الزام سے پاکستانی حکومت کو

فوری طور پر دو فائدے ہوئے ہیں۔ پہلا یہ کہ پاکستانی حکومت نے مغرب کو ایک بار پھر القائدہ کے بھوت سے ڈرانے کا فائدہ اُٹھایا ہے اور دوسرا یہ کہ اُسے اپنے ایک بڑے حریف سے چھٹکارا مل گیا ہے۔

ولیم اینگ ڈاہل نے اپنی تجزیاتی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اُن کی اطلاعات کے مطابق بے نظیر بھٹو کی موت کا سبب بننے والا ہتھیار ایک نو ایم ایم کا پستول ہے۔ ولیم نے لکھا ہے کہ اِس بات کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ امریکی صدر بش اور نائب صدر ڈک چینی کئی مہینوں سے پاکستان میں اپنے اثر ورسوخ کو بڑھاوا دینے کی کوششیں کررہے تھے اور اُن کا واضح مقصد پاکستان میں امریکی فوج کی موجودگی اور اپنی دہشت گردی کے خلاف جنگ کو پورے خطے میں مزید تباہ کن بنانا ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھٹو خاندان کی اپنی ایک جمہوری اور جاگیردارانہ تاریخ ہے۔ یہ خاندان جمہوریت کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں اور افواج پاکستان اور انٹیلی جنس کی مخالفت سے پہچانا جاتا ہے۔ خود بے نظیر بھٹو نے اپنے آپ کو لائف ٹائم چیئر پرسن بنالیا تھا جس کا ایک مطلب تھا کہ وہ جب تک زندہ رہیں گی تب تک پارٹی کی قیادت اُنکے پاس ہی رہے گی۔

کئی عالمی دانشوروں نے اپنے تجزیے میں اِس بات کو بھی اُجاگر کیا ہے کہ بے نظیر بھٹو کو جب امریکی اعلیٰ عہدیداروں کی جانب سے پاکستان واپسی اور صدر پرویز مشرف کے ساتھ ڈیل کیلئے آمادہ کیا جارہا تھا تو اُس وقت اُن کا لہجہ بڑی عاجزی اور محتاط پسندی کا تھا۔ لیکن جب وہ پاکستان آگئیں اور اُنکے کارکن متحرک ہوگئے تو اُنہوں نے صدر پرویز مشرف کیلئے اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے اُنکی مخالفت کا فیصلہ کیا اور اُنہوں نے اپنی تقریروں میں فوجی اقتدار کو للکارنا شروع کیا، اُنکی حکمت عملی کا جائزہ لینے والوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر مشرف حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

ولیم اینگ ڈاہل نے دعویٰ کیا کہ اُنہیں باخبر امریکی انٹیلی جنس ذرائع نے بے نظیر بھٹو کے قتل کے حوالے سے بتایا ہے کہ پاکستان میں ہونے والی حالیہ کارروائی کیلئے امریکہ اور پاکستان میں ایک اتفاق پایا جاتا تھا، ولیم اینگ ڈاہل کے نزدیک بے نظیر بھٹو کا قتل پاکستان کے حوالے سے امریکی پلان B کا حصہ تھا، واشنگٹن پاکستان کے اندر اسپیشل ٹاسک فورس کی تعیناتی کی اجازت کا کافی دنوں سے منتظر تھا اور اُس نے اِس حوالے سے پاکستان پر کافی عرصے سے دباؤ ڈالا تھا۔ اِسی امریکی دباؤ کا ایک حصہ بے نظیر بھٹو کو پاکستانی حکومت کے خلاف کھڑا کرنا تھا۔ بالآخر پاکستانی حکومت نے امریکی دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور امریکی سپیشل فورس کو پاکستان کے اندر قیام کی اجازت دے دی گئی۔ امریکی پلان B کے تحت طے تھا کہ اگر حکومت پاکستان کے اندر امریکی سپیشل فورسز کی تعیناتی کی اجازت دے دے تو امریکہ بے نظیر بھٹو سمیت تمام جمہوری قوتوں کو کنارے لگا دے گی اور جمہوریت کی بساط بچھائی جانے سے پہلے ہی لپیٹ دی جائے گی۔

28 دسمبر کو بے نظیر بھٹو کے قتل کے ایک دن بعد ہی امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ایک اہم معاہدے کے تحت امریکی سپیشل ٹاسک فورسز پاکستان میں قیام کے دوران دہشت گردوں سے نبٹنے والی فورسز کو جدید تربیت فراہم کریں گی۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق پاکستان میں تعینات کئے جانے والے خصوصی دستے ”کاؤنٹر ٹیررازم یونٹ“ کو پاکستانی کمان کی بجائے براہ راست امریکی سینٹرل کمانڈ اور یو ایس اسپیشل آپریشنل کمانڈ کے تحت رکھا جائے گا۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق پاکستانی حکام اِس امر کی تردید کرتے ہیں کہ امریکی کاؤنٹر ٹیررازم یونٹ کو براہ راست امریکی کمانڈ کے تحت رکھا جائے گا۔ امریکی انٹیلی جنس کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ولیم اینگ ڈاہل کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی موت سے پاکستانی سیاست میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے بھرنے والا کوئی بھی قابل اعتماد اور بھروسے مند رہنما اب میدان سیاست کے اُفق پر موجود نہیں، جو پاکستانی قوم کی قیادت کرے۔ ایسے میں نظریہ آرہا ہے کہ اب پاکستانی حکومت کے خلاف عوام احتجاج کیلئے سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ اِس صورتحال میں پاکستان میں امریکی مداخلت کا خطرہ برقرار رہے گا۔

لندن سے شائع ہونے والے عربی اخبار ’الشرق الاوسط‘ نے ”باكستان: منطلق حرب عالميته ثالثته!“ (پاکستان تیسری عالمی جنگ کا نقطہ آغاز) کے عنوان سے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ ”بے نظیر بھٹو کے قتل سے بظاہر امریکہ کے پاکستان کے اندر منصوبے کو دھچکا لگا ہے جس کے تحت وہ آئندہ انتخابات میں مشرف بے نظیر اتحاد کی شکل میں پاکستان میں ایک لبرل حکومت تشکیل دینا چاہتا تھا، اِس طرح وہ پاکستان کی عسکری قوت کو اسلام پسندوں کے خلاف کھڑا کرکے لبرل سیاسی اتحاد کے ذریعے پاکستان میں جمہوریت کو ایک نئی شکل دینا چاہتا تھا مگر بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد صورتحال یکسر بدلتی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ امریکہ کی نظریں ایک بار پھر صدر مشرف کی جانب لگ چکی ہیں اور صدر بش نے ایک بار پھر اِس بات کا اعلان کیا ہے کہ مشرف امریکہ کے ”اہم اتحادی“ ہیں۔ حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے جارہے ہیں۔ 2008ء مزید امتحانات کے ساتھ ملک وقوم کے سروں پر مسلط ہوچکا ہے۔ قوم ایک امتحان کے بعد دوسرے امتحان کی حالت میں ہے۔

اُدھر پیپلز پارٹی کی قیادت نے موروثی سیاست کے تسلسل کو برقرار رکھ کر بلاول زرداری کو بلاول بھٹو زرداری کے نام سے پاکستان پیپلز پارٹی کا نیا چیئر مین بنایا ہے۔

عوام کو اِس وقت مہنگائی کے طوفان میں پھنسا دیا گیا ہے۔ عالمی ساہوکاروں کا یہ فارمولا ہمیشہ سے ایک رہا ہے کہ جب عوام کو سیاسی حقوق سے باہر رکھنا ہو تو اُنہیں روٹی پانی کے چکر میں ڈال دیا جائے۔ یہ فارمولا مشرف انتظامیہ کے تحت پاکستان میں کامیابی سے جاری ہے۔ قوم کی گندم دو سو ڈالر فی ٹن کے حساب سے باہر فروخت کردی گئی۔ بعد میں چھ سو ڈالر ٹن کے حساب سے امپورٹ کی گئی، کسی نے اِس منافع بخش تجارت کا سبب نہ پوچھا اور نہ ہی یہ بتایا گیا کہ کس کس نے اِس میں ہاتھ رنگے ...... جو قوم کی ساری چینی پی گئے اور اربوں کے قرضے معاف کرا بیٹھے، اُن کی شکلیں روز عوام اخبارات میں یہ دعویٰ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ ”خوشحالی“ کیلئے دوبارہ ہمیں ووٹ دیں“ 1999ء کے آخر میں کسی نے کہا تھا کہ:

”جلد وہ دور پاکستان میں لایا جارہا ہے جب لوگ روٹیاں چھیننے کیلئے بندوقیں نکال لیں گے“ ...... خاکم بدہن یہ دور اب گھروں کی دہلیز پر محسوس ہوتا ہے......

شاید ہمارا خاندان دنیا میں قربانیاں دینے کیلئے آیا ہے

بینظیر کی کتاب ''دخترِ مشرق'' سے ایک اقتباس

شاہنواز بھٹو کے قتل کے بعد جب میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو میری والدہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا:

> ''پنکی! تم ہرگز واپس نہیں جاؤ گی۔ میں پہلے ہی اپنے بیٹے شاہنواز سے محروم ہو چکی ہوں۔ اب میں اپنی بیٹی کو کھونا نہیں چاہتی'' میں نے والدہ سے کہا ''شاہنواز نے میرے لئے بہت کچھ کیا، مگر میں کبھی اُسے نہ پوچھ سکی کہ میں اُس کیلئے کیا کر سکتی ہوں۔ کافی عرصہ پہلے جب وہ لاڑکانہ آیا تھا تو مجھ سے پوچھتا تھا کہ بابا کو کہاں دفنایا گیا ہے۔ مجھے وہاں لے چلو۔ میں اُن کے مزار کی تصویر بنانا چاہتا ہوں''

مجھے یاد ہے کہ 21 اگست 1985ء کو میں شاہنواز کی میت لے کر پاکستان آئی تھی۔ ضیاء الحق کی حکومت نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اجازت دے دی تھی کہ ہم شاہنواز کو لاڑکانہ میں دفن کر سکیں۔ ضیاء حکومت کو چونکہ اندیشہ تھا کہ اِس موقع پر لوگ جذباتی ہو کر ہنگامہ آرائی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اُنہوں نے کراچی سے موہنجوڈرو بذریعہ پرواز میت لے جانے کی اجازت دی۔ ضیاء حکومت چاہتی تھی کہ شاہنواز کو فوری طور پر عجلت میں سپردِ خاک کر دیا جائے مگر حکومت کو معلوم نہ تھا کہ جس بچے کو وہ عجلت میں دفنانا چاہتی ہے، دنیا میں اُس کی کس قدر مقبولیت تھی۔ اِس 27 سالہ نوجوان کی موت پر دنیا کے اہم ممالک کے سربراہان نے تعزیت کی۔ شاہنواز کی آخری رسومات میں شرکت کیلئے لوگ ہزاروں موٹر سائیکلیں، ٹرکوں اور اونٹ گاڑیوں پر سوار ہو کر آئے۔ پیدل آنے والوں کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اِس موقع پر شاہنواز کی بڑی بڑی تصاویر بھی سینکڑوں میل پیدل چل کر آنے والوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ اِس سے پہلے ہمارے خاندانی مولوی نے شاہنواز کو غسل دیا تھا جس کے بعد میں نے اپنے گھریلو ملازمین سے کہا تھا کہ وہ شاہنواز کی میت کو ڈرائنگ روم میں لائیں تاکہ وہاں موجود رشتہ دار اُس کی مغفرت کیلئے دُعا کر سکیں۔ آخر وہ لمحات بھی آ گئے جب میں نے شاہنواز کو خدا حافظ کہنا تھا۔

یہ لمحات بڑے دردناک تھے۔ جب ایمبولینس اُس کی میت لے کر جانے لگی تو میں دوڑ کر اُس کے پیچھے گئی اور ملازمین سے کہا کہ وہ کچھ دیر کیلئے شاہنواز کو واپس لائیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا چھوٹا اور پیارا بھائی اتنی جلدی مجھ سے جدا ہو جائے۔ بالآخر جب اُس کی ایمبولینس گیٹ کے قریب سے گزری تو وہاں کھڑی سوگوار خواتین نے اُس کیلئے با آواز بلند دُعا کی اور پھر میرا بھائی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری نظروں سے اُوجھل ہو گیا۔ بعد میں سوچتی ہوں کہ آخر ہمارے خاندان کے افراد ہی ظلم کا شکار کیوں بنتے ہیں۔ میرے باپ کو برداشت کیا گیا، نہ میری والدہ کو برداشت کیا گیا۔ اگر ماضی سے حال تک ایک نظر ڈالوں تو ہمارا خاندان ہمیشہ آزمائشوں کی چکی میں پستا رہا۔ شاید میرا خاندان قربانیاں دینے کیلئے ہی پیدا ہوا ہے۔

سکارٹ لینڈ یارڈ کی رپورٹ

حکومت پاکستان کے سابقہ مؤقف کی تصدیق کر دی

بینظیر بھٹو کے قاتل شاید ہی بے نقاب کئے جا سکیں

بی بی سی

سابق وزیرِ اعظم بینظیر بھٹو کے المناک قتل کی تفتیش کرنے والی برطانوی اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم نے اپنی رپورٹ جاری کر دی ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم نے اپنی رپورٹ میں حکومت پاکستان کے سابقہ مؤقف کی تصدیق کی ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی موت گولی لگنے سے نہیں بلکہ بم دھماکے کی شدت کی وجہ سے سر گاڑی کی چھت سے ٹکرانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ایڈیشنل آئی جی پنجاب چوہدری عبدالحمید نے راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس میں یہ رپورٹ جاری کی۔ 3 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ کے مطابق ''بینظیر بھٹو کی موت ان کے سر میں آنے والے زخم سے ہوئی اور یہ زخم دھماکے کی شدت کے باعث ان کا سر گاڑی کی چھت سے ٹکرانے سے آیا، بم دھماکے میں انتہائی شدت آمیز دھماکا خیز مواد استعمال کیا گیا تھا، حملہ آور بینظیر بھٹو کی گاڑی سے صرف ایک دو میٹر کے فاصلے پر تھا، گولی چلانے اور خودکش بم دھماکا کرنے والا ایک ہی شخص تھا۔ بینظیر بھٹو کے سر میں گولی کے نشان کے کوئی شواہد نہیں ملے، اسکاٹ لینڈ یارڈ کی یہ رپورٹ' وزارتِ داخلہ کو پیش کئے جانے سے ایک دن قبل ایک امریکی اخبار میں شائع ہو چکی تھی۔ اخبار نے اس رپورٹ کی اشاعت کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے بغیر اور جائے وقوع کو دھو دیے جانے کے بعد ان کی ہلاکت کے بارے میں کیسے نتیجہ اخذ کر لیا گیا؟ اسی اخبار نے اعتراف کیا ہے کہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی رات' وزارتِ داخلہ کے ایک اہلکار نے اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر سرکاری خبر رساں ادارے کو بتایا تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت خودکش حملہ آور کی طرف سے چلائی گئی گولی سے ہوئی جوان کی گردن میں لگی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی اول دن سے بینظیر کے قتل کی اقوام متحدہ کے ذریعے تحقیقات کرانے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ وہ اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کو خط بھی لکھ چکی ہے۔ ملک اور بیرون ملک اس سانحے کے بارے میں غیر جانبدارانہ تفتیش پر پولیس اور حکومتی اداروں پر کوئی بھی اعتبار نہیں کر رہا ہے۔ جس طرح اس سانحے کے شواہد کو ضائع کیا گیا ہے اس سے حکومت اور بالخصوص صدر جنرل پرویز مشرف پر لوگوں کی انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ وزارت داخلہ اور پولیس کے ترجمان کے متضاد اور غیر ذمہ دارانہ بیانات کی وجہ سے صدر جنرل پرویز مشرف نے سانحہ لیاقت باغ کی تفتیش میں مدد کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم و معاونت کی دعوت دی اور اس مقصد کے لیے صدر جنرل پرویز مشرف نے براہ راست برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن کو ٹیلی فون کر کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم کو تفتیش میں معاونت کے لئے

پاکستان بھیجنے کی درخواست کی۔ آصف علی زرداری نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی تفتیشی ٹیم کی معاونت کو مسترد کر کے اقوام متحدہ کے ذریعے رفیق حریری کی طرز پر تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا اور وہ اس پر قائم ہیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کا اصرار ہے کہ محترمہ کو گولی مار کر شہید کیا گیا ہے اور گولی چلانے والے کی تصویریں بھی اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ بعض امریکی اخبارات نے تو یہ رپورٹ بھی شائع کی ہے کہ محترمہ کے قتل میں کمانڈوز کا ہاتھ ہے اور اس سانحے کے دو دن بعد روس کے صدر پیوٹن کو رپورٹ پیش کی گئی تھی جس کے مطابق پہلے بے نظیر کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا اور اس کے بعد شواہد مٹا دیئے گئے اس سے تمام اشارے حکمرانوں کی طرف جا رہے ہیں۔ اب اسکاٹ لینڈ یارڈ نے ایک مشتبہ رپورٹ کے ذریعے پاکستانی پولیس کے مجہول جواز کی تصدیق کی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بے نظیر کا قتل ایک عالمی سازش کا حصہ ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری نے وائس آف امریکہ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی پاکستان واپسی ایک عالمی معاہدے کے نتیجے میں ہوئی تھی اور بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد اب وہ معاہدہ ختم ہو گیا ہے بے نظیر بھٹو نے وطن واپس لوٹنے سے قبل ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں جو بیانات دیئے تھے ان کے متعلق آصف علی زرداری نے کہا کہ یہ موجودہ حکومت ہے جس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو صفائی کا کوئی موقع نہیں دیا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ پاکستان کے عوام کریں گے۔ پارٹی الگ سے کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ بے نظیر بھٹو کے قتل کے بارے میں شواہد کو ضائع کرنے میں برطانوی حکومت کی شمولیت سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اس سانحے کی ذمہ داری سے عالمی قوتیں بری نہیں ہو سکتیں۔

صدر جنرل پرویز مشرف اور بے نظیر بھٹو مرحومہ کے درمیان سمجھوتا کرانے میں برطانیہ کی حکومت کا بھی خاص کردار ہے۔ محترمہ مسلسل یہ کہہ رہی تھیں کہ ان کو پاکستان میں قتل کر دیا جائے گا۔ ان کی واپسی کے موقع پر بم دھماکے میں ڈیڑھ سو سے زائد شہری ہلاک کر دیے گئے اور وہ بال بال بچ گئیں تھیں لیکن بالآخر ان کی جان لے لی گئی۔ اس رپورٹ کے بعد برطانوی تفتیشی ادارے کی ساکھ مزید مجروح ہو گئی ہے۔ اس سے قبل شہزادی ڈیانا کی پراسرار حادثے میں ہلاکت کی ذمہ داری برطانیہ کی خفیہ ایجنسی پر عائد کی جاتی رہی ہے اور برطانوی پولیس لیڈی ڈیانا کے قتل کے بارے کوئی حقیقی تفتیش نہیں کر سکی ہے۔ حساس اور سیاسی شخصیات کے قتل کے بارے میں آج تک کسی بھی ملک کے تفتیشی اداروں نے کوئی بھی ذمہ دارانہ رپورٹ مرتب نہیں کی ہے۔ جب مسئلہ عالمی سیاست کا ہو تو ایسے تمام حساس قتل کے شواہد مٹا دیئے جاتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے حقیقی قاتلوں کو چھپانے کے عمل میں پاکستان کی حکومت کے ساتھ برطانیہ اور امریکہ کی حکومتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ پاکستان کی حکومت اور اس کے سیکورٹی کے ادارے امریکی دہشت گردی کی نام نہاد جنگ کے اتحادی ہیں۔ یہ جنگ ایسی پراسرار جنگ ہے جس کا ہدف صرف اور صرف مملکت پاکستان کی آزادی وخودمختاری کا خاتمہ ہے۔ چند دن قبل ایک امریکی سفارت کار پراسرار حالت میں قتل کر دیا گیا اس قتل کے ذمہ داروں کی کوئی تفتیش نہیں کی گئی۔ پاکستان میں قید برطانیہ کو مطلوب ملزم راشد رؤف فرار ہو گیا اور اس کے بارے میں بھی برطانیہ نے کوئی شور نہیں مچایا اور پاکستان کی سیکورٹی کے اداروں نے بھی خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ جب ایک پاکستانی صحافی نے اس کے بارے میں سوال کیا تو جنرل پرویز مشرف مشتعل ہو گئے۔

اسی طرح ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کراچی میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہیں لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ اور برطانوی حکومت اس بارے میں بھی پراسرار خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ ان رپورٹس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے قاتلوں کے تحفظ میں عالمی قوتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ دریں اثناء بی بی سی کے مطابق اسکاٹ لینڈ یارڈ کی یہ رپورٹ کہ بینظیر کی ہلاکت گولی لگنے سے نہیں بلکہ بم دھماکے کی شدت سے واقع ہوئی بیشتر اخبارات میں شہہ سرخیوں سے شائع ہوئی ہے۔ وہاں اکثر اخبارات نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ قتل کی وجہ جاننے سے کہیں زیادہ اہمیت قاتلوں کی نشاندہی کرنا ہے۔ شریک چیئرمین آصف علی زرداری اور ان کے ساتھیوں کے مطابق بے نظیر کے قتل کی وجہ معلوم کرنا ثانوی معاملہ ہے انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنانے والوں کی نشاندہی کرنا زیادہ ضروری ہے۔ بی بی سی کے مطابق یہ سب کچھ معلوم کرنے کا اختیار سکاٹ لینڈ یارڈ کے تفتیش کاروں کے اختیار اور دائرہ کار سے باہر تھا۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے مطابق حکومت نے جان بوجھ کر سکاٹ لینڈ یارڈ تفتیش کاروں کا دائرہ کار محدود کر کے بینظیر کی جانب سے صدر مشرف کو لکھے گئے خط میں جن چار افراد کی نشاندہی کی انہیں بچانے کی کوشش کی ہے۔ صدر مشرف نے تفتیش مکمل ہونے سے پہلے ہی کئی بار کہہ دیا تھا کہ بینظیر کے قتل میں بیت اللہ محسود کا ٹولہ ملوث ہے۔ اس کے بعد حکومت اور طالبان میں صلح اور فائر بندی کے اعلانات سامنے آ گئے۔ کیا اب پھر یہ سوال نہیں اٹھتا کہ صدر مشرف بینظیر کے قاتلوں سے معاہدہ کر رہے ہیں؟ وسیع تر قومی مفاد میں حکومت اور بیت اللہ محسود کا معاہدہ ہوتا ہے تو کیا انہیں شامل تفتیش کیا جا سکے گا۔ قتل چاہے لیاقت علی خان ہوں، ضیاء الحق یا مرتضیٰ بھٹو کا، تحقیقاتی کمیٹیوں اور کمشنوں کی رپورٹس کبھی سامنے آئیں نہ قاتلوں کی نشاندہی ہوئی۔ پاکستانی تفتیش کاروں کی اس روایت سے یہی خدشہ ہے کہ بینظیر کے قاتل بھی شاید ہی بے نقاب کیے جا سکیں۔ ضیاء الحق نے کہا تھا کہ اسٹیبلشمنٹ کو بھٹو کی قبر مہنگی پڑے گی، اب بھی کچھ لوگ کہہ رہے ہے کہ زندہ بینظیر کی نسبت مرحومہ بینظیر اسٹیبلشمنٹ کو بھاری پڑے گی۔

بقیہ بھٹو اور نہرو خاندان میں موازنہ

نہرو کے خاندان کی ہے۔ اُنکے تمام خاندان کو بھی بیدردی سے ختم کیا گیا تھا۔ اندرا گاندھی بھی دو دفعہ وزیراعظم بنیں، اُنہیں اُنکے سکھ باڈی گارڈز نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ اُن کا بڑا بیٹا سنجے گاندھی ہوائی جہاز کے پراسرار حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اُن کے چھوٹے بیٹے راجیو گاندھی نے وزیراعظم بن کر ملک اور گاندھی خاندان کی باگ دوڑ سنبھالی تو اُن کو بم دھماکے میں مار دیا گیا۔ اُنکے بعد اُنکی بیوہ سونیا گاندھی کانگریس پارٹی چلا رہی ہیں۔ وہ اپوزیشن لیڈر رہونے کے ساتھ ممبر آف پارلیمنٹ بھی ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بیٹے راہول گاندھی کو نہرو خاندان کی وارثت سنبھالنے کیلئے تیار کر رہی ہیں۔ اندرا گاندھی اور بے نظیر دونوں عالمی اہمیت کی حامل سیاست دان رہیں۔ دونوں دو دو مرتبہ وزیراعظم منتخب ہوئیں اور دونوں کو ہی گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ بھارت میں اندرا گاندھی کا پوتا راہول گاندھی سیاسی میدان میں اپنے خاندان کا جھنڈا گاڑنے کیلئے سرگرم ہے جبکہ پاکستان میں بھٹو خاندان کی سیاسی میراث آصف علی زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے بیٹے بلاول بھٹو زرداری کے سپرد کر دی گئی ہے۔

☆☆

بے نظیر بھٹو کی شہادت کی تحقیقات مکمل؟

پانچ گرفتار ملزمان نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے بیت اللہ محسود نے قاری اسمعیل کو 4 لاکھ روپے دیئے

ملزم عبدالرشید ایروناٹیکل کمپلیکس کامرہ میں میزائل حملہ کا ماسٹر مائنڈ تھا

بیت اللہ محسود اپنی وارداتوں کا ہمیشہ اعتراف کرتا رہا ہے مگر اس نے بے نظیر پر حملہ کا اعتراف نہیں کیا

پیپلز پارٹی نے اس رپورٹ کے برعکس کہا ہے کہ ابھی تحقیقات شروع ہی نہیں کی جاسکیں

تفتیشی ٹیم نے بے نظیر بھٹو کے قتل کا جو جواز فراہم کیا ہے وہ بہت معنی خیز ہے

رپورٹ: مون ڈائجسٹ

حکومت پاکستان نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے کیس کو یہ کہہ کر لپیٹ دیا ہے کہ اِس کیس میں شامل تمام کردار گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ جوائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم کے سربراہ ایڈیشنل انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی پنجاب چوہدری عبدالمجید نے ایک پریس بریفنگ میں یہ کہا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات مکمل ہوگئی ہیں، پانچ گرفتار ملزمان نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے، بیت اللہ محسود نے قاری اسماعیل کو چار لاکھ روپے دیئے اور قاری نے پانچ افراد کو محترمہ بے نظیر بھٹو پر حملہ کیلئے راولپنڈی بھیجا۔ بے نظیر بھٹو کو مختلف شہروں میں نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ چوہدری عبدالمجید کے مطابق بے نظیر بھٹو قتل کیس میں ملوث عبدالرشید ایروناٹیکل کمپلیکس کامرہ میں میزائل حملہ کرنے کا ماسٹر مائنڈ بھی تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ بیت اللہ محسود نے اِس سے قبل کسی اور شخص کو پچاس ہزار روپے، خودکش حملے کی جیکٹس اور دیگر سہولتیں فراہم کیں لیکن وہ حملہ نہ کرسکا جس پر بیت اللہ محسود نے قاری اسماعیل کو جو مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک سے تعلق رکھتا تھا، اُسے چار لاکھ روپے دیئے اور بے نظیر بھٹو کو نشانہ بنانے کا ٹاسک دیا۔ بیت اللہ محسود نے اُسے بتایا کہ بے نظیر امریکی ایماء پر پاکستان آرہی ہیں، منتخب ہونے کی صورت میں وہ طالبان اور مجاہدین کو کچل دے گی۔ شریعت کے مطابق ملک پر عورت کی حکمرانی نہیں ہونی چاہیے لہٰذا اُسے ہلاک کردیا جائے جس پر قاری اسماعیل نے سعید عرف بلال اور اکرام اللہ کو خودکش جیکٹس سمیت راولپنڈی بھجوا دیا۔ اُن کے ساتھ تین دیگر افراد بھی تھے جو منصوبے پر عمل درآمد میں معاونت کررہے تھے۔ تحقیقاتی ٹیم کے سربراہ نے بتایا کہ طالبان کمانڈر بیت اللہ محسود اور دیگر ملزمان کو عدالت سے اشتہاری ملزم قرار دلوانے کیلئے کاروائی کی جارہی ہے۔

تحقیقاتی ٹیم کی تحقیقات کے مطابق قتل کی اِس واردات کے پیچھے بیت اللہ محسود کا ہاتھ ہے اور اُسی نے قاری اسماعیل کو چار لاکھ روپے دے کر یہ خصوصی مشن سونپا۔ عوامی حلقوں کیلئے یہ امر حیرت کا باعث ہے کہ اگرچہ اب گرفتاریوں اور تحقیقات کی تکمیل کے بعد بیت اللہ محسود اِس ساری واردات کا منصوبہ ساز ثابت ہوا مگر واردات کے فوراً بعد ہی وزارت داخلہ کے ترجمان کی طرف سے بیت اللہ محسود کو ذمہ دار ٹھہرانے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، تاہم اِس صورتحال کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ بیت اللہ محسود نے ہمیشہ اپنی کاروائیوں کا اعتراف کیا ہے، بے نظیر بھٹو قتل کیس کے معاملے میں اُس نے اپنے ملوث ہونے کا مسلسل انکار کیا ہے۔ ساری کہانی اِن کرداروں کے بیانات کے گرد گھومتی ہے جنہوں نے تفتیشی ٹیم کے سامنے اعترافات کیئے۔ تفتیشی ٹیم کے سامنے دیئے جانے والے بیانات کس حد تک حقائق کے عین مطابق ہیں، اِس بارے میں فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا.

اِس قتل کا جو جواز فراہم کیا گیا، وہ معنی خیز ہے۔ تفتیشی ٹیم کے مطابق بیت اللہ محسود نے قاری اسماعیل پر واضح کیا کہ بے نظیر بھٹو اپنے منتخب ہونے کی صورت میں طالبان کو کچل دیں گی، وہ امریکی ایماء پر پاکستان آرہی ہیں، اِس لئے اُنہیں ہلاک کردیا جائے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کے بارے میں تو محض خدشہ تھا کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد طالبان کو کچل دیں گی مگر دوسری طرف مسلم لیگ (ق) کے دورِ حکومت میں تو عملاً طالبان کو کچلنے کے اقدامات کیئے گئے۔ اسلام آباد کی لال مسجد میں ہونے والا فوجی آپریشن اِسی سلسلے کی ایک کڑی تھا لیکن بیت اللہ محسود اور اُس کے ایجنٹوں نے کبھی مسلم لیگ (ق) کی شخصیات کو اپنے ہدف پر نہیں رکھا۔ اِسی تناظر میں اِس قتل کا جو جواز فراہم کیا گیا ہے، وہ اِس حد تک مضبوط نہیں ہے کہ اِس پر یقین کیا جاسکے جبکہ بیت اللہ محسود کا مسلسل انکار بھی بہت سے سوالات اور شبہات کو جنم دے رہا ہے۔

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ جب تک بیت اللہ محسود کا اصل موقف وضاحت کے ساتھ سامنے نہیں آتا، اُس وقت تک سوالات اور شک وشبہ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ اُس نے تحقیقات مکمل کرلی ہے اور متعلقہ کرداروں کو گرفتار کرلیا ہے لیکن اِس کے برعکس پیپلز پارٹی کے حلقوں کا کہنا ہے کہ ابھی تک درست سمت میں تحقیقات شروع نہیں کی جاسکیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قتل کی یہ واردات بھی پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے المناک قتل کی تحقیقات کی طرح ہمیشہ ایک معمہ ہی بنی رہے گی؟

☆☆

بھٹو اور نہرو خاندان میں موازنہ!

پاکستان اور بھارت کی سیاست میں دو ایسے خاندان ہیں جن کا اپنے اپنے ملک کی سیاست میں اہم کردار رہا ہے۔ پاکستان میں بھٹو اور بھارت میں نہرو خاندان نے اپنے مشن کی راہ میں زندگیوں کی قربانیاں دیں۔ بھٹو اور نہرو نے اپنی بیٹیوں کی سیاسی تربیت بڑی دانشمندی سے کی۔ نہرو کو جب جیل میں ڈالا گیا تو اُنہوں نے اندرا گاندھی کی سیاسی تربیت اپنے خطوط کے ذریعے کی۔ اِسی طرح بھٹو نے بھی جیل میں رہنے کے دوران بے نظیر کو وقتاً فوقتاً خطوط لکھے۔ اُن کے ایک خط میں اُنہوں نے بے نظیر کو لکھا کہ میں تم کو نہرو کی طرح جیل میں بیٹھا خط لکھ رہا ہوں لیکن میرے اور نہرو کی قید کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ انگریزوں کی قید میں تھے۔ اِسکے باوجود اُن کو جیل میں لائبریری کے علاوہ تمام سہولتیں میسر تھیں مگر میں اپنے ہی ملک کی فوج کی جیل میں قید ہوں لیکن کسی قسم کی بھی سہولت سے محروم ہوں۔ میں جیل کی کوٹھری میں بند ہوں اور مجھے آسمان دیکھے ہوئے کئی ہفتے گزر چکے ہیں۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایسا ملک ہے جہاں صرف ہوس زدہ لوگ ہی اقتدار میں رہ سکتے ہیں، یہاں نیک نیت لوگوں کی صلاحیتوں کو بری طرح کچل دیا جاتا ہے۔ یہ خطوط بعد ازاں ”ڈاٹر آف دی ایسٹ“ میں بھی شائع ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی زندگی عوام کی خدمت میں صرف کی۔ اُنہوں نے سیاسی کیریئر بڑی کامیابی سے شروع کیا۔ اُن کے نعرے روٹی کپڑا اور مکان نے غریب عوام کے دل و دماغ فتح کر لئے لیکن یہ سب کچھ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ 1977ء میں چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور اُن کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اُنہوں نے جیل میں رہتے ہوئے اپنی بیٹی بینظیر کو خطوط لکھے اور اِن میں اُس کی سیاسی تربیت کرنے کی کوشش کی۔ اُس وقت محترمہ صرف 24 برس کی تھیں، بھٹو کی پھانسی کے بعد اُن کی جانشینی کا بوجھ اُن کے جوان کندھوں پر آ پڑا۔ تاہم اُنہوں نے مختصر مدت میں دانش مندی، حوصلہ اور جرات سے پارٹی کے تمام اُمور سنبھال لئے۔ اِسی دوران اُن کے بھائی شاہنواز بھٹو کو زہر دے کر مار دیا گیا، اُن کے دوسرے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو نے بیرون ملک الذوالفقار کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس نے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کے خلاف کام کیا تاہم مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے بعد اُنہیں اُنکی بہن کے دور حکومت میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ محترمہ دو بار وزارت عظمیٰ کے اہم عہدے پر فائز رہیں۔ اُنہوں نے پاکستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر 1998ء میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کی۔ اُنہوں نے قریباً ساڑھے نو برس کے بعد 18 اکتوبر 2007ء کو خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے اپنے وطن کا رخ کیا تو اُنکا والہانہ استقبال کیا گیا۔ ائیر پورٹ پر اُترتے ہی اُنکی آنکھیں بھر آئیں اور اُنہوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ پاکستان پہنچتے ہی اُن پر پہلا قاتلانہ حملہ کیا گیا مگر وہ بال بال بچ گئیں۔ تاہم 27 دسمبر اُن کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا۔ ایسی ہی کہانی پنڈت

باقی صفحہ 127 پر

اہم پاکستانی شخصیات پر حملوں کی تاریخ

تین صدور اور تین وزرائے اعظم پر قاتلانہ حملے ہوئے

قیام پاکستان سے اب تک 60 سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اِس دوران تین صدور اور تین وزرائے اعظم سمیت اہم سیاسی شخصیات پر قاتلانہ حملے ہوئے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک صدر اور ایک وزیر اعظم اپنے دور حکومت میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ سب سے پہلے وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان 16 اکتوبر 1956ء کو راولپنڈی میں ایک جلسہ عام کے دوران نامعلوم فرد کی گولی لگنے سے اِس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

صدر جنرل ایوب خان کو 8 نومبر 1968ء کو پشاور یونیورسٹی میں ایک فائرنگ کے نتیجہ میں ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اِس حملہ میں محفوظ رہے۔ صدر جنرل ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو طیارے کے ایک حادثے میں خالق حقیقی سے جا ملے جبکہ آج تک طیارے کی تباہی کی وجوہات سامنے نہ آ سکیں۔ اِس حادثہ میں بعض اعلیٰ فوجی افسران سمیت امریکی سفیر بھی اِس دنیا سے رخصت ہوئے۔ میر مرتضیٰ بھٹو 20 ستمبر 1996ء کو نامعلوم افراد کی فائرنگ کا نشانہ بنے۔ میاں نواز شریف پر بھی لاہور میں ایک قاتلانہ حملہ ہوا جب رائے ونڈ جاتے ہوئے اُن کے راستے میں بم بلاسٹ کیا گیا مگر وہ محفوظ رہے۔ صدر جنرل پرویز مشرف پر دسمبر 2003ء میں یکے بعد دیگرے دو انتہائی خطرناک حملے ہوئے مگر وہ اِن میں معجزانہ طور پر بچ گئے۔

اُن پر پہلا حملہ 14 اور دوسرا 25 دسمبر کو ہوا۔ وزیر اعظم شوکت عزیز پر بھی 30 جولائی 2004ء کو انتخابی مہم کے دوران ایک قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ محفوظ رہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی طویل جلاوطنی کے بعد وطن واپسی کے موقع پر 18 اکتوبر 2007ء کو ہونے والے خودکش حملہ میں وہ معجزانہ طور پر محفوظ رہیں جبکہ اِس حملہ میں 150 کے قریب پارٹی کارکنان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور اب 27 دسمبر 2006ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کے بعد واپسی پر ایک خودکش حملہ اور فائرنگ کا نشانہ بن گئیں اور اِس کے نتیجہ میں وہ شہید ہو گئیں اور اِسے پاکستان کی تاریخ کا المناک سانحہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس کے علاوہ بھی متعدد اہم سیاسی و مذہبی رہنماؤں پر قاتلانہ حملے ہوتے رہے ہیں جن میں اہم شخصیات اِن دہشت گردانہ حملوں کا شکار ہوتی رہی ہیں۔

محترمہ بینظیر بھٹو کی مختصر سوانح عمری

وہ واحد سیاستدان ہیں جنہوں نے 88ء میں گیارہ سالہ آمریت کا خاتمہ کیا

ان کی زندگی کے ابتدائی دن 70 کلفٹن کراچی میں ان کی رہائش گاہ میں گزرے

محترمہ بے نظیر بھٹو واحد سیاستدان تھیں جنہوں نے 1988ء میں 11 سالہ آمریت کا خاتمہ کر دیا تھا وہ دیگر سیاستدانوں سے یکتا ولاثانی رہیں۔ اندرون ملک انہوں نے نچلے طبقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا تو بیرون دنیا بلخصوص عالم مغرب میں بھی وہ ایک پسندیدہ سیاستدان کے طور پر جانی جاتی تھیں انتخابی مہم میں وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ مخالفین کو قائل کرنے کی خوبیوں سے وہ مالا مال تھیں۔ آمنے سامنے کی ملاقات میں بھی وہ رعب دار معلوم ہوتی تھیں اس حوالے سے ان کا موازنہ مارگریٹ تھیچر سے کیا جاتا حالانکہ وہ ان سے زیادہ مضبوط اعصاب کی مالک تھیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ پاکستان میں جتنی ہردلعزیز تھیں۔ اس سے کہیں زیادہ بیرون دنیا میں مشہور تھیں۔ دنیا کے بہترین اخبارات اور جرائد ہمیشہ ان سے مختلف بین الاقوامی امور پر رائے طلب کرتے۔ پیپلز میگزین کے مطابق وہ دنیا کی پچاس خوبصورت ترین خواتین میں سے ایک تھیں ان کی مالیاتی پالیسی نے ملک کو مشکل صورتحال سے باہر نکالا اور بجٹ خسارہ میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی جس کی وجہ سے عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک نے پاکستان کو مالیاتی بحران سے صحت یابی کے پروانے جاری کیے۔ ان کے دور میں بیرونی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا اور یہ توقعات جنم لینے لگیں کہ پاکستان میں اقتصادی ترقی کا ایک نیا دور بہت جلد شروع ہو جائے گا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا بہت جلد تصادم کی سیاست کا ایک بار پھر آغاز ہوا اپوزیشن کے ساتھ تعلقات کار خراب ہوئے۔ محترمہ اگر کسی چیز میں خصوصی دلچسپی لیتی تھیں تو وہ خارجہ پالیسی تھی۔ اسے پاکستان کی

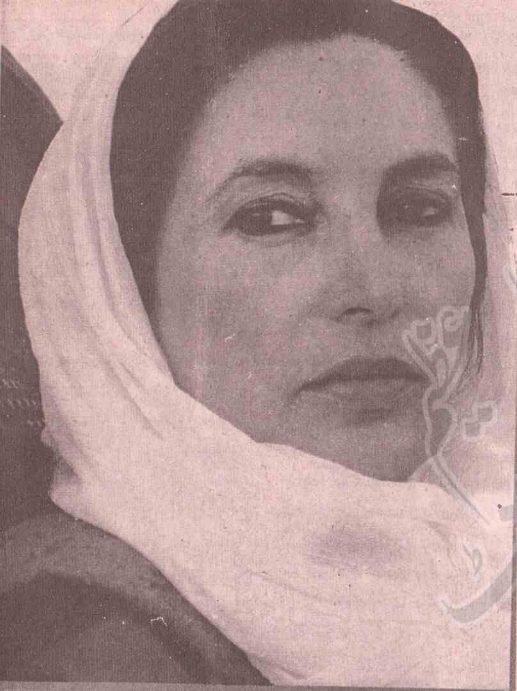

تاریخ میں سب سے زیادہ بیرونی دورے کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اگرچہ ان کے ان دوروں سے بیرون دنیا ان کی شہرت اور نیک نامی میں خاصا اضافہ ہوا۔ بے نظیر کا تعلق اس خاندان سے رہا جو اندرون سندھ بڑا جاگیردار تصور کیا جاتا ہے۔ 1958ء کی زرعی اصلاحات سے قبل اس خاندان کا شمار سندھ کے بڑے جاگیردار خاندانوں میں ہوتا تھا۔ مرحومہ کی زندگی کے ابتدائی شب و روز 70 کلفٹن کراچی میں ان کی رہائش گاہ پر گزرے ان کی پرورش ایک انگریز گورنس کے ذمے تھی۔ بچپن سے ہی وہ حاکمانہ طبیعت کی مالکن تھیں اور اکثر اپنے چھوٹے بھائیوں پر اپنی مرضی نافذ کرنے کیلئے کوشاں رہتیں۔ محترمہ بھٹو خاندان کی پہلی خاتون تھیں جنہوں نے کبھی برقع نہیں اوڑھا۔ بے نظیر کا دعویٰ تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو سب سے زیادہ محبت اسی سے کیا کرتے تھے اور شاید مرتضیٰ بھٹو اور نصرت بھٹو سے ان کی تصادم کی یہی وجہ تھی۔ دس سال کی عمر میں انہیں مری بھیج دیا گیا۔ 1965ء کی جنگ میں وہ مری ہی میں مقیم تھیں۔ تاشقند معاہدہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے 1967ء مین پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے پاکستان بھر کے غریبوں اور ستم زدہ عوام کے دلوں کی آواز بن گئے۔ اس وقت بے نظیر 14 سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوئیں۔ دو سال بعد وہ تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے کیلئے بیرون ملک چلی گئیں۔ 8 سال بعد انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو سے ان کی پھانسی سے چند ساعت قبل ملاقات کی لیکن اس ملاقات میں وہ اپنے والد کے گلے تک نہ مل سکیں کیونکہ درمیان میں آہنی گرل حائل تھی۔ بے نظیر نے کہا تھا کہ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو سے گلے ملنے کیلئے حکام کی بڑی منت سماجت کی تھی لیکن کسی نے ان کی فریاد نہیں سنی۔ ہم ایسے عالم میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے کہ ہم نے ایک دوسرے کو چوما تک نہیں۔ میں روئی بھی نہیں تھی کیونکہ والد نے مجھے اس سے منع کیا تھا۔ جنرل ضیاء کے خلاف جدوجہد شروع کرنے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ نصرت بھٹو نے زیادہ تر وقت جیل میں گزارا یا پھر لاڑکانہ میں اپنی جاگیر میں المرتضیٰ پر نظر بندی کے عالم میں۔ جنرل ضیاء الحق نے 1984ء میں انہیں لندن جانے کی اجازت دی جہاں انہوں نے پیپلز پارٹی کی تنظیم نو کی اور آئندہ انتخابات کیلئے تیاری کا آغاز کیا۔ الذوالفقار کی طرف سے 1981ء میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن کے طیارے کو ہائی جیک کرنے کے بعد جنرل ضیاء نے اسے پیپلز پارٹی کے خلاف آپریشن کا بہانہ بنایا اور بے نظیر کو مجبور کیا کہ وہ اپنے بھائیوں سے دور رہے پھر 1989ء میں شاہنواز کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔ اکتوبر 1993ء میں مرتضیٰ بھٹو نے اپنی جلاوطنی کے خاتمے اور دمشق سے وطن واپسی کا اعلان کیا۔ اس وقت یہ اندازے لگائے جا رہے تھے کہ مرتضیٰ بھٹو بڑی تعداد میں رائے دہندگان کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں گے لیکن حیران کن طور پر انتخابات میں وہ صوبائی اسمبلی کی صرف ایک نشست ہی جیت سکے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو جب نومبر 1993ء میں شام سے پاکستان واپس آئے تو انہیں دہشتگردی کے الزامات کے تحت گرفتار کیا گیا۔ ستمبر 1996ء ایک میں پولیس مقابلے میں مرتضیٰ بھٹو جاں بحق ہوئے۔ اسی سال اقتصادی بحران کی وجہ سے محترمہ بے نظیر بھٹو ان کی پارٹی بکھر گئی اور صدر فاروق لغاری نے ان کی حکومت برطرف کی۔ حکومت کی برطرفی کے بعد ان کے شوہر آصف زرداری کو بدعنوانی کے الزامات میں اندر کیا گیا جبکہ بے نظیر بھٹو ملک سے باہر چلے جانے میں کامیاب ہوئیں اور انہوں نے دبئی اور لندن سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس دوران انہیں متعدد مقدمات

ہ بھی سامنا کرنا پڑا۔ جنرل مشرف نے آخر کار ابوظہبی میں ان کے ساتھ مذاکرات کیۓ اگر چہ ان مذاکرات کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا لیکن ان سے مرحومہ کی وطن واپسی کی راہ ہموار ضرور ہوئی۔ ان کے خلاف بدعنوانی کے چار جز ختم کیۓ گئے لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کی تو زندگی ہی ختم ہونے والی ہے۔

بے نظیر بھٹو نے اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی توقعات کے عین مطابق اپنی طلسماتی شخصیت اور اعلیٰ سیاسی بصیرت کے بل بوتے پر بھٹو خاندان کا نام زندہ رکھا۔ وہ نہ صرف قابل سیاست دان تھیں بلکہ بہترین لکھاری بھی تھیں۔ اُنہوں نے اپنی پہلی کتاب ''فارن پالیسی اِن پرسپیکٹیو'' اور دوسری کتاب 1989ء میں ''ڈاٹر آف دی ایسٹ'' لکھی۔ اِن دونوں کتابوں کو عالمی شہرت ملی اور اُنکی قلمکاری کا اعتراف بھی کیا گیا۔ اِسکے علاوہ وہ دنیا کے مختلف شہرہ آفاق اداروں میں انٹرنیشنل تعلقات، عالمی سیاست اور جنوبی ایشیاء میں پاکستان کی جغرافیائی اہمیت، افغانستان، چین اور ایران اور بھارت میں طاقت کے توازن سمیت کئی اہم موضوعات پر لیکچرز دے چکی ہیں۔ اُن کی قابلیت کو امریکہ، یورپ اور ایشیائی ممالک قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

وہ پہلی ایشیائی خاتون تھیں جنہیں باوقار ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا سربراہ بننے کا موقع ملا۔ اِسکے علاوہ پیپلز میگزین نے اُنہیں پچاس خوبصورت خواتین کی فہرست میں شامل کیا اور لبرل انٹرنیشنل ۔ نے اُنہیں آزادی کا ایوارڈ دیا۔ ملکی سیاست کے علاوہ اُنہوں نے 38 کے قریب عالمی اداروں سے اعزازی ڈگریاں حاصل کیں۔ اِسکے علاوہ وہ عالمی کانفرنسوں میں متعدد بار شرکت بھی کر چکی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو 1976-77ء میں فارن یونیورسٹی میں طلبا یونین کی صدر بھی رہیں۔

بے نظیر بھٹو نے اپنی زندگی میں سیاسی مصیبتوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اُن کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد اُن کو اور اُنکی والدہ نصرت بھٹو کو اُنکے گھر میں اٹھارہ ماہ کیلئے نظر بند کر دیا گیا۔ اُنہوں نے ساری مشکلات کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ اُنہوں نے ضیاء دور میں جلاوطنی کی زندگی گزاری تو اِس دوران بھی مارشل لا کے خلاف جدوجہد کرتی رہیں، ایم آر ڈی کی تحریک کو اُن کی شمولیت سے جلا ملی اور ضیاء الحق ملک میں غیر جماعتی انتخاب کروانے پر مجبور ہو گئے تاہم پیپلز پارٹی نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ 1988ء میں صرف 35 برس کی عمر میں اُنہیں مسلم دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم بننے کا اعزاز ملا تھا۔ چند روز قبل ایک ویب سائٹ پر بے نظیر بھٹو دنیا کی گیارہ قابل ترین خواتین میں دوسرے نمبر پر آئیں۔

اقوال زریں

☆ ضمیر کی عدالت دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہے۔

☆ علم ایک لازوال دولت ہے جسے کوئی چُرا نہیں سکتا۔

☆ ہر مسکراتا ہوا چہرہ اندر سے خوش نہیں ہوتا۔

☆ بہترین دوست وہ ہے جو نیکی کی طرف بلائے۔

☆ ماں کے بغیر یہ کائنات نامکمل ہے

مرسلہ: سلیم اختر ساحلی، لاہور

اہم حکومتی شخصیات مجھے قتل کرانے کے درپے ہیں

تین افراد میرے قتل کے ذمہ دار ہوں گے جن میں سابق فوجی جنرل بھی شامل ہیں

اگر مجھے قتل کیا گیا تو اس کے ذمہ دار صدر پرویز مشرف ہوں گے

ہم موت سے نہیں ڈرتے عوام کی طاقت سے دہشت گردوں کو شکست دیں گے

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو کا اپنے ترجمان کو خط

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو نے حکومت کو خبردار کیا تھا کہ مجھے قتل کرنے کے لیے خود کش حملہ آوروں کا گروہ تشکیل دیا جا چکا ہے جو کسی بھی وقت مجھ پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ انہوں نے دو ماہ قبل امریکہ میں اپنے ترجمان مارک سیگل کو لکھے گئے خط میں بھی کہا تھا کہ اگر میں قتل ہوئی تو اس کے ذمہ دار صدر پرویز مشرف ہوں گے۔ انہوں نے اس بات کا بھی واضح الزام لگایا تھا کہ حکومت کے اندر کچھ لوگ ان کے قتل کے ذمہ دار ہوں گے جبکہ کراچی کے بعد بلاول ہاؤس میں پریس کانفرنس کے دوران انہوں نے کہا تھا کہ تین افراد میرے قتل کے ذمہ دار ہوں گے جن میں سابق فوجی جنرل بھی شامل ہیں سانحہ کراچی کی ایف آئی آر میں بھی انہوں نے اس بات کا تذکرہ کیا اور کہا تھا کہ صدر مشرف کو یہ نام بتا دیۓ گئے ہیں ان میں ایک نام آئی بی کے ڈی جی بریگیڈیئر ریٹائرڈ اعجاز شاہ کا تھا جبکہ چوہدری شجاعت حسین نے کہا تھا کہ صدر مشرف کو بتائے گئے دوسرے ناموں میں چوہدری پرویز الٰہی کا نام بھی ہے جبکہ تیسرا نام نیب کے سابق ڈائریکٹر جنرل حسن وسیم کا تھا۔ یہ تمام نام صدر مشرف کے قریبی ساتھیوں کے ہیں۔ بعد ازاں بے نظیر بھٹو نے صدر مشرف کے نام ایک خط میں سانحہ کراچی کی تحقیقات کیلئے برطانیہ اور امریکی اداروں کی مدد حاصل کرنے کا بھی مطالبہ کیا تھا اور کہا کہ انہیں پاکستان کے تحقیقی اداروں پر اعتماد نہیں۔ صدر پرویز مشرف نے 25 اکتوبر کو ارا کین پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اعجاز شاہ ایک قابل افسر ہیں انہیں ہٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی 18 اکتوبر کے سانحے کی تحقیقات کیلئے غیر ملکیوں کی مدد لی جائے گی۔ صدر مشرف کے اس بیان کے بعد تحقیقات کے حوالے سے حکومت اور پیپلز پارٹی میں بظاہر ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا تھا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھی 18 اکتوبر کے دھماکوں کی غیر جانبدار تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا۔ بے نظیر بھٹو نے دو ماہ قبل اپنے امریکی ترجمان مارک سیگل کو بھی ایک خط لکھا تھا کہ اگر مجھے قتل کیا گیا تو اس کے ذمہ دار صدر پرویز مشرف ہوں گے۔

بینظیر بھٹو کی زندگی کا مذہبی اور روحانی پہلو

بینظیر بھٹو سیاسیات معاشرت، سماجیات اور مذہب پر گہری سوچ رکھنے والی خاتون تھیں

بینظیر جب پنجاب آتیں تو سب سے پہلے

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار پر حاضری دیتیں

وہ جب ضلع لاڑکانہ تشریف لے جاتیں تو درگاہ حسینؒ آباد میں

حضرت پیر سید غلام حسین شاہ غفاری کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتیں

رضا عبدالفتاح عباسی

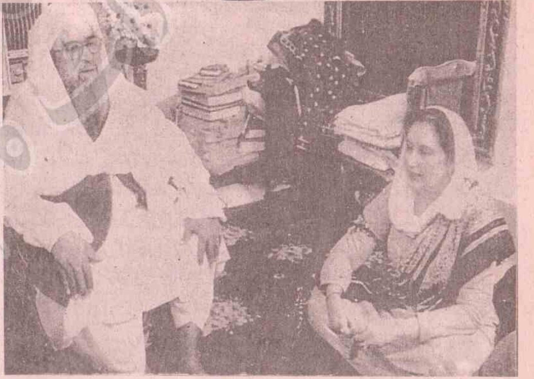

بے نظیر بھٹو پیر سید غلام حسین شاہ غفاری کی خدمت میں حاضری دے رہی ہیں

بینظیر بھٹو آکسفورڈ اور کیلیفورنیا میں پڑھی مگر وہ اسلامی شعار سے کبھی دور نہ ہوئی

سندھ کی امن والی دھرتی پر کتنے عظیم انسانوں، درویشوں، صوفیائے کرام اور اللہ لوگ ہستیوں نے جنم لیا ہے اور اُن کے بتائے ہوئے پیغام اور تبلیغ کے باعث آج بھی سندھی قوم عدم تشدد کی حامی

بنی ہوئی ہے اور ہر دور اور ہر وقت میں انتہا پسندی اور تنگ نظری کے خلاف ہر محاذ پر مخالفین کو شکست دیتی رہی ہے۔ سندھ کی دھرتی سے جنم لینے والے صوفیائے کرام نے ہمیشہ امن اور آشتی کا سبق دیتے ہوئے پوری دنیا میں سچے انسان کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں کبھی بھی کسی بھی صورت میں انتہا پسندی، دادا گیری، دہشت گردی اور بدامنی کو قبول نہیں کیا گیا ہے۔ تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے تو وادی سندھ پانچ ہزار سالہ قدیم تہذیب وتمدن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس تہذیب کے حامل مختلف ادوار میں صوفی شاہ عنایت شہید، سچل اور سامی، بھٹائی اور قلندری کے روپ میں سامنے آتے رہے ہیں۔ اِسی دھرتی سے کبھی ذوالفقار علی بھٹو جنم لیتا ہے تو کبھی شہید بے نظیر بھٹو جنم لیتی ہے کے کردار اور طریق کار مختلف اور ایک دوسرے سے جدا ضرور ہیں مگر تمام کا سبق وہی تھا کہ سندھ کی دھرتی سمیت پورے عالم کی ترقی، بھلائی اچھائی کو عام کرنا اور انسانیت کی خدمت تھا۔ اِسی سندھ کی دھرتی سے جنم لینے والی ایک بین الاقوامی لیڈر اور برصغیر کی تاریخ میں سب سے پہلی مسلمان عورت کا وزیراعظم ہونا بڑے اعزاز کی بات ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو، سیاست، معاشرت، سماجیات، مذہب، صوفیا کا رنگ اور سوچ رکھنے والی خاتون تھی۔ اُن کی سوچ اور انداز ماڈرن اور ہائی لیول فیملیز سے وابستہ تھی، وہ ہر قوم اور زبان والوں کے ساتھ رہی اور ہر کارکن، عہدیدار، امیر غریب، وزیر، مشیر، صدر اور مختلف ممالک کے بادشاہوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اِسی خیال اور شاید سوچ پر کھڑی ہوگئی کہ باتوں، سیاست، مذاہب کا سبق اور پیغام یہی ہے کہ انسانیت کی خدمت کی جائے۔ اِسی میں دنیا کی اور آخرت کی تمام بھلائیاں جمع ہیں۔

بزرگوں اور نیک لوگوں کے مزاروں پر حاضری دینا
اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنا انہیں بہت عزیز تھا

اُنہوں نے جیل بھی دیکھی، جلاوطنی کے درد کو بھی محسوس کیا۔ اپنے والدین کی محبتوں سے محرومی بھی دیکھی، اپنے دو نوجوان بھائیوں کی موت کو بھی برداشت کرنے کی کوشش کی۔ تمام سختیوں اور تکالیف سے گزرنے کے بعد اُنہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ موت تو کسی بھی جگہ آسکتی ہے تو پھر کیوں نہ میں جلاوطنی میں زندگی گزارنے سے عوام کے درد اور تکالیف کے پاس رہوں۔ اِس کے بعد وہ ظالموں، جابروں اور اُن کے ساتھیوں کی موت کی دھمکیوں کی پروا کرنے کی بجائے موت سے آنکھیں ملا کر میدان میں نکل پڑی۔ پھر وہ نہ صرف سیاست کے میدان میں بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنے لاکھوں پرستار چھوڑ گئیں بلکہ ہر ایک شعبے، قوم اور ممالک کو روتا چھوڑ گئی۔

بے نظیر بھٹو جب سندھ میں جلاوطنی کے بعد 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں آتی ہے تو لاکھوں عوام کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر کھڑا ہوجاتا ہے۔ پورے ملک میں عید کا سماں ہے۔ خطرناک سانحہ کراچی کے بعد بھی تین دن کے اندر بہادر باپ کی بہادر بیٹی کراچی کے ہسپتالوں میں کارکنوں کی عیادت کرنے کے بعد پھر کارکنان کے شہید ہونے پر

فاتحہ خوانی کیلئے لیاری سے لانڈھی تک چھوٹی چھوٹی گلیوں میں جاتی ہے اور بہادری کا ثبوت دیتی ہے۔

یہاں تک ہی نہیں بلکہ بے نظیر بھٹو سرکار حضرت قلندر لعل شہبازؒ کے دربار پر حاضری دیتی ہے اور لاڑکانہ میں آتی ہے تو اپنے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو کی طرح سندھ کے کامل ترین بزرگ ہستی حضرت پیر سیّد مٹھا سائیں کی درگاہ پر حاضری عقیدت سے دیتی ہے۔

پنجاب کے دورے پر جاتی ہے تو سب سے پہلے لاہور میں عظیم ہستی حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ اور جب اسلام آباد کے گولڑہ شریف میں آتی ہے تو پھر حضرت مہر علی شاہ اور جب قمبر تحصیل لاڑکانہ میں درگاہ حسین آباد میں آتی ہے تو پھر حضرت پیر سیّد غلام حسین شاہ غفاری کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے۔ وہاں پر محترمہ بے نظیر بھٹو بزرگ سائیں سے دعا مانگنے کے بعد عرض کرتی ہے مگر اپنے لئے نہیں بلکہ ملک کی خوشحالی، ترقی اور استحکام کیلئے اور سائیں کی خدمت میں عرض کرتی ہے کہ سائیں مجھے کوئی ورد عنایت فرمائیں جس پر بزرگ سائیں نے گڑھی خدا بخش بھٹو میں صحافیوں کو بتایا کہ ”میں نے محترمہ سے کہا کہ ”آپ پیارے آقا سراپا نور حضرت محمدؐ پر کثرت سے درود وسلام پڑھا کریں، دونوں جہانوں میں اجر وثواب ملتا رہے گا۔ درگاہ پر نعت سننے کے بعد محترمہ کے آنسو نہیں رکے اور روتی رہیں۔ یہ عشق کی بات ہے اور وہ دو مرتبہ وزیراعظم پاکستان رہنے والی عظیم عورت، نیکی، پرہیزگاری اور تقویٰ کی باتیں سننے کے بعد خواہش ظاہر کرتی ہے کہ ”میں تبلیغ قرآن وسنت کی

ایک ماڈرن اور ہائی لیول فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ سر پر دوپٹہ اوڑھ کر رکھتیں

بے نظیر بھٹو روضہ رسول پر حاضری دے رہی ہیں

عالمگیر غیر سیاسی تحریک دعوت اسلامی کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس عطار قادریؒ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ نہ صرف اتنا بلکہ بے نظیر بھٹو شہید لندن کے دورے پر جاتی ہے تو وہاں پر تحریک منہاج القرآن کے علامہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری سے ملاقات کرتی ہیں اور اُن کی تقریر سننے کے بعد تحریک میں ممبر شپ فارم جمع کرا کے ممبر بن جاتی ہے۔ ہائی ماڈرن طبقے سے وابستہ ہونے والے بے نظیر بھٹو شہید ہمیشہ ذکر اللہ کا ورد کرتی رہتی ہیں۔ عمران جتوئی نے بتایا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو آٹھ سالہ جلاوطنی کے بعد بڑی مذہبی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ کھانے کی میز جو دوسری جانب تھی، اُس کو کعبۃ اللہ کی طرف کیا اور کھانے کے دوران کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے کھاتی تھی۔ 21 دسمبر عید کے دن محترمہ اپنے پرندوں کی معلومات کیلئے نوڈیرو کے بنگلے میں انگلیوں پر گنتی کرتی ہیں۔ پیر سائیں محمد عبدالغفار ثانی، حاجی منور علی عباسی، محمد ایاز سومرو اور محمد انور بھٹو سے اور وہاں کے دکھی ستائے ہوئے عوام سے عید کے دوسرے دن یعنی 23 دسمبر شہادت سے چار دن قبل اپنے والد، اپنے بھائیوں کیلئے مسلسل دو گھنٹوں تک فاتحہ خوانی، قرآن پاک کا پڑھنا اور پھر لاڑکانہ سٹیڈیم میں تقریر سے قبل دل ہی دل میں قرآن پاک کی آیتیں پڑھ رہی ہیں اور پھر تقریر کیلئے اُٹھتی ہیں اور ہمیشہ دشمنوں سے بچاؤ کیلئے بازوؤں پر امام ضامن ''یا علی'' کا اسم مبارک باندھے رکھتی ہیں۔ یہ سب باتیں سیاست نہیں ہیں۔

سیاست کا میدان تو بے نظیر بھٹو شہید کا ایک وسیع میدان ہے۔ لیکن اُن کا اُٹھنا بیٹھنا، نماز، روزے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھنا، اللہ والوں، نیک بندوں، بزرگوں سے دعائیں لینا اور اُن کے آگے عاجزی اور نیاز سے پیش آنا کتنی بڑی خوبی کہی جاسکتی ہے۔ ورنہ وہ دنیا کے ہر خطے میں رہی آکسفورڈ اور کیلی فورنیا کی یونیورسٹیوں میں پڑھی ہے۔ اُسکے خیالات اور سوچ کتنی وسیع ہوگی۔ اِس کے علاوہ بھی وہ کبھی بھی اِن نیک بندوں اور درگاہوں سے دور نہیں رہی بلکہ سب سے پہلے وہ اپنی درگاہوں، مزارات پر پھول نچھاور کرتی رہتی تھی۔ ہمیشہ اُس کے سر پر دوپٹہ یعنی پردے کا اہتمام کرنا اور ہر دوسرے بزرگ کی زیارت اور درگاہ پر جانا اپنا کامل ایمان سمجھتی تھی۔

☆☆☆☆

گائے گی دنیا گیت میرے
روشن پاکستان
روشن پاکستان
مشہورِ عالم لطیف سرمہ پراڈکٹس
لطیف
کُحل
سرمہ
رانجہ
سکھ چین سادہ
قیمت 10 روپے
ترکِ عینک
قیمت 15 روپے
حکیم عبداللطیف
پاکستان میں ہر جنرل سٹور اور میڈیکل سٹور سے دستیاب ہے
لطیف یونانی فارمیسی رجسٹرڈ
نقالوں سے ہوشیار رہیں
لطیف
کُحل
سرمہ
رانجہ
ممیرہ ترک عینک
قیمت 15 روپے
سرمی سپیشل
قیمت 10 روپے
تیار کردہ: لطیف یونانی فارمیسی رجسٹرڈ
فیض باغ لاہور
فون: 7283072, 6276524 فیکس: 6260675

شادی کیلئے آصف علی زرداری کا انتخاب بے نظیر بھٹو کا درست فیصلہ تھا

آصف علی زرداری محترمہ کیلئے ہمیشہ متحرک، فعال اور پرخلوص جدوجہد کرتے رہے ہیں

شادی کے استفسار پر بے نظیر نے کہا تھا کہ ''مجھے سے شادی کسی آدمی کیلئے اعزاز نہیں بلکہ ایک ڈراؤنا خواب ہے''

بے نظیر کا مؤقف تھا کہ میری زندگی سیاسی ہے عام نہیں اور سیاست میرا مقصد حیات ہے میں اس نظریہ حیات کے ساتھ کسی خانگی زندگی کی قیدو بند میں نہیں پڑسکتی

ضیاء دور کے مارشل لاء احکامات نے آصف علی زرداری کو زمینداری سے بیزار کردیا تھا

آصف علی زرداری بے نظیر کی تمام تر مشکلات کو سمجھتے ہوئے پرعزم رہے

شادی طے ہونے پر بے نظیر بھٹو نے آصف علی زرداری کو ایک پن کا تحفہ دیا

شہید بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کی زندگی کا ایک دلچسپ اور خلوص بھرا باب

''آصف علی زرداری'' حاکم علی زرداری کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ اُن کے علاوہ اُن کی تین بہنیں ہیں۔ اُن کا نمبر تیسرا ہے۔ یعنی اُن سے دو بڑی بہنیں ہیں اور ایک اُن سے چھوٹی ہیں۔ نواب شاہ (صوبہ سندھ) اُن کا آبائی علاقہ ہے۔ کراچی گرائمر سکول سے سینئر کیمبرج کیا۔ بعد ازاں کیڈیٹ کالج ''پٹاور'' سے اچھی پوزیشن میں گریجوایشن کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں لمبا سا مفلر گلے میں لٹکائے رکھنا اُن کی

خاص عادت تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے آصف علی زرداری لندن چلے گئے۔ چونکہ بزنس (کاروبار)

میں دلچسپی رکھتے تھے۔ لہٰذا لندن سنٹر آف اکنامک اینڈ پولیٹیکل سٹڈیز سے بزنس ایڈمنسٹریشن کا ڈپلومہ حاصل کیا۔

ڈگری کورس چار سالہ تھا۔ وقت کی کمی کے باعث اُنہوں نے ایک سالہ ڈپلومہ پر اکتفا کیا۔ آصف علی زرداری ''سینٹ پیٹرک'' میں زیر تعلیم رہے جہاں روزنامہ جنگ کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ''شکیل الرحمٰن اُن کے کلاس فیلو تھے۔ لندن میں وہ تقریباً عرصہ ڈیڑھ سے دو سال رہے۔ وہاں پر اُن کا ذاتی گھر تھا جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اِس گھر میں اُس وقت ''جام صادق علی'' بھی رہائش پذیر رہے۔ بعد میں یہ رہائش آصف علی زرداری کے والد نے ''جام صادق علی'' کو کچھ کم قیمت کے عوض فروخت کردی۔ یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''آصف علی زرداری چونکہ حاکم علی زرداری کے اکلوتے بیٹے ہیں اور پھر روپے پیسہ کی کوئی کمی نہ تھی لہٰذا اُن کے والد گرامی نے فیصلہ کیا کہ آصف علی زرداری لاڈ پیار اور پیسہ کی فراہمی کی وجہ سے بگڑ نہ جائیں۔ اُن کے بہتر مستقبل اور تعلیم و تربیت کیلئے ''بورڈنگ'' میں داخلہ کراویا تھا۔ جس ''بورڈنگ'' میں آصف علی زرداری رہے۔ وہاں کی زندگی مختلف تھی۔ انتظامی اُمور خاصے سخت تھے۔ قواعد وضوابط کا پابند رہنا پڑتا تھا اور ڈسپلن کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہی تعلیم و تربیت اُن کی بہترین تعلیمی کامیابیوں کی وجہ بنی۔

لندن ایک روایتی مقام ہے۔ سٹوڈنٹ لائف میں وہاں اتنا وقت میسر نہیں آتا کہ غیر نصابی سرگرمیوں میں شمولیت کی جائے۔ البتہ جس ادارہ تعلیم میں آصف علی زرداری طالب علم تھے، وہ بین الاقوامی نوعیت رکھتا تھا جسکی وجہ سے مختلف ممالک ایران، ترکی، امریکہ، انڈونیشیا غرض دنیا بھر کے طالب علم وہاں موجود ہوتے تھے۔ وہاں پر ملکی وغیر ملکی طالب علم اُن کے دوست بن گئے۔ آصف علی زرداری کو سیاحت کا بہت شوق تھا اور جب بھی اُنہیں موقع میسر آتا، وہ کویت، پیرس، کوپن ہیگن اور سویڈن چلے جاتے اور اِس طرح وہ اپنے شوق سیاحت کی تکمیل کرتے۔

یورپ کے لیڈنگ ملک میں رہتے ہوئے آصف علی زرداری ''بولڈ'' مزاج نہیں تھے۔ عام انسانوں کی طرح رہتے تھے۔ گھوڑوں سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور ہر وقت وہ اِس تلاش میں رہتے کہ رائیڈنگ کا موقع میسر آجائے۔ طالب علمی کے زمانہ میں نہ تو کبھی اپنے ملک میں اور نہ ہی دیارِ غیر میں اُنہیں روپے پیسے سے دلچسپی رہی یا احساس رہا کیونکہ اُن کے گھرانے کا شمار دولت مند گھرانوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ بورڈنگ میں تھے تو اُنکے والد گرامی کی پوری انڈسٹری تھی۔ اُن کے ذاتی بمبینو، اسکالا اور سینما ہاؤس تھے۔ فلم ایگزی بیوٹر، ڈسٹری بیوٹر اور پروڈیوسرز بھی تھے۔ بعد میں اُنہوں نے سینما ہاؤس وغیرہ بیچ دیئے۔

آصف علی زرداری نہ تو حساب کتاب رکھنے کے عادی تھے اور نہ ہی بچت کرنے کے۔ عالم نوجوانی میں فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ چارلس اور صوفیہ لارین اُن کو پسند تھے۔ اُنہوں نے اُردو اور سندھی کی لاتعداد فلموں کی پروڈکشن بھی کی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آصف علی زرداری نے عملی زندگی کا آغاز زمینداری سے کیا۔ ''ڈھورا بھائی جان میر پور'' جہاں اُنکی زمینیں تھیں۔ یہ علاقہ ''مین روڈ'' سے تقریباً35 کلومیٹر دور تھا۔ اگرچہ لندن اور سندھ کے نواحی علاقے میں زندگی یکسر مختلف ہے لیکن آصف علی زرداری نے نہایت استغراق سے عرصہ ''پانچ سال'' اپنے فارم پر

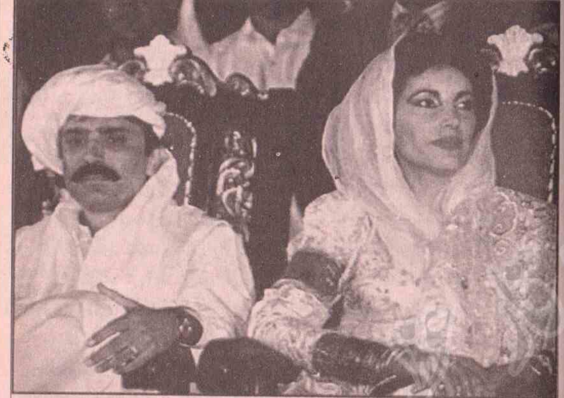

کام کیا۔

لندن کی آب وہوا، آزادانہ زندگی و ماحول پھر سندھ کے نواحی علاقے میں ایک ”فارم“ پر کام کرنے کو ترجیح دینا خاصا کٹھن ودشوار فیصلہ تھا۔ حالانکہ اُن کی ایک آنٹی لندن میں مقیم تھیں۔ اُنہوں نے آصف علی زرداری کو لندن میں کاروبار کی پیشکش کی لیکن آصف علی زرداری نہ مانے۔ اُن کی دادی ایرانی تھیں اور اُن کے خاندان کا تعلق ایران سے تھا جو ”لندن سٹیل“ تھا لیکن آصف علی زرداری کو اپنی مشکل زندگی میں زیادہ کشش نظر آئی۔

ضیاء الحق دور کے مارشل لا احکامات سے اُن کی زمینوں پر پانی بند کر دیا گیا جس کی وجہ سے کھیتی باڑی میں بہت مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اِن مشکلات نے آصف علی زرداری کو زمینداری سے بیزار کر دیا اور وہ 1984ء میں کراچی منتقل ہو گئے اور کنسٹریشن کا کام شروع کر دیا۔ اِس کام کو اُنہوں نے خاصی مہارت سے شروع کیا اور بہت سی کامیابیاں حاصل کیں۔ فارغ اوقات میں سوئمنگ، سکوائش، پولو اور رائیڈنگ اُنکے پسندیدہ مشغلے تھے۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو مذکورہ تمام کھیل بالخصوص رائیڈنگ سے انسان کے اندر ایک نیا جوش وولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ رائیڈنگ سے اُنکی جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ بچپن میں نواب شاہ سے اُن کیلئے ”گھوڑا“ آیا کرتا تھا اور نوکر اُنہیں گھوڑے پر بٹھا کر چکر لگوایا کرتے تھے۔

فرمانبرداری اور عملی زندگی میں سنجیدگی اور کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے والدین اور بالخصوص بہنوں کا آصف علی زرداری کی شادی کیلئے اسرار شروع ہو گیا لیکن آصف علی زرداری ہر مرتبہ موضوع کو بدلنے میں کامیاب ہو جاتے۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ وہ والدین کی مرضی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اُن کے والد گرامی ”حاکم علی زرداری“ نے شادی پر زور دیا اور پسند بھی پوچھی تو آصف علی زرداری نے ”محترمہ بے نظیر بھٹو“ کا نام لئے بغیر اشارے کنائے سے بتا دیا۔ آصف علی زرداری کی والدہ کی فرسٹ کزن کی شادی ”شہید ذوالفقار علی بھٹو“ کے بڑے بھائی سے ہوئی تھی۔ اِس طرح تھوڑی یا زیادہ رشتہ داری بھی نکل آئی اور والدین کی رضامندی وخوشی کی سبیل بھی۔

”بقول بے نظیر بھٹو“ ایک دن آصف علی زرداری کی والدہ نے کلفٹن کے لاؤنج میں محترمہ سے کہا، آصف علی زرداری سے شادی تمہیں (محترمہ) کو ایک نئی سمت ملے گی جسکے جواب میں ”محترمہ“ نے کہا کہ مجھ سے شادی درحقیقت کسی آدمی کیلئے اعزاز نہیں بلکہ ڈراؤنا خواب ہے۔ میری سیاسی زندگی عام نہیں ہے۔ مجھے یہ سہولت نہیں کہ پانچ سال تک سکون سے الیکشن کا انتظار کروں۔ میری سیاست کا تعلق آزادی سے ہے اور سیاست میرا مقصد حیات ہے۔ ایک آدمی کے اُس وقت کیا محسوسات ہوں گے؟ جب اُسے معلوم ہوگا کہ اُسکی بیوی کی زندگی اُسکے گرد نہیں گھومتی۔ آصف علی زرداری کی والدہ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ایک پُرعزم اور بھروسہ کرنے والا نوجوان ہے۔ وہ سب سمجھتا ہے کہ اُسکی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

محترمہ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ مجھے سفر کرنا پڑتا ہے اور میں ہمیشہ ”شوہر“ کو ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ اُنہوں نے یہ کہا کہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے آصف علی زرداری بھی ہر وقت

ساتھ نہ رہ سکے گا۔ پھر میں نے سنا ہے کہ اُنہیں پارٹیوں میں جانا پسند ہے اور وہ کافی سوشل ہیں جبکہ میرے پاس جو تھوڑا وقت بچتا ہے، میں اپنی چند دوستوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتی ہوں…… آصف علی زرداری کی والدہ نے سادگی سے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں جب شادی ہو جاتی ہے تو آدمی بیوی اور فیملی کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتا ہے۔ محترمہ نے جواب میں اپنے آپ کو یہ کہنے سے روکے رکھا کہ عورت کو نئی سمت کیلئے شادی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حوصلہ افزائی ہوتے دیکھ کر محترمہ نے گہرا سانس لیا اور بات کا رُخ سب سے مشکل موضوع کی طرف موڑ دیا کہ روایت کے مطابق سسرال کے ساتھ رہنا پڑتا ہے لیکن بوجوہ میں سسرال کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ گھر میں دن رات پارٹی اور سیاسی نوعیت کے اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ سیاسی کارکن ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ اِس لئے مجھے اپنے گھر کی ضرورت ہے۔

آصف علی زرداری کی والدہ نے ناقابل یقین انداز میں کہا کہ ”مجھے قبول ہے“ اور آصف علی زرداری کو بھی اعتراض نہیں ہوگا اور بہنیں بھی اِن مصروفیات سے الگ رہنا پسند کریں گی…… بالآخر دسمبر 1987ء کو آصف علی زرداری کی شادی محترمہ بے نظیر بھٹو سے طے پا گئی۔

قبل ازیں آصف علی زرداری نے ”محترمہ بے نظیر بھٹو“ کو بچپن میں انگریزی فلم ”ڑدا گویا مائلے“ کے پریمئر شو پر دیکھا تھا۔ یہ 1960ء کے اواخر کی بات ہے۔ بعد ازاں 1980ء کے شروع میں شادی کے متعلق بات چیت کا آغاز ہوا تو اُسکے پانچ سال بعد 85-1984ء میں کراچی میں محترمہ بے نظیر بھٹو سے ایک ڈنر پر ملاقات ہوئی۔ پھر اُن کی آنٹی نے لندن بلایا اور کہا کہ ”محترمہ“ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ اُن دنوں آصف علی زرداری کا گھوڑا پولو گراؤنڈ میں دورانِ کھیل دوسرے کھلاڑی کے گھوڑے سے ٹکرا گیا۔ اِس ”ایکسیڈنٹ“ سے اُن کی ٹانگ میں شاید فریکچر ہو گیا۔ وہ جلد صحت یاب نہ ہو سکے اور تقریباً دو ماہ بعد خاصی ایکسرسائز اور علاج سے وہ لندن جانے کے قابل ہوئے۔

تاہم اِس ملاقات سے آصف علی زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے درمیان سیاسی عزم اور آئندہ لائحہ عمل زیر بحث رہے اور اِسکے بعد منگنی ہوئی اور باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ شادی طے ہونے پر محترمہ بے نظیر بھٹو نے آصف علی زرداری کو ایک پن کا تحفہ دیا اور آصف علی زرداری نے سفائر اور ڈائمنڈ (ہیرے) کی انگوٹھی محترمہ بے نظیر بھٹو کو دی۔

(شادی کی چند جھلکیاں اور تبصرے)

☆ دسمبر 1987ء میں جب شادی ہوئی تو ایک کارکن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ”میں آج کیوں نہ آتا، یہ عوام کی شہزادی کی شادی ہے اور اُنکے مجازی خدا کی شخصیت کیسی ہے؟ جسکا اثر پاکستان پیپلز پارٹی کا سیاسی مستقبل مشروط ہو گئے ہیں“

☆ ہانگ کانگ کے ایک نامور ”انگریزی جریدے“ نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ ”بے نظیر بھٹو“ اپنی شادی کے موقع پر اپوزیشن کی بنیادی علامت نہیں تھیں بلکہ ایک مسرور دلہن تھیں۔ اُنکے شوہر (آصف علی زرداری) کی شخصیت ڈیشنگ (بہت پُراثر) تھی۔ اگرچہ اُس رات دلہا (آصف علی زرداری) کچھ بے اطمینانی محسوس کر رہے تھے۔ اِس تقریب میں پچاس ہزار افراد نے شرکت کی۔ رپورٹ میں مزید لکھا کہ ”اگرچہ دولہا دولہن (آصف

محترمہ) دونوں کی عمر 34 , 34 برس ہے۔ محترمہ سیاسی عزم رکھتی ہیں جبکہ زرداری صاحب دولت مند تاجر اور پولو کے شوقین ہیں۔ جریدے نے یہ بھی لکھا ہے کہ آصف علی زرداری محترمہ کی زندگی کا خلا پُر کردیں گے اور آصف علی زرداری کا کہنا ہے کہ وہ گھریلو زندگی میں اُنکا ساتھی بنیں گے تاکہ وہ سیاست میں پُرسکون انداز سے کام کرسکیں۔

☆ آصف علی زرداری کی دعوت ولیمہ میں مرحوم خان عبدالولی خان نے بطور خاص شرکت کی۔ عوامی نیشنل پارٹی کی رہنما بیگم نسیم ولی خان اپنی علالت کی وجہ سے نہ پہنچ سکیں۔ خان عبدالولی خان کی اے این پی (عوامی نیشنل پارٹی) کے رہنما کی حیثیت سے شادی میں شرکت آصف علی زرداری کی وجہ سے تھی کیونکہ حاکم علی زرداری عوامی نیشنل پارٹی کے مرکزی نائب صدر تھے۔

☆ ملک غلام مصطفیٰ کھر سابق گورنر پنجاب اور وزیراعلیٰ نے کہا کہ ”سیاسی اختلافات سے قطع نظر بے نظیر میری بیٹی کی طرح ہیں اور اُنکی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہوئی ہے۔“ ”اُن کی شادی ایک اچھی خبر ہے“ ......

☆ ایک امریکی جریدے نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ”پاکستان پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ ڈیڑھ برس سے پاکستان کی گلیوں میں سیاست اور انتخابات کیلئے جدوجہد کررہی تھیں، اب وہ گذشتہ ہفتے ایک مالدار خاندان کے صاحبزادے آصف علی زرداری کے ساتھ پھولوں کے سائے میں رشتہ ازدواج میں منسک ہوگئی ہیں۔ اِس موقع پر دو استقبالیے دیئے گئے۔ ایک خالصتاً عوامی تھا جس میں پچاس ہزار سے زائد حامیوں نے شرکت کی۔ جریدے کے مطابق بے نظیر بھٹو کہتی ہیں کہ وہ ایک خاندان چاہتی تھیں جو بالآخر اُنہیں مل گیا“ ......

☆ واشنگٹن...... ایک غیر ملکی جریدہ نے لکھا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی قریبی سہیلی شیریں باجوہ کے مطابق ”بے نظیر بھٹو“ کو آصف علی زرداری کی طرح کا خاندو چاہیے تھا جو اُسے مل گیا اور وہ احساس تحفظ محسوس کررہی ہیں“ ......

☆ اِس تقریب میں شادی کیلئے 14 غیر ملکی ٹیلی ویژن ٹیموں نے فلم بندی کی۔ غیر ملکی مہمانوں کی تعداد سات سو کے قریب تھی تاہم کسی غیر ملکی سربراہ کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔ مذکورہ ٹیلی ویژن ٹیموں میں امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپین ممالک شامل تھے۔

☆ قومی سیاست دانوں اور رہنماؤں کی ایک کثیر تعداد نے آصف علی زرداری کی شادی میں بطور خاص شرکت کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

قومی محاذ آزادی کے سیکرٹری جنرل اقبال حیدر اور اُن کی اہلیہ۔ ایم آر ڈی کے نیپ پختونخواہ عبدالرحیم مندوخیل ولالہ عبدالرحمٰن۔ نیشنل پارٹی کے چیئرمین غلام مصطفیٰ جتوئی، اُنکے بھائیوں سمیت صاحبزادوں نے شرکت کی، قومی اسمبلی کے ارکان میں سے ائیر مارشل ریٹائرڈ نور محمد خان اور آفاق شاہد۔ صوبائی اسمبلی کے اراکین میں سے مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ، اُنکے صاحبزادوں مخدوم امین فہیم، مخدوم خلیق الزمان، مخدوم رفیق الزمان اور مشتاق بھٹو، مجید خانزادہ، فیصل صالح حیات، جہانگیر بدر، اور صوبائی سیکرٹری منظور آفریدی بھی شریک ہوئے۔ علاوہ ازیں ممتاز بھٹو کے بھائی عاشق بھٹو اور معشوق بھٹو بھی شریک ہوئے۔

ہمارے ملک کے نامور صحافی، ادیب ودانشور جن کے متعلق صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ میرے بزرگ ہیں اور الفاظ اُن کے قلم کے محتاج ”ارشاد احمد حقانی“ اُنہوں نے آصف علی زرداری اور محترمہ کی شادی کے فوراً بعد ایک مضمون اپنے خاص اُسلوب کے ساتھ لکھا جو روزنامہ ”جنگ“ میں شائع ہوا۔ محترمہ کی شادی اور آصف علی زرداری کی شخصیت نیز آنے والے دنوں میں پیپلز پارٹی کے مستقبل کے بارے میں ”آج بھی اُنکا مضمون تاریخی حوالہ وسند ہے جو

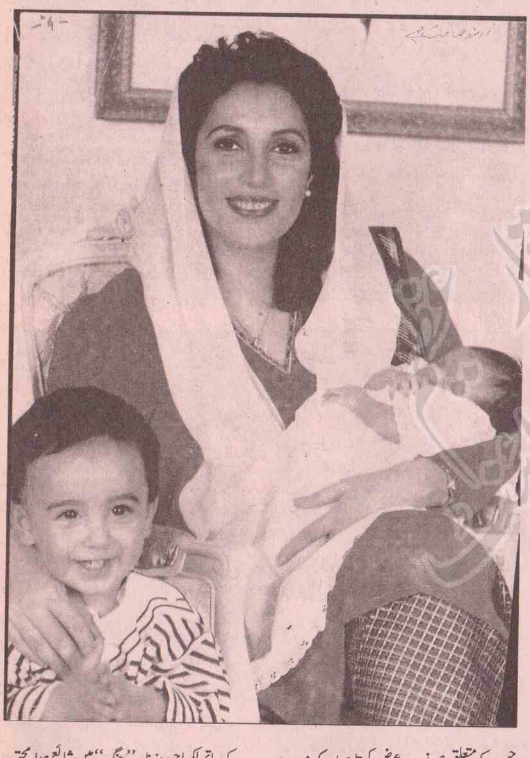

میں شکریہ کے ساتھ قارئین کی نظر کر رہا ہوں۔

یاد رہے کہ یہ مضمون ارشاد احمد حقانی صاحب کا 27 دسمبر 1987ء میں شائع ہوا تھا)

”پاکستان پیپلز پارٹی کی شریک چیئر پرسن بے نظیر بھٹو کی شادی ایک پرائیویٹ شہری کا محض ایک نجی معاملہ ہوتی تو اِس پر کسی تبصرے کا جواز نہ ہوتا لیکن مس بھٹو کو سیاسی مقام نے اِس خاص نجی مسئلہ کو ایک اہم سیاسی واقعہ بنا دیا۔ ملکی اور غیر ملکی پریس نے اِس میں گہری دلچسپی لی اور اِس کی ایک ایک تفصیل عوامی بحث و گفتگو کا موضوع بن گئی۔ مس بھٹو کی شادی بعض حلقوں کے مطابق اِس صدی کی اہم ترین شادی ہو یا محض اِس عشرہ کی، یہ حقیقت ہے کہ عوامی سطح پر جس قدر دلچسپی اور جذباتی وابستگی اِس تقریب کے موقع پر دیکھنے میں آئی، اِس نے اِس واقعہ کو بے نظیر بنا دیا۔

کراچی شہر میں بالعموم اور اِس کے دو مختلف علاقوں کلفٹن اور لیاری میں بالخصوص کئی روز تک جشن اور میلے کا سماں رہا۔ ککری گراؤنڈ میں سٹیج کی تیاری کے تمام مراحل میں ہزاروں افراد روزانہ اِس جگہ پر موجود رہے۔ بہت سوں نے ذاتی طور پر تعمیراتی کام میں شرکت کی اور بالکل اِس طرح منہمک رہے جیسے وہ کسی عمیق جذباتی تعلق اور رشتہ کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ 10 اپریل 1986ء کے بعد پی پی کی سیاسی کارکردگی کیسی رہی اور حالیہ بلدیاتی انتخابات میں اُس کا ریکارڈ کس معیار کا ہے، اِس پر ایک سے زیادہ آراء ہو سکتی ہیں لیکن اِس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ بے نظیر بھٹو ذاتی مقبولیت کے ایک ایسے مقام پر فائز ہیں جس میں پاکستان کا کوئی دوسرا سیاسی رہنما اُن کا حریف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اِسکے شواہد اور مظاہر تو ہمیشہ دیکھنے میں آتے رہتے ہیں لیکن

18 دسمبر کو کلفٹن کے گرد و نواح میں اور ککری گراؤنڈ کے طول و عرض میں بے نظیر کی والہانہ وابستگی اور شیفتگی کے جو مناظر دیکھنے میں آئے وہ واقعی بے مثال تھے۔

میں نے ککری گراؤنڈ کی سٹیج کے ایک کونے میں دھڑا دھڑ نوٹس لیتی ہوئی ایک نوجوان انگریز خاتون صحافی سے جب پوچھا کہ اُس نے شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈیانا کی شادی دیکھی تھی اور وہ دونوں شادیوں کا کیسے تقابل کرے گی تو اُس نے کہا کہ میں نے برطانوی شاہی جوڑے کی شادی بھی دیکھی تھی لیکن جو جذباتی وابستگی اور شیفتگی مجھے اِس عظیم مجمع میں نظر آ رہی ہے، اُس کا عشر عشیر بھی پرنس آف ویلز کی شادی میں دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ میں جب اُن کوسٹرز میں سے ایک میں جو غیر ملکی اور پاکستانی صحافیوں کیلئے فراہم کئے گئے تھے، کلفٹن گارڈن کے استقبالیہ سے ککری گراؤنڈ کیلئے روانہ ہوا تو مجھے ”عوامی استقبالیہ“ کے تیوروں کا اندازہ بالکل شروع ہی میں ہو گیا تھا۔

کلفٹن سے ”دو تلواروں“ اور ”تین تلواروں“ والے چوکوں تک اُن سے آگے میلے کا سا سماں تھا اور چراغاں کی وجہ سے پورا علاقہ جگمگا رہا تھا۔ جگہ جگہ مختلف افراد اور تنظیموں کی طرف سے آویزاں ”شادی مبارک“ کے بینر نظر آ رہے تھے۔ ککری گراؤنڈ کے چاروں طرف سجاوٹ اور آرائش کے مناظر خاصی دور ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں شائقین کا اِس قدر اژدہام تھا کہ گاڑیوں کیلئے چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ اِن میں زیادہ تر نوجوان تھے جن کے لباس اور وضع قطع صاف ظاہر کر رہے تھے کہ اُن کا تعلق غریب اور محروم اور نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ اُن میں ہر لسانی اور نسلی گروہ کے لوگ تھے جن کی بہت بڑی اکثریت نے شادی کی مناسبت سے سینوں پر مختلف بیجز سجا رکھے

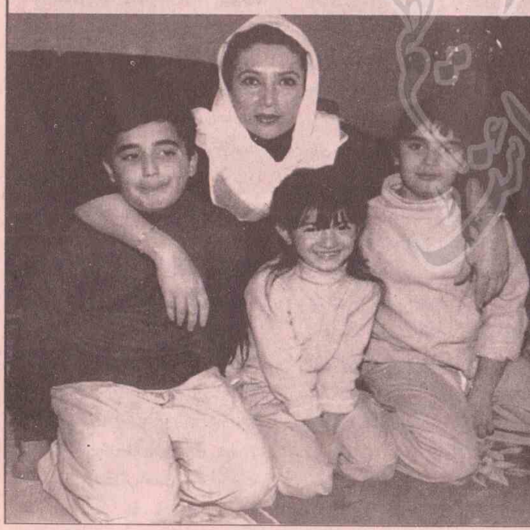

تھے۔ پی پی پی سیاسی لحاظ سے کبھی کامیاب ہوگی بھی یا نہیں اور ہو بھی گئی تو اِن لوگوں کو (یا ملک کے وسیع محروم طبقات کو) کچھ دے سکے گی یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا یا نہیں کہہ سکتا لیکن اُس کی قائد اور بھٹو کی یاد سے اِن لوگوں کی یاد اور محبت کی وابستگی میں ہرگز کوئی کلام نہیں۔ بینظیر بھی اِن محروم اور بھٹو خاندان کا ایک رومانوی تصور رکھنے والے لوگوں سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں اور ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ اپنی جدوجہد اور مشکلات میں جو چیز اُنہیں سہارا اور بے پناہ مصائب کے باوجود اپنی راہ سے نہ ہٹنے کا حوصلہ دیتی ہے، وہ غریب عوام سے اُن کا باہمی رشتہ ہی ہے۔

کگری گراؤنڈ کے طول وعرض میں دیوانہ وار "جئے بھٹو" کا نعرے لگانے والے انسانوں کے وسیع ہجوم پر ایک نظر ڈالتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر بے نظیر کو کبھی اقتدار مل گیا اور اُس نے معاشرے کے کمزور اور پسماندہ طبقات کیلئے کچھ نہ کیا تو یہ اتنی بڑی بے وفائی ہوگی جس کی مذمت کیلئے کوئی بھی لفظ سخت نہ ہوگا۔ ویسے میں نے ملکی صورتحال اور بے نظیر کی سوچ کو جس قدر سمجھا ہے، اُس کے پیش نظر میں اِس حوالے سے تو یقیناً شک وشبہات رکھتا ہوں کہ بے نظیر اقتدار پر جلد قابض ہو سکے گی۔

لیکن اِس حقیقت میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ بے نظیر کو جب اختیار اور اقتدار ملا، وہ غریب عوام کیلئے کچھ نہ کچھ کرے گی۔ اُسکا محکوم عوام سے رشتہ حقیقی اور سچا ہے۔ پاکستان میں سابق برطانوی سفیر نے لاہور میں ایک ذاتی ملاقات میں مجھ سے بے نظیر کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا تمہاری رائے میں محروم طبقات کی بہبود کے مقصد سے اُسکی وابستگی حقیقی اور مخلصانہ ہے؟ میں نے برطانوی مدیر کو بھی (بے نظیر کی وطن واپسی کے کوئی تین ماہ بعد جب 14 اگست 1986ء کے واقعات ابھی ظہور پذیر نہیں ہوئے تھے) یہی جواب دیا تھا کہ بینظیر کی غریب عوام سے مخلصانہ وابستگی میں تو مجھے کوئی شبہ نہیں، آیا وہ جلد اقتدار پر بھی آ سکے، اِس کے بارے میں اعتماد سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مجھے پی پی پی کی قائد سے دو چار تفصیلی ملاقاتیں کرنے کا موقع ملا ہے اور میرا یہ واضح تاثر ہے کہ اُس کے عوام دوستی کے نعرے اور دعوے بناوٹی اور منافقانہ نہیں، حقیقی اور مخلصانہ ہیں۔ اُسکے دل میں اِس بات کی بڑی حقیقی قدر ہے کہ مصائب کی طویل رات میں یہ غریب عوام ہی تھے جنہوں نے اُسے محبت، حوصلہ اور سہارا دیا ہے۔

ایک دفعہ جب میرے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران وہ اپنے مرحوم بھائی شاہنواز بھٹو کے جنازے کے وقت عوام کی والہانہ محبت اور وابستگی کا تذکرہ کر رہی تھیں تو اُن کی آواز بھرا گئی، اُن کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور شعوری کوشش سے اُنہوں نے اپنی اِس کیفیت پر قابو حاصل کیا جس کے دوران چند لمحوں کیلئے مجھے انٹرویو روک دینا پڑا۔ بے نظیر نے کگری گراؤنڈ کے استقبالیہ کے اختتام پر بھی جب اپنی مختصر لیکن پُرجوش تقریر میں یہ اعلان کیا کہ وہ اپنی شادی کے باوجود عوام سے اپنا رشتہ نہیں توڑیں گی تو اُنکی آواز میں اخلاص کا رنگ اور آہنگ نمایاں تھا۔

اِسی طرح اُنہوں نے کہا کہ آج کے دن اُنہیں اپنے باپ اور بھائی بہت یاد آ رہے ہیں لیکن ہزاروں لاکھوں بھائیوں اور بہنوں کی محبت نے اُنہیں حوصلہ اور سہارا دیا ہے، تو یہ بات اُن کے دل سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بے نظیر بھٹو کے سیاسی شعور کی سطح وقت کے ساتھ ساتھ بلند ہو رہی ہے۔ تجربات اور واقعات اُنہیں بہت کچھ سکھا رہے ہیں اور ابھی اُنہیں بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن اپنے کاز اور مشن کا جو تصور وہ رکھتی ہیں، اُس سے اُن کی وابستگی کے مخلصانہ ہونے میں مجھے ذرا برابر بھی شبہ نہیں۔ وہ صرف اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان ہونے کیلئے عوام دوستی کا نعرہ نہیں لگا رہیں، وہ اقتدار کو عوام کی خدمت کا ذریعہ بنانے کا حقیقی عزم بھی رکھتی ہیں، لیکن بے رحم حقائق کی اِس دنیا میں محض اخلاص اور نیک خواہشات ہی سب کچھ نہیں ہوتے، دوسرے بہت سے عوامل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

بے نظیر بھٹو کی جدوجہد میں کامیابی کیلئے درکار تمام مثبت اور منفی عوامل کبھی یکجا اور فراہم ہو سکیں گے، اِسکے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی مگر مجھے یہ کہنا غلط معلوم نہیں ہوتا کہ کگری گراؤنڈ میں جن لاتعداد اور ان گنت لوگوں نے بے نظیر بھٹو سے بے پناہ تعلق خاطر اور محبت کا اظہار کیا، اُن کی محبت بے محل نہیں تھی لیکن اُن کی پسندیدہ قائد اُن کیلئے عملاً کچھ کر سکنے کے قابل ہو سکے گی، یہ پردہ غیب میں مخفی امکانات کی باتیں ہیں جن کے بارے میں دعویٰ سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بے نظیر کی شادی کو جو بے پناہ پبلسٹی ملی، اُس کی وجہ سے اور بعض دوسرے عوامل کے سبب یہ تاثر بھی ایک حلقہ میں پیدا ہوا ہے کہ غریبوں کی حامی ہونے کی مدعی ایک لیڈر نے اپنی شادی بڑی دھوم دھام سے کی ہے، اِس پر اسراف کا مظاہرہ کیا گیا۔ بے پناہ دولت خرچ کی گئی ہے جس سے عوام دوستی اور غریب دوستی کے دعوؤں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ایک لیڈر نے طنزیہ کہا ہے: "یہ ایک سوشلسٹ لیڈر کی شادی تھی"، بعض حلقوں نے شادی پر دو کروڑ روپے خرچ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ میری دانست میں یہ تنقید بہت حد تک بے جواز ہے۔ بے نظیر کی شادی کی تقریبات میں سے کگری گراؤنڈ کا استقبالیہ نکال دیا جائے تو بھٹو خاندان کے سماجی اور مادی مقام کے حوالہ سے یہ ایک سادہ اور کم خرچ شادی تھی۔

70 کلفٹن کا استقبالیہ ہرگز پرشکوہ یا اسراف کا آئینہ دار نہ تھا۔ یہاں جو کھانا دیا گیا وہ واقعی بہت سادہ اور اوسط درجے کا تھا (میں تعریف کے انداز میں اُسکی سادگی بیان کا ذکر کر رہا ہوں) یہاں صرف ایک سویٹ ڈش تھی، کوئی پھل نہیں تھا۔ ایک سالن چینی طرز کی اُبلی ہوئی سبزی پر مشتمل تھا اور اُن لوگوں کیلئے تھا جو سرخ مرچ استعمال نہیں کرتے۔ ایک سالن پاکستانی طرز کا تھا، اِسکے ساتھ چاول تھے اور بس۔ ظاہر ہے کہ اِس کھانے کو سادہ تو کہا جا سکتا ہے، مصرفانہ نہیں۔ بے نظیر نے "بری" میں صرف دو تین جوڑے کپڑے اور معمولی زیور قبول کیا۔ خود کوئی جہیز نہیں لیا۔ اُن کی بانہوں میں سونے کی ایک بھی چوڑی یا کنگن نہیں تھا۔ کانچ کی سہ رنگ چوڑیاں تھیں۔ اُس زمانے میں کانچ کی چوڑیاں شادی پر کونسا خوشحال خاندان اپنی دلہن کو پہناتا ہے؟ یہ درست ہے کہ بے نظیر چند تولے سونا پہن بھی لیتیں تو اِس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اِسی طرح وہ جوڑوں کی محتاج تھیں نہ زرداری خاندان اُن کے جہیز کا منتظر تھا۔ دونوں صاحب ثروت خاندان ہیں لیکن بے نظیر کے فیصلوں کی علامتی اور نظریاتی اہمیت ہے۔

میں نے بے نظیر کے بہت قریبی پی پی پی کے ایک سینئر عہدیدار کو کریدنے کیلئے کلفٹن گارڈن کے

استقبالیہ میں کہا کہ لوگ شادی پر بے تحاشہ دولت خرچ کرنے پر تنقید کررہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ جہیز کی رسم کو نظرانداز کرنے، معمولی حق مہر مقرر کرنے، بری سے مستغنی ہونے اور کانچ کی چوڑیاں پہننے کو اگر آپ مسرفانی سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی‘...... ’’ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ شادی اور غریب اور نچلے متوسط طبقات کی لڑکیوں کو حوصلہ دے گی کہ جہیز اور بے تحاشہ سونے کے بغیر بھی شادی ہوسکتی ہے‘‘......

جہاں تک ککری گراؤنڈ کے استقبالیہ کا تعلق ہے، اُس پر ضرور خرچ ہوا ہے۔ آتش بازی بھی چھوڑی گئی ہے۔ لیکن یہ تقریب ایک سیاسی ضرورت تھی۔ ملک بھر میں پی پی پی کے ہزاروں کارکن جو بے نظیر سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں، خوشی کے اِس اجتماع میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تیس چالیس ہزاروں کارکنوں کیلئے کوئی ایسی ہی تدبیر اختیار کی جاسکتی تھی جیسی کہ ککری گراؤنڈ کے استقبالیہ کے انعقاد کی صورت میں کی گئی۔ یہ پی پی پی کی سیاسی طاقت کا ایک مظاہرہ اور بے نظیر کی مقبولیت کے اظہار کا ایک اندازہ بھی تھا۔ اِس تقریب پر خرچ ہونے والی رقم کو سیاسی سرمایہ کاری سمجھا جانا چاہیے۔ لیکن اِس ضمن میں ظاہر کئے جانے والے اندازے بھی بہت مبالغہ آراء ہیں اور اِس تقریب میں اعتراض کی کوئی جائز وجہ نظر نہیں آتی۔

لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ بے نظیر نے اپنے آپ کو ’’ڈی کلاس‘‘ کرلیا ہے یعنی اپنے سماجی اور معاشرتی طبقہ سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ وہ پہلے ایک جاگیردار خاندان کی صرف بیٹی تھیں، اب وہ ایک بڑے زمیندار اور سرمایہ دار خاندان کی بہو بن گئی ہیں۔ اُنکے پاس دولت کی ریل پیل پہلے جس قدر تھی، اب اُس سے زیادہ ہوگی لیکن یہ چیز اُنہیں سیاسی کردار ادا کرنے یا سماجی ومعاشی انصاف کی علمبرداری کا دعویٰ کرنے کا نااہل قرار نہیں دیتی۔ ہاں شرط یہ ہے کہ وہ بہت مسرفانہ زندگی نہ گزاریں اور نہ دولت کی نمود ونمائش کریں۔ اُنہوں نے ہنی مون منانے کیلئے سوئٹزر لینڈ یا کسی بھی دوسری جگہ نہ جانے کا فیصلہ کرکے بھی اپنی دانشمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

حالانکہ اگر وہ چار ہفتے کیلئے باہر چلی بھی جاتیں تو شاید اِس پر اعتراض کا کوئی جواز نہ ہوتا لیکن اُنکی سیاست سے کمٹمنٹ اِس قدر شدید اور مکمل ہے کہ اُسکے تقاضے اُن کے تمام فیصلوں پر حاوی رہتے ہیں۔ شادی سے متعلق بعض رسوم بھی اُنہوں نے ادا ضرور کی ہیں لیکن اُن میں کوئی قابل ذکر انہماک یا دلچسپی نہیں تھی بلکہ اپنے مشاہدہ کی بناء پر میں یہ کہنے پر مائل ہوں کہ اُنہوں نے ’’دولہناپا‘‘ ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا۔ عین شادی کے دوران وہ پریس کانفرنسیں کرتی رہیں۔ کلفٹن کے استقبالیہ اور ککری گراؤنڈ کی تقریب میں ہڑبونگ یا ہلڑ بازی کے خاتمہ کیلئے فوراً خود متحرک ہوجاتی رہیں۔

ککری گراؤنڈ کی سٹیج پر کئی دفعہ وہ اِس طرح مصروف عمل رہیں جیسے آج بھی وہ دلہن نہ ہوں، محض ایک سیاسی لیڈر ہوں۔ اُن کی تقریر بھی اُنکے معمول کے سٹائل کی آئینہ دار تھی۔ بظاہر یہ معمولی باتیں ہیں لیکن اِن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے نظیر کے اندر جو ایک بے قرار سیاسی کارکن چھپا ہوا ہے، وہ اِس قدر موثر اور غالب ہے کہ اُس نے اُنہیں زندگی میں صرف ایک دفعہ آنے والے دن میں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنی بیٹی کی شادی کی کامیابی کے امکانات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں بالکل درست کہا ہے کہ ’’کسی بھی شادی کی کامیابی کی قطعی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی‘‘ لیکن بے نظیر کے شوہر مسٹر آصف علی زرداری ہمدرد، باشعور اور پختہ ذہن کے مالک ہیں اور اُنہیں توقع ہے کہ دونوں کے درمیان خوشگوار تعلقات رہیں گے‘‘ بے نظیر کے سیاسی مزاج اور مصروفیات، اُن کی شہرت اور مقبولیت اور مسٹر آصف علی زرداری کے غیر سیاسی مزاج اور طرزِ فکر کے حوالے سے بعض حلقوں میں یہ جائزہ لیا گیا کہ میاں بیوی کا نباہ کیسے ہوگا؟

اِس حوالہ سے بعض شبہات یا خدشات پیدا ہونا فطری ہے۔ اِس لئے کہ یہاں غیر یقینی کیفیت پیدا کرنے والے معمول کے عوامل کے علاوہ بھی بہت سے اضافی اسباب ایسے پائے جاتے ہیں جن کا نتیجہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن میری دانست میں اِس رشتہ کے کامیاب رہنے کے امکانات بھی خاصے روشن ہیں۔ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسٹر آصف علی زرداری نے صورتحال سمجھ کر قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور وہ نئے رشتے پر نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ اِس پر نازاں ہیں۔ اُنہوں نے واضح لفظوں میں کہا ہے کہ وہ بے نظیر بھٹو کی سیاست میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن شخصی اور خاندانی سطح پر اُنہیں پورا تحفظ اور مکمل تعاون دیں گے، حتیٰ کہ جب اخبار نویسیوں کے ایک پینل نے اُن سے سب سے چبھتا ہوا سوال کیا تو اُنہوں نے اِس کا بھی معقول جواب خندہ پیشانی سے دیا۔

اُن سے کہا گیا کہ ’’اگر لوگ آپ کو مسٹر بے نظیر بھٹو کہنا شروع کردیں تو آپکا کیا ردعمل ہوگا‘‘ اِس سوال پر جوش پر آنے یا بھڑکنے اور اپنی ’’قوامیت‘‘ کا مظاہرہ اور دعوٰی کرنے کی بجائے اُنہوں نے بڑے سکون سے جواب دیا کہ اِس قسم کے تبصروں اور ریمارکس سے میں کوئی اثر قبول نہیں کرتا اور دوسرا جو دل میں آئے، کہے، میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ جواب کوئی ایسا مرد دے سکتا ہے جو انتہائی خود اعتماد اور حقیقت شناس ہو اور جس کے اندر حقائق سمجھنے اور خوش دلی سے قبول کرنے کی جرات اور استعداد ہو۔

بے نظیر بعض عائلی ذمہ داریوں کی وجہ سے کسی خاص وقت پر کچھ عرصہ کیلئے غیر متحرک رہ سکتی ہیں۔ ایسا ہونا ناگریز ہے لیکن یہ بھی ایک عارضی کیفیت ہوگی اور پوری تندہی اور انہماک سے پھر اپنے اصل کام کی طرف لوٹ آئیں گی۔

سیاست سے اُن کی کمٹمنٹ کی شدت کا اندازہ تو آپ اِس حقیقت سے لگا سکتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے سسرال والوں کی خواہش کا تذکرہ کرنے کے باوجود یہ واضح عندیہ دیا ہے کہ اُنکے خاندانی معاملات ملکی سیاست کے تقاضوں کے تابع رہیں گے حتیٰ کہ وہ بچوں کی خواہش بھی اُسی وقت پورا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں جب ملکی سیاست اور اُن کی سیاسی ذمہ داریاں اِس کی اجازت دیں گی۔ اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی زندگی میں اُن کا سیاسی مشن سب سے طاقتور محرک ہے اور دوسری ہر خواہش اور مصلحت اِس پر قربان کی جاسکتی ہے یا اِس کے تابع رہ سکتی ہے۔

بے نظیر بھٹو فی الحقیقت ایک نہایت ہی مشکل اور نازک صورتحال سے عہدہ برآہ ہونے کی کوشش کررہی ہیں۔

پورے عالم اسلام میں کیا کوئی دوسری غیر شادی شدہ یا نوبیاہتا خاتون سیاسی قیادت کے فرائض ادا کررہی ہے؟ محترمہ خالدہ ضیاء اور شیخ حسینہ واجد کی خواتین ہونے کے ناطے سیاسی شکلات ـ بے نظیر بھٹو

باقی صفحہ 84 پر

بلاول
وزیراعظم
تو بن سکتے
ہیں اچھے سیاستدان نہیں

بلاول زرداری مستقبل کے وزیراعظم ہوں گے مگر اس کیلئے انہیں پندرہ برس انتظار کرانے پڑے گا

الیکشن کے بعد پیپلز پارٹی کو کافی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے

مستقبل قریب میں عام انتخابات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا

اگر الیکشن ہوئے تو اس کے نتیجہ میں انتہائی کمزور حکومت بنے گی

ماہرین علم نجوم و علم الاعداد انتظار حسین زنجانی، انور فراز اور مصطفیٰ الہٰی کی پیش گوئیاں

ملک کے معروف ماہرین علم نجوم نے پیپلز پارٹی اور اس کی نئی قیادت کے حوالے سے جو تحقیق کی ہے اس کے مطابق بلاول زرداری وزیراعظم تو بن سکتے ہیں لیکن اچھے سیاستدان ثابت نہیں ہو سکتے اور یہ کہ آگے چل کر پیپلز پارٹی میں اندرونی اختلافات سر اٹھا سکتے ہیں۔ اس بارے میں علم نجوم کے ماہر سید انتظار حسین زنجانی کا کہ

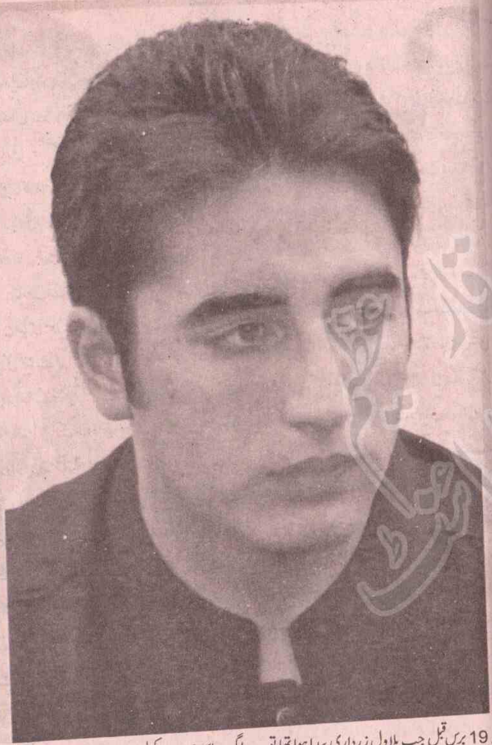

ے کہ 19 برس قبل جب بلاول زرداری پیدا ہوا تھا تو ں نے اس کا ''پیدائشی زائچہ'' نکالا تھا جو اس وقت کی نجانی جنتری میں شائع ہوا تھا اس میں ستاروں اور علم اعداد کے حساب سے میں نے کہا تھا کہ بلاول زردری ستقبل کا وزیراعظم ہوگا اور اب بھی میرا یہی کہنا ہے۔ اگر چہ اس عہدے کیلئے اسے مزید پندرہ سولہ برس انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ابھی وہ کم عمر ہے تاہم اس کے پیدائشی زائچے میں یہ عہدہ صاف نظر آ رہا ہے۔ جہاں تک پیپلز پارٹی کے مستقبل کا سوال ہے تو سیارگان بتا رہے ہیں کہ پارٹی کو مستحکم کرنے کیلئے اس کی باگ ڈور

بھٹو خاندان کے ہاتھ میں ہی رہنی چاہیئے تھی۔ یعنی فی الوقت ایسے فرد کو پارٹی کا سربراہ بنایا جانا چاہیئے تھا جس کا بھٹو خاندان سے ''بلڈ ریلیشن'' ہے لیکن ایسا ہوا نہیں جس سے پارٹی کو مستقبل قریب میں کافی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ زائچے کے حساب سے اگر پارٹی امور میں غنویٰ اور فاطمہ بھٹو کو بھی شامل کرلیا جائے تو کافی مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

ستاروں کے حساب سے 9 ستمبر 2009ء تک ملک کی سیاسی صورت حال مستحکم نظر نہیں آ رہی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ مستقبل قریب میں اگر پیپلز پارٹی کے کسی رہنما کے وزیراعظم بننے کا امکان ہے تو اس کیلئے مخدوم امین فہیم کے علاوہ سید یوسف رضا گیلانی مضبوط امیدوار ہیں۔ ممتاز آسٹرولوجسٹ انور فراز کا کہنا ہے کہ بلاول کی تاریخ پیدائش 21 ستمبر 1988ء ہے 21 ستمبر کو پیدا ہونے والے لوگ بنیادی طور پر ادب و آرٹ سے وابستہ ہوتے ہیں اور فنکارانہ شخصیات کا سرسری جائزہ لیں تو ان میں سرفہرست ایچ جی ویلز ہیں۔ جنہوں نے سائنس فنکشن پر حیرت انگیز اور معرکتہ الآرا ناول لکھے اس کے علاوہ سرایلین لین اور آج کے دور میں سائنس فکشن کے بے تاج بادشاہ اسٹیفن کنگ شامل ہیں۔ اس طرح فن مصوری کے حوالے سے عبدالرحمٰن چغتائی کی تاریخ بھی 21 ستمبر ہے۔ ملکہ ترنم نور جہاں اور ہالی وڈ کے معروف سنگر لیوناڈ کوہن بھی اس تاریخ کو پیدا ہوئے اور بھارتی اداکار کرشمہ کپور نے بھی 21 ستمبر کو آنکھ کھولی۔

برج کے حساب سے بلاول زرداری مستقبل
ایک اچھے سیاستدان ثابت نہیں ہو سکتے۔ دراصل
کے لحاظ سے بلاول کی شخصیت بھی اپنی والدہ کی طرح
علامتوں کی امتزاج ہے۔ مثلاً بے نظیر بھٹو کی پیدائش
وقت جوزا کا اختتام اور سرطان شروع ہو رہا تھا
شخصیات پر دونوں برجوں کے اثرات ہوتے ہیں۔
طرح بلاول بھی برج سنبلہ اور میزان کا امتزاج ہیں
سنبلہ ایک بڑا اور کنگ برج ہے جبکہ میزان ایک آرٹ
علامت ہے۔ اس بنیاد پر بلاول ایک اچھے ادیب،
فلسفی، محقق اور سائنسدان تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن
سیاستدان نہیں۔ جہاں تک پیپلز پارٹی کے مستقبل
بارے میں سیارگان کا تعلق ہے تو حال ہی میں پارٹی
قیادت کے حوالے سے ذمہ داران نامزد کیے گئے ہیں
اس کے سبب پیپلز پارٹی کا ایک ''نیا زائچہ'' وجود میں آ
ہے۔ ستارے جو بتا رہے ہیں کہ جو فیصلے اس حوالے
کیے گئے ہیں ضروری نہیں کہ وہ آئندہ بھی برقرار رہیں
ان میں تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔ نئے فیصلوں کے مطا
پارٹی میں اصل پوزیشن بلاول کی نہیں آصف زرداری
ہے کیونکہ معاملہ ابھی تازہ تازہ ہے لہٰذا بظاہر کوئی
بات نظر نہیں آ رہی ہے لیکن آگے جا کر ان معاملات
پارٹی کے اندر دراڑیں پڑتی نظر آ رہی ہیں۔ بالخصو
آصف علی زرداری اور مخدوم امین فہیم کے درمیا
دوریاں پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ برج کے لحا
سے بھی دونوں اسد ہیں جبکہ اسد کے زیر اثر شخصیا
اقتدار پسند اور حاکمیت پسند ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایک میا

میں دو تلوار والا مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ پارٹی کے دیگر اہم رہنما ان معاملات پر آواز بلند کریں جس سے پارٹی اندرونی اختلافات کا شکار ہو سکتی ہے۔

سیاسی طور پر نئے برس کے تین ماہ فروری، مارچ اور اپریل بہت اہم ہیں۔ علم الاعداد کے ماہر مصطفیٰ الٰہی کا کہنا ہے کہ پیپلز پارٹی کی باگ ڈور چلانے کیلئے جن افراد کے ناموں کا اعلان ہوا ہے اتفاق سے ان چاروں کے ناموں کے اعداد پر قمر (چاند) کی حکومت ہے اور جن لوگوں کی شخصیت پر قمر کی حکومت ہوتی ہے وہ عموماً تعاون و شراکت داری یعنی کہ دوسرے کی مدد سے ہی کامیابی حاصل کرتے ہیں اور انفرادی طور پر زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوتے۔ مصطفیٰ الٰہی کا کہنا تھا کہ بلاول کے نام کے اعداد اکتیس بنتے ہیں۔ ان دونوں کو جمع کرنے س چار عدد نکلتا ہے جس پر قمر کی حکمرانی ہے اسی طرح آصف زرداری کے نام کے اعداد 29 کو جمع کریں تو گیارہ اور دونوں کو ملا کر 2 کا عدد سامنے آتا ہے جبکہ مخدوم امین فہیم کے اعداد بھی 39 یعنی 4,2 اور 7 ان تینوں اعداد پر چاند کی حکمرانی ہوتی ہے۔ دوسری جانب پیپلز پارٹی کے نام پر عطارد کی حکمرانی ہے اور علم نجوم کے مطابق قمر سے عطارد کی دوستی زیادہ گہری نہیں ہے۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ قمر اور عطارد کے تعلقات نہ بہت اچھے ہوتے ہیں اور نہ بہت خراب۔ ان دونوں کے درمیان کسی شخص کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اتفاق سے شاہ محمود قریشی عددی طور پر تو قمر ہیں لیکن ان کے نام کے پہلے حروف پر شمس کی حکمرانی ہے۔ یہ بات کسی حد تک پارٹی کی نئی قیادت کے حق میں جاتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پیپلز پارٹی کی اندرونی پوزیشن آگے چل کر اچھی نہیں تو بہت زیادہ خراب بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔

(ق) لیگ کے نام پر شمس کی حکومت ہے اور نیا سال 2008ء بھی شمس ہے جبکہ آرمی پر مریخ کی حکمرانی ہے اور یہ بات زیر نظر رہے کہ شمس اور مریخ کی آپس میں بڑی گہری دوستی ہے۔ ممتاز ماہر علم نجوم ایم اے خان کا کہنا ہے علم الاعداد کے مطابق 9 کا ہندسہ مریخ کا ہندسہ ہے جو جنگ وجدل خون خرابہ اور قتل و غارت گری کی علامت ہے۔ یوں ہم دیکھیں تو 9 کا ہندسہ بے نظیر کو کھا گیا۔ بے نظیر کی عمر 54 برس تھی 5 اور 4 کو جمع کریں تو 9 بنتا ہے۔ ان کی شہادت 27 تاریخ کو ہوئی یہ بھی 9 ہی بنتا ہے۔ وہ 18 اکتوبر کو پاکستان آئیں 18 بھی 9 بنتا ہے وہ 21.06.1953 کو پیدا ہوئیں اور یہ بھی 9 بنتا ہے اور 2007 میں شہید ہوئیں تو وہ بھی 9 بنتا ہے۔ اب اگر آصف کے نام کے اعداد لئے جائیں تو وہ بھی 9 بنتا ہے۔ چنانچہ مریخ کے عدد 9 کے تحت آصف زرداری کو بھی جان کا خطرہ ہے۔ بلاول کا عدد 6 ہے جو درمیانی عدد ہے اور 3 اور 9 کے درمیان میں پھنسا ہوا ہے جبکہ امین فہیم کا عدد 11 ہے۔ 11 کا عدد خود مختار ہوتا ہے۔ اس لئے امین فہیم پیپلز پارٹی کی طرف سے وزیراعظم وزیراعظم بن جانے کے بعد بھی پیپلز پارٹی کے تقسیم ہو جانے کے امکانات موجود ہیں۔ جیسا کہ ماہ ستمبر میں ہم نے پیشگوئی کی تھی کہ بے نظیر پر نحوست کے ستاروں کا

سایہ ہے جس کے باعث نہ صرف ان کی جان کو خطرہ ہے بلکہ ملک کو بھی خطرہ ہے۔ یہ پیشگوئی پوری ہوئی' اب نئے حالات میں 9 کے عدد مریخ کے تحت آصف علی زرداری پر بھی زحل اور مریخ برابر منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں جس کے باعث پیپلز پارٹی متحد ہو کر بھی اپنا اتحاد مستقبل میں برقرار نہ رکھ سکے گی اور مخالفین کو سازش کرنے کا موقع مل جائے گا۔ بہر حال پیپلز پارٹی کی حکومت تو بنتی نظر آ رہی ہے مگر ملکی حالات ایک عدد کے تحت خراب ہوتے دکھائی دیتے ہیں جو کہ 2008ء کا عدد ہے' اس کے تحت یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اول تو پیپلز پارٹی کی حکومت بننے میں رکاوٹیں آئیں گی اور اگر حکومت بن بھی گئی تو زیادہ عرصہ نہ چل سکے گی۔ حالیہ الیکشن کے نتیجہ میں جو بھی حکومت بنے گی وہ انتہائی کمزور ہوگی اور اس کے چلنے کے امکانات نہ ہوں گے۔ خدا ہمارے ملک پر رحم فرمائے (آمین)۔ بھٹو خاندان میں پائے جانے والے سیاسی اختلافات جوں کے توں برقرار ہیں اور گذشتہ بنیادوں پر ہی بھٹو کے تمام ورثاء آئندہ سیاست میں حصہ لیں گے۔ مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے تمام جماعتوں کے رہنما ثانوی پوزیشن میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ تاہم 2008ء میں اپوزیشن اور مذہبی جماعتیں مل کر ایک قوت بن سکتی ہیں۔ یہ نئی تبدیلی کا نشان ہوگا۔

○ ○

بے نظیر بھٹو کی یاد میں

ڈاکٹر اصغر یعقوب

عزم محکم کی چٹان تھی بے نظیر
جادہ حق پہ رواں تھی بے نظیر
بے عدیلوں کے مقابل برملا
غم زدوں کی ترجماں تھی بے نظیر
حبِ ملک و قوم کے احساس سے
غیرتِ ملت کی جاں تھی بے نظیر
اُس پہ قرباں تھی وطن کی نکہتیں
امنِ باہم کا نشاں تھی بے نظیر
اُس کے سیاسی ذوق میں تھی پختگی
عزم راسخ میں جواں تھی بے نظیر
صنف نازک تھی مگر اے دوستو!
نکتہ سنج و نکہ داں تھی بے نظیر
وہ علامت تھی وفاق ملک کی
شعلوں پہ آبِ رواں تھی بے نظیر
جانتی تھی وہ سیاست کے رموز
عظمتوں کی راز داں تھی بے نظیر
مصلحت کشی نہ تھا اُس کا شعار
مثل آہن سخت جاں تھی بے نظیر
تیرہ شب میں وہ سراپا نور تھی
دھوپ میں اک سائباں تھی بے نظیر
موجزن حب وطن کی آئینہ دار
آبرؤں کا جہاں تھی بے نظیر
ہوگئی قرباں وطن کی خاک پر
اشرفیت کا نشان تھی بے نظیر
قلب اصغر بھی غریقِ غم ہوا
بے نواؤں کی زباں تھی بے نظیر

میرے مقابلے میں تم بہتر جنگ لڑسکتی ہو

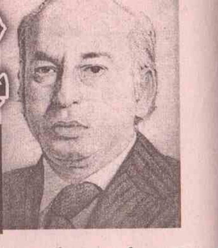

تمہاری تقریریں میرے مقابلے میں زیادہ فصیح وبلیغ ہوں گی تمہاری عوام سے مکمل وابستگی ہوگی

مذہب اللہ اور بندے کے درمیان جبکہ نظریہ صرف انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی ہوتی ہے

مجھے مجبوراً سیاسی اسٹیج سے علیحدہ ہونا پڑے گا میں تمہیں اپنے سیاسی احساسات کا تحفہ دیتا ہوں

میرا سب سے زیادہ جذباتی رومان سیاست اور عوام کے ساتھ ہے ان دونوں سے میری نہ ختم ہونے والی شادی ہوئی ہے

ہمت کا زوال تہذیب کا زوال ہوتا ہے تم درست ہتھیاروں اور نظریات سے مسلح ہوگی

میری سب سے پیاری بیٹی!

ایک سزا یافتہ قیدی کس طرح اپنی خوبصورت اور پیاری بیٹی کو سالگرہ کے موقع پر مبارکباد کا خط لکھ سکتا ہے جبکہ اُس کی بیٹی (جو خود قیدی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ اُس کی ماں بھی اُس کی طرح قید کی صعوبتیں برداشت کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ یہ رابطہ سے زیادہ گھمبیر معاملہ ہے۔ محبت اور ہمدردی، ایک پیغام ایک جیل سے دوسری جیل اور ایک زنجیر سے دوسری زنجیر تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

نہرو بھی اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتے تھے۔ نہرو نے بھی جیل سے اُنہیں اُن کی سالگرہ کے موقع پر مبارکباد کا پیغام ارسال کیا تھا۔ میں نے اِس بات کا ذکر اِس سے پہلے بھی تم سے غالباً پہلے یا دوسرے خط میں کیا تھا جو میں نے تم کو جیل سے لکھے تھے۔ جب تم چھوٹی تھیں مری کانونٹ سکول میں زیر تعلیم تھیں، صنم سیما اور چھوٹی تھی۔ میں نے اِس طویل خط میں ذکر کیا تھا کہ کس طرح نہرو نے عالمی تاریخ کے متعلق اپنی بیٹی کو خطوط لکھے تھے۔ بعد میں اِن خطوط کو مرتب کر کے کتابی شکل دے دی گئی اور اِس کتاب کا نام ''تاریخ عالم کی جھلکیاں'' رکھا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ پہلا خط اندرا کے جنم دن کے موقع پر مبارکباد کا خط تھا۔ وہ اندرا کو پیار سے 'اندو' پکارتے تھے۔ اُس وقت وہ تیرہ برس کی تھی جبکہ میں 23 برس کا ہوگیا تھا۔ میں نے چار مرتبہ ''تاریخ عالم کی جھلکیاں'' کا مطالعہ کیا ہے۔ نہرو ہمارے زمانے میں انتہائی صاف ستھری انگریزی لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ اُن کے الفاظ میں ایک قسم

جموں وکشمیر کے مسئلہ کو فوجی حکمرانوں نے سیدھے سادے طریقے سے حل کرنے کی کوشش میں اور زیادہ الجھا دیا ہے

کی مٹھاس اور ترنم تھا۔

جکارتہ سے 14 برس قبل جو خط میں نے لکھا تھا، اُس میں تمہیں آگاہ کیا تھا کہ میں نہرو کی نقل نہیں کرسکتا۔ میں نے اُس کی تقلید اُس وقت نہیں کی تھی اور نہ ہی اب کررہا ہوں۔ بے شک میں اِس وقت قید میں ہوں اور وہ بھی مقید تھے جب اُنہوں نے اپنی بیٹی کو خطوط لکھے۔ یہ اتفاق نہرو اور میرے ساتھ ایک جیسا پیش آیا۔ دوسری بات بھی نہرو اور میرے مابین مشترک ہے، وہ یہ کہ میں یہ خط اپنی بیٹی کو جنم دن کی مناسبت سے لکھ رہا ہوں لیکن نہرو اور میرے درمیان گہری مسابقت نہیں۔ نہرو کو غیر ملکی حکمرانوں نے عزت واحترام کے ساتھ ایک مقام پر جیل میں رکھا تھا۔ اُنہوں نے حصول آزادی کیلئے جدوجہد کی تھی۔ وہ بھارتی عوام کے ایک عظیم رہنما تھے۔

اُنہوں نے کیمبرج سے تعلیم حاصل کی تھی اور بڑی عزت ووقار کے مالک تھے۔ وہ کوئی نیچ قسم کے قاتل نہیں تھے اور نہ ہی سرکاری خزانے میں غبن کیا تھا۔ وہ لاڑکانہ کے کسی گاؤں کی کوئی غیر اہم شخصیت نہیں تھے جو حکمران ٹولے کے ہاتھوں موت کی کوٹھری میں جل رہی ہو۔ نہرو اور میرے درمیان انتہائی واضح فرق ہے۔ اُن کی بیٹی تیرہ برس کی ایک لڑکی تھی جس نے اُس دور کی سیاست میں اپنا کردار انجام دیا تھا اور اُس ادارے کو منظم کیا تھا جسے اُس نے 'مونکی بر گیڈز' کا نام دیا تھا۔ اُس وقت اُس کی بیٹی سیاست کی آگ سے گزری تھی جبکہ تمہارے گرد آگ ہی آگ ہے۔ یہ آگ ایک بے رحم جنتا نے لگائی ہے۔ یہ آگ تباہ کن اور خطرناک ہے۔ اِس لئے بڑا فرق ہے، دونوں کی مسابقت نہیں کی جاسکتی اگر دونوں میں کوئی مسابقت ہے تو وہ یہ ہے کہ تم بھی اندرا کی طرح تاریخ کی تشکیل کررہی ہو۔

میں اندرا سے اچھی طرح واقف ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہوں حالانکہ میں اُن کے والد کو بہتر طور پر جانتا تھا۔ جس طرح تمہارے دادا اُن کے دادا کو بہتر طور پر جانتے تھے۔ میں اُن کی خوبیوں اور اچھائیوں کا انتہائی زیادہ احترام کرتا ہوں اور میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں اُن کا اتنا بڑا مداح نہیں ہوں۔ یہ درست ہے کہ وہ بھارت کی وزیراعظم بنیں اور گیارہ سال تک اِس اعلیٰ عہدے پر فائز رہیں۔ وہ دوبارہ بھی بھارت کی وزیراعظم بن سکتی ہیں۔

اُنہوں نے جب مشرقی پاکستان پر قبضہ کیا تو اُنہیں دیوی کا لقب دیا گیا۔ اِن تمام باتوں سے آگاہی کے باوجود اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری بیٹی

بڑی طاقتیں باقی دنیا کی تباہی کو کسی بلندی سے نہیں دیکھ سکتیں وہ خود بھی متاثر ہوں گی

جواہر لال نہرو کی بیٹی کے مقابلے میں جسے بھارت کی دیوی کہا جاتا ہے، کہیں زیادہ دانا ہے۔ میں کوئی جذباتی یا ذاتی نوعیت کا اندازہ نہیں لگا رہا۔ یہ میری ایماندارانہ رائے ہے۔

میرے افکار و نظریات کو مجھ پر تنقید کرنے والوں نے بھٹو ازم کا نام دیا ہے
میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کروں گا

اندرا اور تم میں ایک خوبی مشترک ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم دونوں برابر کی بہادر ہو۔ تم دونوں مضبوط سیسے کی بنی ہوئی ہو یعنی تم دونوں کی قوت ارادی سیسے کی طرح مضبوط ہے۔ تمہاری صلاحیت اور دانش تمہیں کہاں لے جائے گی؟ عام طور پر یہ صلاحیت اور دانش تمہیں بلند مرتبے پر پہنچائے گی لیکن ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہیں جہاں دانش اور صلاحیت ایک خامی تصور کی جاتی ہے جبکہ طویل سانس روک لینے والی ایک معمولی قسم کی ذہانت کو ایک اثاثہ تصور کیا جاتا ہے۔ تمہارے والد، قائداعظم اور سہروردی کے سوائے باقی اِس ملک پر حکومت اشاروں پر ناچنے والوں اور کپتانوں نے کی ہے۔ اگر کوئی جرات مند جوان اِس سلسلے میں جدوجہد کا آغاز کرے تو ہوسکتا ہے بعد میں اِس صورتحال میں تبدیلی آئے۔ اگر حالات نہیں بدلتے تو پھر بدلنے کیلئے کچھ بھی نہیں بچے گا یا تو اقتدار عوام کو حاصل ہوجائے گا یا ہر چیز تباہ و برباد ہوجائے گی۔

تمہارے داداد نے مجھے باوقار سیاست سکھائی اور تمہاری دادی نے مجھے غربت کی سیاست کا درس دیا۔ میں اِن ہی دونوں باتوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں تاکہ اِن دونوں میں اتصال رہے۔

پیاری بیٹی!

میں تمہیں صرف ایک پیغام دینا چاہوں گا۔ یہ پیغام آنے والے دن کا پیغام ہے اور تاریخ کا پیغام ہے۔ صرف عوام پر اعتماد کرو۔ اُنکی نجات اور مساوات کیلئے کام کرو۔ اللہ تعالیٰ کی جنت تمہاری ماں کے پیروں تلے ہے جبکہ سیاست کی جنت عوام کے پیروں تلے ہے۔ برصغیر کی عوامی زندگی میں کچھ کامیابیاں میرے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں لیکن میرے ذہن میں صرف وہ کامیابیاں انعام ہیں جن کے ذریعے عوام کے بوجھل چہروں پر مسکراہٹیں پھیل جائیں اور جن کے ذریعے کسی دیہاتی کی دکھی آنکھوں میں خوشی کی چمک آجائے۔ دنیا کے عظیم رہنماؤں نے جو خراج تحسین مجھے پیش کیا ہے، اُسکے مقابلے میں اِس موت کی کال کوٹھری میں زیادہ فخر اور احترام کے ساتھ ایک چھوٹے گاؤں کی ایک بیوہ کے الفاظ یاد کر رہا ہوں جس نے مجھے کہا تھا ”صدقو دیان سٹھل سائیں“ (صدقے جاؤ سوہنا سائیں) اُنہوں نے یہ الفاظ اُس وقت کہے تھے جب میں اُن کے ایک کسان بیٹے کو وظیفے پر بیرون ملک بھیج رہا تھا۔ بڑے لوگوں کیلئے یہ چھوٹی باتیں ہیں لیکن مجھ جیسے چھوٹے لوگوں کیلئے حقیقت میں یہ بڑی باتیں ہیں۔ تم اُس وقت تک قدر آور نہیں ہوسکتیں جب تک تم دھرتی کو چومنے کیلئے تیار نہیں ہوتی یعنی نیازمندانہ رویہ اختیار کرو۔ تم دھرتی کا اُس وقت تک دفاع نہیں کرسکتی ہو جب تک کہ تم اِس کی خوشبو سے واقف نہیں ہوگی۔ میں اپنی دھرتی کی خوشبو سے واقف ہوں۔

سیاسی نظریات اور اُصول، تحریری تاریخ کے دروازے سے باہر رہیں گے، عوام کی اُمیدوں اور اُن کے ساتھ مکمل ہم آہنگی ہی بڑی بات ہے۔ جب اِس راگ یا موسیقی کے معنی سمجھ میں آتے ہیں تو منزل کے نشان واضح ہوجاتے ہیں۔ اُصول اور نظریات کے قدم تیز ہوجاتے ہیں او وقت کے اِس راگ کی شان بڑھانے کیلئے خودبخود پہنچ جاتے ہیں۔ اس کا یہ

تیسری عالمی جنگ دنیا کے کسی بھی غیر اہم کونے سے شروع ہوسکتی ہے

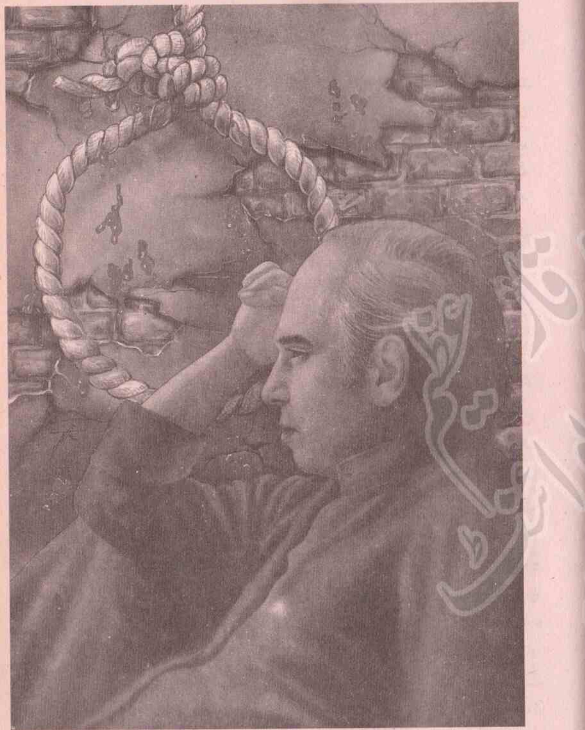

سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا بینظیر بھٹو کے نام جیل کی کال کوٹھڑی سے ایک تاریخی خط

سادہ مزاج فوجی پیچیدہ خارجی مسائل کو حل کرنے میں جلد بازی سے کام لیتا ہے

مطلب نہیں کہ میں نظریہ عملیت کی تبلیغ کررہا ہوں۔ نظریہ عملیت میں تو وقت اور توقع کے لحاظ سے زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ میں مسئلے کے حقیقی اسباب ڈھونڈنے کی کوشش کررہا ہوں۔ للکار کے اصل اسباب اور جدوجہد کے بنیادی اسباب تلاش کررہا ہوں۔

میں اِس جیل کی کوٹھری سے تمہیں ایک تحفہ دے سکتا ہوں جس سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں نکال سکتا۔ میں تمہارے لئے کسی تقریب کا انعقاد نہیں کرسکتا ہوں۔ میں تمہیں ایک مقبول نام اور مقبول یادوں کی تقریب کا تحفہ دے رہا ہوں۔ تم ایک قدیم ترین تہذیب کی وارث ہو۔ اِس قدیم تہذیب کو انتہائی ترقی یافتہ اور طاقتور بنانے کی بھرپور کوشش کرو، طاقتور سے میرا مطلب یہ نہیں کہ معاشرہ انتہائی خوفناک بن جائے۔ ایک خوفناک معاشرہ مہذب معاشرہ نہیں ہوسکتا۔ تہذیب کے لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ، طاقتور معاشرہ وہ ہوتا ہے جس قوم کے خصوصی جذبات اُس کی شناخت بن جائیں۔ جس نے ماضی اور حال میں مذہب اور سائنس سے جدیدیت اور تصوف سے مادیت اور روحانیت سے ہم آہنگی کرلی ہو۔ ایسا معاشرہ گھبراہٹ اور فساد سے پاک ہوگا اور تہذیب سے مالا مال ہوگا۔ اِس قسم کا معاشرہ شعبدہ بازی کے فارمولوں اور دھوکہ دہی کے ذریعے وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔ وہ روحانی یا آفاقی درشنوں اور تلاش کی گہرائی سے وجود میں آسکے گا۔ دوسرے الفاظ میں ایک غیر طبقاتی معاشرہ کی تخلیق ہونی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مارکسوادی معاشرہ ہو۔ مارکسوادی معاشرے نے خود ایک طبقاتی معاشرہ تخلیق کیا ہے۔ یورپ کے مارکسوادیوں نے موجودہ طبقاتی ڈھانچے کے ساتھ سمجھوتہ کرکے کیمونزم سے منہ موڑ لیا ہے ورنہ ایز یکو برلنگر تاریخی معاہدے کی کوشش نہ کرتا جو درحقیقت ایلڈ و موزد کے قتل کا باعث بنا۔

جب میں پاکستان کی قسمت کا نگراں تھا، میں نے اِن خصوصی قوتوں کے متعلق ابتدائی تبصرہ کیا تھا جو عالمی سطح پر سرگرم عمل ہیں۔ بعد میں 1976ء اور 1977ء مین کئی مواقع پر میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ تین خطرناک قوتیں سرگرم عمل ہیں جو کبھی آپس میں مقابلہ کرتی ہیں، کبھی آپس میں تعاون کرتی ہیں اور کبھی آپس میں محاذ آرائی میں مصروف ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں مذہب، کیمونزم اور قوم پرستی ہیں۔ یہ تینوں عوام اور اقوام کو متاثر کررہی ہیں۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ ہم بجائے اِسکے کہ چمکیلی زرہ اُوڑھ کر کسی ایک نظریہ کیلئے جہاد کریں، یہ علاقائی اور عالمی توازن کے حق میں ہے کہ ہم اُن کے ملتے جلتے نکات، میں ہم آہنگی پیدا کریں اور متنازعہ اور متضاد نکات پر تلخی اور شدت پیدا کرنے سے گریز کریں۔ میں نے مزید واضح کیا تھا کہ فن یہ ہے کہ یہ کردار اِس طرح ادا کی جائے کہ اپنا نظریہ بھی کمزور نہ ہو اور اِس سے وفاداری میں رد و بدل اور سمجھوتہ بھی کرنا نہ

تم نے ثابت کردیا ہے کہ تمہاری رگوں میں ایک بہادر سپاہی کا خون دوڑ رہا ہے

پاکستان پیپلز پارٹی
بھٹو خاندان
کی سیاسی جدوجہد

پڑے۔ اِس کا مطلب جیو اور جینے دو سے زیادہ ہے۔

جب میں پاکستان کا صدر بنا تو اُس وقت سندھو دیش کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ پاکستان میں اپنے ساڑھے پانچ سالہ اقتدار کے دوران میں نے آہستہ آہستہ لیکن کافی حد تک علیحدگی کے اِس جذبے کو غیر موثر کردیا اور نوجوانوں کے خیالات کو پاکستانی قومیت کی اصل روح میں سمو دیا۔ 1970ء کے انتخابات میں میری جماعت جو قومی پیغام کی علمبردار تھی، نے سندھو دیش تحریک کے دیوتا کو 30 ہزار ووٹوں کی برتری سے شکست دی اور یہ بھی اُن کے اپنے حلقہ انتخاب میں ہوا۔ یہ زبردست کامیابی تھی جو سندھو دیش تحریک کی آگ کو ختم کرسکتی تھی۔ میں پھر سے کہوں گا کہ یہ ایک طاقتور تحریک تھی اور مجھے ذرہ برابر بھی تعجب نہیں کہ اِس کا دائرہ کار اب تیز رفتاری

سیاسی سرگرمیاں کبھی معطل نہیں ہوتیں یہ ظاہر رہتی ہیں یا زیرِ زمین چلی جاتی ہیں

کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گزشتہ ایک برس کے عرصے میں اِس تحریک نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا ہے جو وہ ضائع کر چکی تھی۔

اِس فوجی حکومت کو یہ پتہ نہیں کہ اِس کی ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے۔ اِسکی نشاندہی وزیرِاعظم سیکرٹریٹ کو نذرِ آتش کرنے کے واقعہ سے ہوتی ہے جو مارشل لا حکمرانوں کی ناک کے نیچے تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مکمل امن وسکون ہے اِس لئے کہ سیاسی سرگرمیوں پر بندش ہے حالانکہ سیاسی سرگرمیوں کو ختم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انسان ایک سیاسی حیوان ہے اور ریاست ایک سیاسی تھیٹر ہے۔ سیاسی سرگرمیاں یا ظاہر رہتی ہیں یا زیرِ زمین چلتی ہیں۔

سیدھا سادا فوجی سپاہی صرف اِس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ریاست کے مسائل بالکل سادہ نوعیت کے ہیں اور یہ کہ بگڑے سیاست دانوں نے جان بوجھ کر اُنہیں پیچیدہ بنا دیا ہے تاکہ وہ اپنے غیر فطری سیاسی ارادوں کی تسکین حاصل کرسکیں۔ اِس صورتحال پر یقین کرتے ہوئے سادہ مزاج فوجی پیچیدہ خارجی مسائل کو حل کرنے کیلئے جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ نیک خواہشات کے جذبے کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے فریق کی پیٹھ تھپکا کر مسئلے کی سنگینی کم کرسکتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ سیاست والوں نے مسئلے کو غیر فطری طور پر اُلجھا دیا ہے اور یہ فوجی سیاسی مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جسے حل کرنے میں پیشہ ور سیاست دان ناکام رہتے ہیں۔ اِسی جذبے اور مقصد کے تحت ایوب خان، یحییٰ خان اور پھر ضیاء الحق نے تنازعہ جموں و کشمیر کو کھلے دل سے سیدھے سادے فوجی سپاہیوں کی طرح حل کرنے کی کوشش کی لیکن صورتحال یہ ہے کہ اِن میں سے ہر ایک نے دوسرے کے پیچھے معاملہ اور زیادہ اُلجھ دیا۔ اِن میں سے ہر اک اِس مسئلے کو مصنفانہ طور پر حل کرنے، سیاست دانوں کو بدنام کرنے اور لافانی شہرت حاصل کرنے کا دہرا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اُنکے اِس احمقانہ پن کے نتیجے میں عوام کو اور بھی زیادہ تکالیف اور مصائب اُٹھانے پڑے۔

جنگ کے شعلے بھڑکنے کے امکانات اِس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ تیسری عالمی لڑائی کسی بھی غیر اہم کونے سے شروع ہوسکتی ہے۔ چمپیئن پہلے ہی اکھاڑے میں پہنچ چکے ہیں۔ وہ اِس وقت ہماری نظروں سے اُوجھل ہوکر باکسنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پہلا مکا کون مار رہا ہے۔ کیا ساری لڑائی روایتی قسم کی مکابازی ہوگی؟ یہ باکسنگ ایک روایتی لڑائی کی صورت میں بھی شروع ہوسکتی ہے۔ بعد میں بڑھ کر ایٹمی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی اور اِس کا خاتمہ ایٹمی ہتھیاروں کے ذریعے ہی ہو سکے گا۔ ایٹمی ہتھیاروں کی گنجائش محدود ہے۔ اِس لئے بڑی طاقتیں ایٹمی ہتھیاروں کے سلسلے میں معاہدہ کرنے کی خواہش مند ہیں۔ بڑی طاقتیں باقی دنیا کی تباہی کو کسی بلندی سے نہیں دیکھ سکتیں۔ اس سے جزوی طور پر اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ یورپ کے جارح نوجوانوں نے چھوٹے پیمانے پر اور قسطوں میں اپنی تباہی کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ تباہی یا تو قسطوں میں یا ایک ہی چوٹ اور جھٹکے سے آجائے گی۔ یہ تو روایتی ذرائع سے یا ایٹمی ذرائع سے یا دونوں ذرائع سے آرہی ہے۔

↑ فوجی سپاہی ریاست کے مسائل کو سادہ نوعیت کے سمجھتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے ↓

تم اِس کیلئے تیاری کس طرح سے کررہی ہو؟

کیلئے تیاری تم نہ سرمایہ دارانہ نظام اور نہ ہی کیمونزم طرف داری سے کرسکتی ہو اور نہ بڑی طاقتوں میں ایک طاقت کے ساتھ خود کو منسلک کرکے کرسکتی ہو ن یہ تیاری تمہیں عوام کے ساتھ منسلک کرسکتی ۔انسان دس لاکھ ٹن سے بھی بھاری ہے۔ تمہیں ری دم تک انسانی وقار، ذاتی احترام اور مساوات لئے جدوجہد جاری رکھنا چاہیے۔ ننگے پاؤں لوگوں نقش قدم پر چل کر ایک غریب بچے کے سر میں جو ں ہے وہ تمہارا ہتھیار ہے۔ ہاری کی جھگی کی بدبو اری زہریلی گیس ہے۔ عوام کی طاقت کا اندازہ ر سے نکالی ہوئی گہری لکیر اور کارخانے میں سے تے ہوئے دھوئیں سے لگا سکتی ہو۔ نظریہ کا رسم الخط ب بھوکے انسان کی چیخوں میں سے تخلیق ہوتا ہے۔

برائے نوازش یہ نہ سمجھنا کہ میں نظریاتی اُصول ش کرنے سے گریز کررہا ہوں۔ چیئرمین ماؤزے ک نے حقائق سے سچائی تلاش کرنے کا تصور اُجاگر کیا ہے۔ میں تمہاری رہنمائی کررہا ہوں کہ تم ہمارے عاشرے کے تاریک حالات کے حقائق سے سچائی تلاش کرو۔ مسائل کی درست شناخت کے ساتھ رست حل بھی نکل آئے گا۔ وہ بنیادی دستاویزات جو یں نے لکھی ہیں اور وہ تقاریر جو میں نے وقت بوقت (پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد) کی ہیں، اُن سے مستفید ہونا۔ اُن میں سے اِس حد تک تخیل کی عکاسی ہوتی ہے اور اِس قدر خیالات اور نظریات کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم پر تنقید کرنے والوں نے بھی اِن کو بھٹوازم کا نام دے دیا۔ میں اتنا بڑا دعویٰ نہیں کروں گا۔ بہرحال میں یہ تسلیم کروں گا کہ یہ خیالات ونظریات دیسی نوعیت کے ہیں حالانکہ وہ اسلامی تاریخ کے تناظر کے اندر ہیں اور جدید حالت اور واقعات کے مطابق ہیں جنہوں نے دنیا کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ میں ایسا شخص نہیں ہوں جو ٹانگہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہو جبکہ گھوڑا آگے جارہا ہو اور میں سارے سفر میں پیچھے کی طرف دیکھتا رہوں۔ ڈرو نہیں ہمت کا زوال تہذیب کے زوال کی پہلی علامت ہے۔ تم درست قسم کے ہتھیاروں اور نظریات سے مسلح ہوگی۔ سب سے زیادہ یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی کرے۔ وہی خالق ومالک ہے۔

میں شیلے کے نظریہ وجودیت کی حمایت کرتا ہوں۔ حسن ہر جگہ موجود ہے۔ ایک مکمل تباہ کن جنگ میں بھی حسن بالکل تباہ کرنا ممکن نہیں۔ حسن اتنا حسین ہے کہ اِسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے بارہ ماہ کی اِس قید تنہائی کے کسی ناخوشگوار منظر کو مشکل سے یاد کیا ہوگا۔ ماضی کے بہت سارے مناظر میری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ماضی کے کچھ ایسے مناظر بھی یاد آگئے جو شاید کبھی میرے ذہن میں دوبارہ نہ آتے، اگر مجھے یہاں قید نہ کیا جاتا۔ مجھے بار بار بچپن کے زمانے کے واقعات یاد آرہے ہیں جو میں نے گڑھی خدا بخش میں گزارے۔ وہ سال جو میں نے بمبئی کے سکول میں گزارہ۔ وہ جلوہ دار برس جو میں نے برکلے اور آکسفورڈ میں گزارے، آگرہ کے تاج محل کی شاہانہ شان وشوکت بار بار میرے ذہن میں آرہی ہے۔ اِس طرح مجھے وہ پُرسکون دن یاد آرہے ہیں جو میں نے سرینگر گلمرگ میں گزارے تھے۔ وادی کشمیر حیرت انگیز حد تک خوبصورت ہے۔ وہ اپنے طور پر یورپ کی طرح خوبصورت ہے۔ کوئی بھی شخص وہ دلی سکون نہیں بھول سکتا جو اُس نے کرائسٹ چرچ کے لان پر چہل قدمی کرتے ہوئے محسوس کیا ہوگا اور نہ ہی کوئی شخص کیلی فورنیا میں سمندر کے کنارے کارمل کی جادوئی کشش کو بھول سکتا ہے۔

زندگی مکمل محبت ہے۔ فطرت کے ہر حسن سے عشق کیا جاتا ہے۔ میری اس بات میں ذرہ بھی ابہام نہیں ہے کہ میرا سب سے زیادہ جذباتی رومانس اپنے عوام کے ساتھ رہا ہے۔ میری سیاست اور عوام سے کبھی نہ ختم ہونے والی شادی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام ایک سیاسی حیوان ہیں اور ریاست یا مملکت ایک سیاسی تھیٹر ہے۔ میں بیس برس سے زیادہ ہنگامہ خیز عرصے میں سیاسی سٹیج پر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی مجھے کوئی رول ادا کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عوام اب بھی یہ چاہیں گے کہ میں سیاسی سٹیج پر رہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے مجبوراً سیاسی سٹیج سے الگ ہونا پڑے۔ میں تمہیں اپنے سیاسی احساسات کا تحفہ دیتا ہوں۔ میرے مقابلے میں تم بہتر طور پر جنگ لڑسکتی ہو۔ تمہاری تقریریں میرے مقابلے میں زیادہ فصیح وبلیغ ہوں گی۔ عوام کے ساتھ تمہاری وابستگی مساوی طور پر مکمل ہوگی۔ میں اِس انتہائی مقدس مشن کی برکتیں تمہیں منتقل کرتا ہوں۔ صرف یہ تحفہ ہی میں تمہیں تمہاری سالگرہ کے موقع پر دے سکتا ہوں۔

مذہب اللہ اور بندے کے درمیان خواہ انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی یا رابطہ ہے، لیکن سیاسی نظریہ صرف انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی یا رابطہ ہے۔

چار معاملات ہیں جن کے ذکر کے ساتھ ہی میں یہ خط ختم کرنا چاہوں گا۔

1۔ جب 1951ء میں میری شادی تمہاری ماں سے ہوئی تو ہنی مون منانے کیلئے میں اُسے استنبول لے گیا تھا۔ استنبول ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہ مشرق اور مغرب کے بیچ میں ایک پل ہے۔ بہرحال میں اُسے استنبول اِس لئے لے گیا تھا تاکہ میں اور و دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اسلامی تاریخ کے سنہری اور سب سے جرات مندانہ ابواب وادوار کی راہداری سے گذریں۔ اسلام کی تاریخ جذبات کو زند کرنے والی ہے لیکن جس طرح وہ ترکی میں متوا جذبات بھڑکا رہی ہے، اِس طرح کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوا۔

2۔ اپنی جوانی کے زمانے سے ہی میں برطانوی سامراجیت کے خلاف جنگ لڑتا رہا ہوں۔ مجھے سامراجیت سے سخت نفرت ہے لیکن جب بھی میں اِن ذلت آمیز دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے اندر کوئی تلخی موجود نہیں ہوتی اور وہ دور ایک بند باب کی طرح ہے۔ تم ماضی کی جدوجہد کی یاد میں تو زندگی نہیں گزار سکتیں جبکہ تم مکمل طور پر حال میں جدوجہد میں مصروف ہو۔

3۔ 15جون 1978ء کو جنرل شوکت میرے طبی معائنے کیلئے آئے کیونکہ میں بیمار تھا۔ اُنہوں نے سول وملٹری ہسپتال راولپنڈی میں میرا آپریشن کیا تھا۔ اُس وقت میں وزیر خارجہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے کلوروفام کے زیرِ اثر غنودہ ہورہا تھا تو میں بار بار کہتا رہا کہ اکبر بگٹی کو حکومت کے ہاتھوں سزائے موت نہیں ہونے دوں گا۔ میں اکبر بگٹی اور خیر بخش مری کے نام لیتا رہا۔ تاریخی واقعات کا اثر کتنا تعجب انگیز ہے؟ 1973ء میں صدر پاکستان کی حیثیت سے ملک کی خاطر اِن ہی رہنماؤں کے ساتھ میری محاذ آرائی ہوئی۔ اگر اتفاقاً تمہاری ملاقات اِن رہنماؤں کے ساتھ ہوجائے تو اُن سے کہنا کہ مجھے اِس بات پر یقین ہے کہ ایک بلوچ ایک بہادر باپ کا بیٹا اور ایک

ایسی ماں کا بیٹا ہوتا ہے جسے اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے۔ بہادری اور فخر دونوں بڑی خوبصورتی سے اِس کے چہرے پر نمودار ہوتے ہیں۔

4۔ موسم سرما میں جب تم چار سال کی تھیں، ہم المرتضیٰ کے وسیع صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ میرے ہاتھ میں دو نالی بندوق تھی۔ ایک بیرل 22 اور دوسرا 28 کا تھا۔ میں نے بنا سوچے سمجھے اچانک ایک جنگلی طوطا مار گرایا۔ جب طوطا صحن میں آ کر گرا تو تم چیخیں تھیں اور تم نے اُسے اپنی موجودگی میں دفن کروایا تھا۔ تم مسلسل چیختی رہیں اور کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ایک طوطے کی موت سے 1957ء میں لاڑکانہ میں ایک چھوٹی لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اکیس سال بعد یہ چھوٹی لڑکی ایک جوان لڑکی بن چکی ہے جس کے اعضا فولادی ہیں اور وہ ظلم کی طویل رات کی دہشت کا بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔ دراصل تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک بہادر سپاہی کا خون تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کمزوریوں سے پاک نہیں ہے۔ میں بارہ ماہ سے قید تنہائی کاٹ رہا ہوں جبکہ تین ماہ سے موت کی کوٹھری میں تمام سہولیات سے محروم ہوں۔ میں نے اِس خط کا بڑا حصہ نا قابل برداشت گرمی میں کاغذ کو اپنے گھٹنے پر رکھ کر لکھا ہے۔ میرے پاس حوالہ کیلئے کوئی مواد یا لائبریری موجود نہیں ہے۔ اِس عرصہ میں نیلا آسمان میں نے شاید ہی دیکھا ہوگا۔ حوالے اِن چند کتابوں سے لئے ہیں جن کو پڑھنے کی مجھے اجازت ہے اور اِن اخبارات اور رسائل سے لئے ہیں جو تم یا تمہاری امی اِس کوٹھری میں جہاں سانس لینا بھی مشکل ہو، ہفتے میں ایک مرتبہ ملاقات کے وقت دی جاتی ہو، میں اپنی خامیوں کو چھپانے کیلئے بہانے تلاش نہیں کر رہا۔ لیکن اِس قسم کی ذہنی وجسمانی کوفت دینے والے حالات میں حافظے پر اعتماد کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔

میں اِس وقت پچاس برس کا ہوں اور تمہاری عمر میری عمر کے نصف کے برابر ہے۔ جب تم میری عمر کو پہنچ جاؤ گی تو اُس وقت تک عوام کیلئے تمہیں دوگنی کامیابیاں حاصل کرنی چاہئیں جس طرح میں نے اُن کیلئے کیا۔ میر مرتضیٰ بھٹو جو میرا بیٹا اور وارث ہے، وہ میرے ساتھ نہیں اور نہ ہی شاہنواز اور صنم میرے ساتھ ہیں۔ میرے درد کے حصے کے طور پر اِس پیغام میں اُنہیں بھی شریک کیا جائے۔ میرے سائیں رابرٹ کینیڈی کے بیٹے کے دوست ہیں۔

ہر نسل کا اپنا کوئی بنیادی مسئلہ ہوتا ہے۔ کیا جنگ کو ختم کرنا ہے؟ نسلی ناانصافی کو مٹانا ہے یا کارکنوں کے حالات کو بہتر بنانا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دورِ حاضر کے نوجوان کو انفرادی انسانی وقار کی فکر ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ اختیارات اور طاقت کی حد بندی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسی حکومت چاہتے ہیں جو شہریوں کے ساتھ براہ راست اور دیانت داری کے ساتھ مخاطب ہو۔ امکانات بے انتہا ہیں۔ داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے۔ میں آئندہ نسل کیلئے ٹینی سن کا پیغام چھوڑ رہا ہوں "ارے میں پچاس برس کی عمر میں کیسا ہو جاؤں گا۔ اگر قدرت نے مجھے زندہ رکھا جبکہ اِس پچیس سال کی عمر میں ہی میں دنیا کی اتنی سختیاں محسوس کر رہا ہوں"......

21 جون 1978ء

ذوالفقار علی بھٹو، ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی

* * *

بھٹو خاندان کے اکثر قائدین چھوٹی عمر میں ہی انتقال کر جاتے ہیں

سندھ میں بھٹو خاندان کی بنیاد انیسویں صدی کے آغاز میں ڈوڈا خان بھٹو نے رکھی

ڈوڈا خان کی کوششوں نے بھٹو خاندان کو سندھ کے معزز خاندان میں شامل کر دیا

بے نظیر بھٹو کے خاندان کا تاریخی پس منظر مون ڈائجسٹ کی ایک تحقیقی رپورٹ

بھٹو قبیلہ اُن راجپوت مہاجروں سے پھوٹا تھا جو تقریباً چار سو سال پہلے جیسلمیر میں آباد تھے۔ جیسلمیر بھارت کی سرحدی ریاست راجستھان میں شامل ہے۔ اِس خاندان کا پہلا شخص سہتو خان بھٹو سولہویں صدی کے وسط میں آیا اور یہاں پہنچ کر اُس نے ایک گاؤں آباد کیا جس کا نام 'بھٹو' رکھا۔ اِس گاؤں کے آثار اُنیسویں صدی کے آغاز میں بالائی سندھ میں آج بھی ملتے ہیں تاہم قسمت کی دیوی اُنیسویں صدی کے آغاز میں ڈوڈا خان بھٹو کو ملی جس نے اردگرد آباد خاندانوں کے خلاف سخت جنگ لڑی تا کہ اپنے خاندان کیلئے زمین کے کچھ قطعے حاصل کر سکے۔ ڈوڈا خان کا بیٹا اللہ بخش بھٹو جیکب آباد کے قبیلہ بروی اور گڑی کھاور کے قبیلہ جمالی کے خلاف مہم چلا کر اپنی ملکی کو وسیع کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈوڈا خان بھٹو نے سندھ کے حکمران تالپور خاندان سے تعلق رکھنے والے نواب ولی محمد لغاری کے ساتھ اتحاد کر لیا اور لغاریوں سے سرپرستی کا انداز بھی چھین لیا اور جائیداد بھی حاصل کر لی۔ ڈوڈا خان شہید

بھٹو کے پڑداداتھے اور اِس علاقے میں فی الوقعی نواب سمجھے جاتے تھے۔ وہ پالکی میں سفر کرتے جسکے ساتھ اُسے اُٹھانے والے چاکروں کا ایک قافلہ بھی چلا کرتا تھا۔ یہ سواری اُن دنوں صرف حکمران تالپور خاندان یا روحانی پیر پگاڑا کیلئے مخصوص تھی۔ ڈوڈا خان کی متعدد کوششوں نے بھٹو خاندان کو سندھ کے معزز خاندانوں میں شامل کردیا اور معززین کا یہ درجہ اِس خاندان کے پاس آج تک ہے۔

اِس خاندان میں ایسے الزامات کا ذائقہ پہلے بھی چکھا جاچکا تھا جو ذوالفقاعلی بھٹو پر لگائے گئے۔ بھٹوشہید کے دادا غلام مرتضٰی پر بھی قتل کا الزام لگایا گیا تھا۔ قائدعوام اور اُسکے قریبی ساتھی اِسکے بارے میں بھی یہی کہتے تھے کہ یہ الزام بھی اُن کے پردادا پر اُن کے سیاسی دشمنوں نے ہی لگایا تھا۔ اِس خاندان کی روایت کے مطابق اُن پر بھی ایک ایسے سیاسی منصوبہ کی بنیاد پر مقدمہ بنایا گیا جو مقامی برطانوی احکام نے تیار کروایا تھا۔ میر غلام مرتضٰی اِس مقدمہ سے بری ہوگئے۔ اُنکی جائیداد اور زمینیں بحال کردی گئیں لیکن اِس سے اِن کو تھوڑا سا فائدہ ہی پہنچا کیونکہ وہ صرف 31 برس زندہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کو زہر دے دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ بھٹو خاندان کے اکثر قائدین چھوٹی عمروں میں ہی انتقال کرجاتے تھے اور جناب بھٹو ہمیشہ اِس حقیقت کو یاد رکھتے تھے۔ اُنہیں ہمیشہ یہ تلخ حادثے یاد رہتے کہ اُن کے دو بھائی سکندر، امداد اور بجے الٰہی بخش اور واحد بخش پچاس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے، اس لئے ذوالفقار علی بھٹو عموماً کہا کرتے تھے کہ وہ پچاس سال کی عمر سے زیادہ نہیں جیئں گے اور جو کارنامے کرنا چاہتے ہیں، اُنہیں اِس عمر تک پہنچنے سے پہلے سرانجام دیں گے۔ اُن کی یہ پیش بینی واقعی درست ثابت ہوئی کیونکہ وہ صرف 49 سال کے تھے کہ فوج نے زبردستی اقتدار پر قبضہ کرلیا اور 51 سال کے تھے کہ 4 اپریل 1979ء کو اُنہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو ضلع لاڑکانہ میں واقع اپنے گاؤں گڑھی خدا بخش میں 3 مارچ 1888ء کو پیدا ہوئے۔ پنجاب اور دیگر علاقوں میں اپنے والد کی جلاوطنی کے دوران شاہنواز اور اُنکے بھائی علی گوہر کی پرورش اُنکے چچا رسول بخش بھٹو کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ شاہنواز بھٹو کو مدرستہ الاسلام لاڑکانہ اور اِسکے بعد سینٹ پیٹرک ہائی سکول کراچی میں تعلیم دلائی گئی۔ غلام مرتضٰی بھٹو کی قبل از وقت موت کی وجہ سے شاہنواز بھٹو کو کراچی سے صرف چھ سال کی تعلیم کے بعد واپس آنا پڑا تاکہ اپنی زمینوں کا کاروبار سنبھالیں۔ اِس کے بعد وہ کبھی باقاعدہ تعلیم نہ حاصل کرسکے لیکن انگریزی زبان پر اُنہوں نے کافی عبور حاصل کرلیا جسے اُنہوں نے روانی سے بولنا سیکھ لیا تھا۔

اپنی زمینوں کو سنبھالنے کے بعد شاہنواز جوانی میں ہی سیاسی اکھاڑے میں اُتر آئے اور مستقل مزاجی سے چلتے چلتے اہم حیثیت تک پہنچ گئے۔ 1919ء میں جب وائسرائے ہند کی امپریئل کونسل کا سندھ سے تعلق رکھنے والا نمائندہ فوت ہوگیا تو وہ اُس کی جگہ بلامقابلہ منتخب ہوگئے۔ 1920ء میں مقامی ڈسٹرکٹ بورڈوں کو جمہوری شکل دی گئی اور لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات ہوئے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کا یہ عہدہ ضلع کا سب سے طاقتور عہدہ تھا۔ شاہنواز بھٹو نے اِس کا انتخاب لڑا اور ایک بار پھر بلا مقابلہ منتخب ہوگئے۔ اِن اہم پوزیشنوں پر شاہنواز بھٹو کی کامیابی

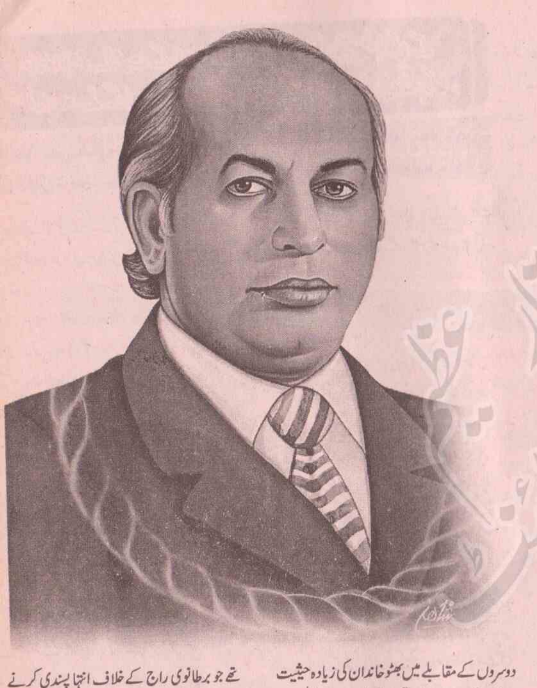

دوسروں کے مقابلے میں بھٹو خاندان کی زیادہ حیثیت اور قوت کی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ لاڑکانہ ضلع میں خصوصی طور پر نمایاں حیثیت رکھنے والے خاندان آباد تھے جن میں چانڈیو، مگسی قمبر کے اسران ڈوگری کے بھیگہ میٹرھ کے جتوئی سہون کے لکھیاری اور طبیب کے دیوان شامل تھے۔

شاہنواز بھٹو کوئی ریڈیکل نظریات نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ان عزت دار سیاست دانوں میں سے ایک تھے جو برطانوی راج کے خلاف انتہا پسندی کرنے والوں کا ساتھ دینے کی بجائے انگریز سے تعاون کرکے حقوق حاصل کرنے کی پالیسی پر چلتے تھے۔ وہ یقیناً ایک نمک حلال مسلمان رہنما تھے لہٰذا وہ کانگریس کے سخت مخالف تھے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی بہت سی کمیٹیوں اور گروپوں کو متحرک کیا اور مسلمانوں کے مقاصد کیلئے حوصلے کے ساتھ لڑتے رہے۔ وہ قائداعظم اور خصوصاً ماہر تعلیم محمد علی جوہر کے قریبی

شاہنواز بھٹو نے محبت کے باعث ایک متوسط گھرانے کی غیر مسلم لڑکی کے مسلمان ہونے کے بعد اس سے شادی کی اور اس کا اسلامی نام خورشید بیگم رکھا

والفقار علی بھٹو کی والدہ سر شاہنواز کی دوسری بیوی خورشید بیگم تھیں یک طویل عرصہ تک خورشید بیگم کو بھٹو فیملی کی مذمت کا سامنا کرنا پڑا

وست تھے۔ محمد علی جوہر نے تو نزع کے عالم میں بھی پنے دوستوں میں سے صرف سر شاہنواز بھٹو کو ہی پاس ھایا تھا۔

شاہنواز بھٹو جب 49 سال کے ہوئے تو نہوں نے سیاست چھوڑ کر بمبئی پبلک سروس کمیشن یں شمولیت اختیار کی۔ یہ وہی عمر ہے کہ جس میں اُن کے صاحبزادے ذوالفقار علی بھٹو سے حکومت چھین کر مارشل لالگایا گیا۔ سیاست سے کنارہ کش ہوتے وقت شاہنواز بھٹو نے جو بیان جاری کیا، وہ اِس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ 1937ء کے انتخاب میں سیاسی جوڑ توڑ سے پریشان ہونے کی وجہ سے وہ کس قدر مجروح ہوئے تھے۔ اِس بیان میں اُنہوں نے کہا:

”مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ سندھ کے لوگوں کو الوداع کہنا پڑا ہے۔ اپنی ساتھی رعیت کیلئے میں نے وہ سب کچھ کیا جو میرے بس میں تھا اور اِس سارے عمل میں سب سے زیادہ نقصان اپنے آپ کو پہنچایا۔ میں سیاسی غیرت اور رقابت کی وجہ سے اِس صوبے کو خدا حافظ کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے دوستوں سے گذارش کرتا ہوں کہ میں اُن سب کو آج اپنی آنکھ کے تارے سمجھتا ہوں اور ساتھ ہی دشمنوں سے کہتا ہوں کہ اُن کیلئے بھی میرے اندر عداوت نہیں ہے۔

انتخابات میں شکست سے پیدا ہونے والی صورت حال اور لوگوں کی ناشکری کئی برس تک سر شاہنواز بھٹو کے ذہن پر چھائی رہی۔ اُس وقت ذوالفقار علی بھٹو 9 برس کے تھے۔ بھٹو شہید نے ایک بار مجھ سے کہا تھا:

”میرے والد چونکہ گورنر سندھ کے مشیر تھے۔ اِس کیلئے اُنکی انتخابی مہم کے دوران ہم اُس رہائش میں رہتے تھے جو وزیرِاعلیٰ کیلئے مخصوص تھی۔ یہ گھر اکثر مہمانوں سے بھرا رہتا تھا کیونکہ لوگ ہر وقت یہاں آتے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس روز جب میں گھر پہنچا تو گھر کی ہر چیز اُجڑی اُجڑی سی پڑی تھی اور میں نے اپنے ملازم سے پوچھا کہ کیا بات ہے، کیا ہوگیا ہے تو اُس نے کہا تھا: ”جناب سر صاحب کو الیکشن میں شکست ہوگئی ہے“

ذوالفقار علی بھٹو نے اِس بات کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ اُن کے والد کس ابتلا سے گزرے تھے۔ یہ شکست اُن کے خاندانی وقار کیلئے ندامت کا باعث تھی اور ذوالفقار علی بھٹو نے عہد کرلیا تھا کہ وہ اِس وقار کی لاج رکھیں گے۔ دوسری طرف ایوب کھوڑو جیسے سیاسی دشمنوں نے کسی بھی موقع پر اُنہیں اپنی بے رحم طنز کا نشانہ بنانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ تاہم پھر کئی سال بعد 1970ء کے انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو اور ایوب کھوڑو ایک بار پھر لاڑکانہ کے پرانے میدان جنگ میں اُترے۔ اب نتیجہ ڈرامائی طور پر مختلف نکلا۔ کھوڑو چالیس ہزار ووٹوں سے ہار گئے یہاں تک کہ اُنکے اپنے پولنگ سٹیشن عاقل پر بھی اُنہیں شکست ہوگئی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دادا میر مرتضیٰ بھٹو، والد شاہنواز، بھائی سکندر اور امداد کے پورٹریٹ بنوا کر المرتضیٰ میں آویزاں کیے تھے

ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی بیٹی کا نام اپنی بہن بےنظیر کے نام پر رکھا تھا جو نوعمری میں ہی فوت ہوگئی تھی

1947ء میں شاہنواز بھٹو جوناگڑھ چلے گئے جو گجرات کے ساحلی علاقہ پر واقع شہزادوں کی ایک ریاست تھی جہاں 8 نومبر 1947ء کو وہ اپنے تمام خاندان سمیت پاکستان آگئے۔ پھر دس برس بعد 19 نومبر 1957ء کو جب اُنکے صاحبزادے ذوالفقار علی بھٹو اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کررہے تھے تو سر شاہنواز بھٹو کا انتقال ہوگیا۔

شاہنواز بھٹو اشتعال کا سامنا کرتے ہوئے گہرے صبر کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی جارحانہ الفاظ میں گفتگو کرنے سے اجتناب کرتے تھے اور اُس وقت بھی کسی سے انتقام لینے کی بات نہ کرتے جبکہ اُنہیں پتہ بھی چل جاتا کہ اُن کے فلاں فلاں دشمنوں نے اُنہیں نقصان پہنچایا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو 5 جنوری 1928ء کو تین بجے صبح بھٹو خاندان کی لاڑکانہ والی رہائش گاہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی پیدائش کے وقت اُن کا ستارہ برج جدی میں تھا جس پر کٹھور اور غمگین سیارہ زحل کی حکمرانی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش کا جشن اِس دھوم دھام سے منایا گیا، جو عمومی طور پر بڑے سندھی خاندانوں کے گھر بیٹے کی پیدائش کیلئے مخصوص ہوتی ہے۔ کئی روز تک المرتضیٰ کے دروازے اِن رشتے داروں، دوستوں اور خیر خواہوں کیلئے کھلے رہے۔ جو نہ صرف نوڈیرو اور گڑھی خدا بخش سے آئے بلکہ میر پور گوٹھ، سکھر، ٹھٹھہ اور جیکب آباد جیسے دور دراز شہروں سے بھی آتے رہے۔ روایت کے مطابق اِس بچے کا نام ایک مقامی بزرگ کی سرپرستی میں لاڑکانہ کی مسجد میں جا کر رکھا گیا جہاں تلاوت کلام پاک کے بعد شاہنواز بھٹو نے حاضرین کے مجمع سے مخاطب ہو کر اعلان کیا کہ اِس بچے کو ”ذوالفقار علی بھٹو“ کے نام سے پکارا جائے گا۔ ذوالفقار وہ نام تھا جو حضرت علیؓ نے اپنی تلوار کو دیا تھا۔ تاریخی طور پر اِس تلوار کا احترام جبر کے خلاف جدوجہد کی علامت کے طور پر کیا جاتا تھا اور یہ اُن لوگوں کیلئے خصوصی اہمیت رکھتی تھی جو اِس قسم کی روایات والے حالات کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔

شاہنواز بھٹو کیلئے ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش خصوصی اہمیت رکھتی تھی کیونکہ وہ اُن کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے پہلے بیٹے تھے۔ اُن کی دوسری بیوی کی کہانی یہ ہے کہ 1924ء میں شاہنواز بھٹو نے محبت کے باعث ایک متوسط خاندان کی غیر مسلم لڑکی کے مسلمان ہوجانے کے بعد اُس سے شادی کرلی۔ اُن کی اِس دوسری بیوی کا اسلامی نام خورشید بیگم رکھا گیا۔ خورشید بیگم مستقبل کے عظیم عوامی قائد ذوالفقار علی بھٹو کی والدہ تھیں۔ اُن کے ساتھ شاہنواز بھٹو کا نکاح کوئٹہ میں قلات کے نواب بہادر

ذوالفقار علی بھٹو کے دادا غلام مرتضیٰ پر بھی قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا

اعظم جان کی رہائش گاہ پر ہوا۔ خورشید بیگم کا متوسط حسب نسب بھٹو خاندان کیلئے ایک مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اِس خاندان کے لوگ کافی لمبے عرصے تک خورشید بیگم اور شاہنواز بھٹو کے رشتے کی مخالفت کرتے رہے۔ یہ مخالفت اِس حد تک کی گئی تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو نوعمری کے زمانے میں ہی اِس احساس سے واقف ہوگئے جو بھٹو خاندان نے اُن کی والدہ کے ساتھ روا رکھا۔ والدہ کے کرب اور دُکھ نے ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے اور وہ ساری زندگی اپنی والدہ کے ساتھ ہونے والے سلوک میں پوشیدہ درد کو فراموش نہ کر سکے۔ شہید بھٹو کی ماں کا واحد قصور غربت تھا۔ یہ بات اُنہوں نے خود مجھے بتائی اور کہا کہ غریبوں کی خوشحالی کی طرف میرا رجحان اِنہی باتوں کی وجہ سے ہوا جو میری والدہ مرحومہ جاگیردارانہ نظام کی اُونچ نیچ کے بارے میں مجھے بتایا کرتی تھی۔ بہرحال شاہنواز بھٹو اور خورشید بیگم زندگی بھر ایک دوجے کا ساتھ نبھاتے رہے۔ شاہنواز بھٹو کے گھر آنے جانے والے لوگ بتاتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی والدہ ایک محبت کرنے والی اور پرکشش شخصیت تھیں اور اُن کے گھر کا ماحول بھی انتہائی پرکشش تھا۔

شاہنواز بھٹو نے اپنے اِس چھوٹے بیٹے پر دل کھول کر توجہ دی۔ ایوب کھوڑو اپنی پرانی باتیں یاد کرکے بتاتے ہیں کہ شاہنواز جب کبھی بھی گاؤں آتے تو اپنے اِس چھوٹے بیٹے کو ساتھ رکھتے اور اُس کے تعلیمی کارناموں پر فخر کیا کرتے تھے۔ چونکہ اُن کی اپنی تعلیم بہت معمولی تھی اِس لئے وہ اپنی جگہ ذوالفقار کی شاندار کامیابیوں پر خوشیاں مناتے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے اپنے بیٹے کو برکلے یونیورسٹی کیلی فورنیا اور آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ میں وہ تعلیم دلائی جو معززین کیلئے مخصوص تھی۔ یوں لگتا ہے کہ بھٹو شہید کی کامیابیوں نے بوڑھے باپ کی اُن مایوسیوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا جو صرف اُن کے دو بڑے بیٹوں سکندر اور امداد کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ دونوں نوجوانی کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔

خاندانی ورثے اور تاریخ کے تانے بانے سب کے سب شاہنواز بھٹو کیلئے خصوصی اہمیت رکھتے تھے اور یہ سب اُنہوں نے اپنے بیٹے کو منتقل کر دیئے تھے۔ پھر ذوالفقار علی کے بیٹے کا نام رکھنے کا فیصلہ بھی شاہنواز بھٹو نے خود کیا اور دوسرا بیٹا شاہنواز بھٹو جسے 1985ء میں پیرس میں قتل کر دیا گیا تھا، اپنے دادا کی موت کے بعد پیدا ہوا تھا اور اُس کا نام ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے والد کے نام پر رکھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی بیٹی کا نام اپنی بہن 'بے نظیر' کے نام پر رکھا جو دس سال کی عمر میں فوت ہوگئی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دادا غلام مرتضیٰ بھٹو، والد شاہنواز اور بھائی سکندر اور امداد کے پوٹریٹ بنوائے تھے جو لاڑکانہ میں اُن کی رہائش گاہ المرتضیٰ میں لٹکے ہوئے ہیں۔

شاہنواز بھٹو کو فرانس میں قتل کیا گیا

فرانس کی انٹیلی جنس تمام وسائل کے باوجود شاہنواز کے قاتل کا سراغ نہ لگا سکی

شاہنواز بھٹو کی افغان بیوی ریحانہ کے پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں سے روابط تھے

شاہنواز کو جب بیوی کے ان روابط کا پتہ چلا تو ان کے آپس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے

شاہنواز بھٹو کی زندگی اور ان کے پراسرار قتل پر مون ڈائجسٹ کی خصوصی رپورٹ

بھٹو فیملی کے دوسرے مقتول میر شاہنواز بھٹو تھے۔ شاہنواز کو جہاں وارثتی طور پر گفتار پر قدرت حاصل تھی، وہاں قدرت نے اُنہیں منفرد مزاج عطا کیا تھا۔ بچپن سے ہی اُن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز نہایت خوبصورت و نفیس تھا۔

جس کا واضح ثبوت وہ...... کانفرنس ہے جو شاہنواز بھٹو نے صرف بارہ برس کی چھوٹی و معصوم عمر میں کی۔ اِس پریس کانفرنس میں میر شاہنواز بھٹو نے اِس طرح منطق و استدلال سے کام لیا کہ بعد ازاں...... شہید جمہوریت ذوالفقار علی بھٹو اپنی انتخابی مہمات میں میر شاہنواز بھٹو کو ساتھ رکھتے تھے جس کی بنیادی وجہ صرف زور بیان نہیں تھا بلکہ اپنی ذمہ داریوں سے کماحقہ آگاہی تھی۔ میر شاہنواز کو سیاست سے خاص لگاؤ تھا۔

امریکن سکول اسلام آباد میں طلبا کی یونین کا کوئی رواج و تصور نہ تھا۔ یہاں شاہنواز بھٹو نے...... طلبا کی یونین سازی کی بنیاد رکھی۔ نہ صرف یونین کی ابتداء کی بلکہ طلبا یونین کو مضبوط و مربوط بنیادوں پر استوار کر دیا۔ بعدازاں شاہنواز بھٹو نے یہاں پر نچلے طبقے کے ملازمین...... کے جائز حقوق اور جائز مراعات کیلئے بھی یونین قائم کی حتیٰ کہ طلباء و ملازمین کے جائز حقوق کیلئے ایجی ٹیشن بھی کروایا جس پر امریکن سکول اسلام آباد کے پرنسپل نے ذوالفقار علی بھٹو سے شکایت کی جس پر شہید بھٹو نے شاہنواز کی نہ صرف زبانی کلامی سرزنش کی بلکہ عملاً امریکن سکول اسلام آباد سے امریکن سکول ایبٹ آباد منتقل کر دیا۔

لیکن یہاں بھی سیاسی طبع و سیاسی رجحان کا عمل

شاہنواز بھٹو کو 27 سال کی عمر میں قتل کر دیا گیا وہ سول سوسائٹی کی بالادستی چاہتا تھا

جاری رہا۔ یہاں نئے سرے سے یونین سازی کی اور ایک مرتبہ نوبت پھر ایجی ٹیشن تک جا پہنچی۔ دوبارہ شکایت اور دوبارہ سزا یقینی تھی لہٰذا میر شاہنواز بھٹو کو بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھجوا دینے کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ بیرون ملک جانے سے قبل میر شاہنواز بھٹو نے حسن ابدال کیڈٹ کالج سے فٹنس اور ایکسر سائز کا چند ہفتوں پر مشتمل کورس مکمل کیا۔ حسن ابدال کیڈٹ کالج سے...... مذکورہ کورس مکمل کرنا اور امتیازی نمبروں سے پاس کرنا چونکہ مشکل کام تھا اور ایک اعزاز تھا جسکی توقع ایک وزیراعظم کے بیٹے سے نہیں کی جا رہی تھی۔ اِس کامیابی پر بھٹو فیملی کے افراد کو ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ بیرون ملک تمام افراد خانہ نے ہاورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی لیکن میر شاہنواز بھٹو نے اپنی فیملی کے برعکس...... اپنے لئے سوئزرلینڈ کے شہر لائزن کے امریکن سکول کو منتخب کیا۔

شہید میر شاہنواز بھٹو طبقاتی اُونچ نیچ، ذات پات کے فرق سے سخت نفرت کرتے تھے۔ غریبوں کے دکھ درد کا ساتھی بننے کا عزم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس دکھ درد کو سمجھنے کیلئے ایک مرتبہ میر شاہنواز بھٹو اپنے بڑے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کے ہمراہ لاہور کے دُور دراز علاقوں بالخصوص اِن علاقوں میں نکل گئے جہاں غربت وافلاس کے ہاتھوں میں انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ قبر نما جھونپڑوں میں زندگی سانس لینے پر مجبور تھی اور جہاں انسانیت کے زوال کے ساتھ تعفن وگندگی اپنے عروج پر تھی۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو کئی گھنٹے تک اِس طرح کے بھیانک منظر دیکھتے رہے، دوپہر کو سڑک کنارے زمین پر بیٹھ کر نان چنے کھائے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا" کیسے اِن لوگوں کے حالات بہتر کئے جا سکتے ہیں؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم صدیوں پرانے زمانے میں آ گئے ہیں"...... تو میر شاہنواز نے فوراً کہا" ہمیں بدلنا ہے، یہ سب کچھ بدلنا ہے۔ یہ اُس وقت ممکن ہوگا کہ جب ہم اِن لوگوں کے درمیان کام کریں گے"......

شاہنواز بھٹو، بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ

روایات کو توڑنا انفرادیت ہوا کرتی ہے اور یہی انفرادیت انسان کو منفرد بناتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ شاہنواز بھٹو نے 70 کلفٹن کے لان کے ایک کونے پر گھاس اور تنکوں کی ایک جھونپڑی بنوائی، بغیر بستر کے۔ اِس میں ایک چارپائی بچھوا دی۔ میر شاہنواز بھٹو گھنٹوں اِس چارپائی پر سوتے اور سوچتے رہتے۔ گرمی اور موسمی تکالیف کا اندازہ کرتے اور اِن تکالیف کا موازنہ اُن لوگوں کی تکالیف سے کرتے جو اپنی تمام زندگی اِن تکلیفوں اور اذیتوں سے عبارت کر رہے تھے......

"علاوہ ازیں" المرتضیٰ میں...... اسکاؤٹنگ کیمپ اُن کی عام انسانوں جیسی زندگی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ جہاں میر شاہنواز بھٹو اپنے تمام کام خود کرتے اور ہر شام اپنے ملازمین کے ساتھ اِن تکالیف وپریشانیوں پر گفتگو کرتے۔ علیٰ ہٰذاالقیاس اِن تمام باتوں کو ریسرچ ورک کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اِس ریسرچ ورک اور عملی ایکسر سائز سے دکھ درد کو سمجھنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تا کہ آئندہ وقتوں میں سول سوسائٹی کی مجبوری ومقہوری کو آزادی سے تعبیر کیا جا سکے مگر افسوس کہ وقت نے مہلت نہ دی۔ دوسروں کے درد والم کو ختم کرنے کی خواہش رکھنے والا خود جلاوطنی کا شکار ہوگیا۔ سراغ رسانی کے نظام سے دلچسپی رکھنے والا خود سراغ رسانی کی زد میں آ گیا

"جیسا کہ قیام پاکستان سے قبل ہندی حلقہ تاریخ اور قیام پاکستان کے بعد پیپلز پارٹی کی شروعات تک غیر متنازعہ وغیر جانبدار تحقیق سے واضح

21 اگست 1985 کو بے نظیر بھٹو اپنے چہیتے بھائی کا تابوت لیکر پاکستان پہنچیں

ہے کہ بوجوہ حکمران خواہ اُن کا تعلق قیام پاکستان سے قبل تھا یا قیام پاکستان کے بعد ''سول سوسائٹی'' کی مضبوطی سے قاصرر ہے''

اِسی لئے یہ کہنا درست ہے کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو...... سول سوسائٹی کی مضبوطی کیلئے جنگ لڑتے ہوئے تختہ دار تک جا پہنچے۔ بلکہ یوں کہنا میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے کہ ''شہید ذوالفقار علی بھٹو نہیں بلکہ عوام کی حکومت، عوام کیلئے، عوام کے ذریعے تختہ دار تک جا پہنچی۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کا عدالتی قتل دراصل جمہوریت، غریب عوام کی اُمیدوں اور سول سوسائٹی کی مضبوطی کا قتل تھا۔ عظیم والد، عظیم قائد اور مجبور عوام کی اُمید کو رجعت پسندوں نے بین الاقوامی سازش کے تحت جس سفاکی و بربریت سے قتل کیا، اُسکے بعد بحیثیت جرات مند بیٹے میر شاہنواز بھٹو نے اپنے والد کے افکار اور مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے ''عملی'' جدوجہد کا آغاز کیا۔ میر شاہنواز بھٹو نے اپنی اِس جدوجہد کے دوران یورپ میں ایک انٹرویو دیا۔ اِس انٹرویو کا ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ اُن کی جدوجہد کی وجہ و مقصد کا عکاس ہے۔

''یہ درست ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو میرے والد ہیں۔ اُنہیں شہید کیا گیا ہے۔ لیکن میں اِس سارے عمل کو قوموں کی آزادی کے تاریخی عمل کے حوالے سے دیکھتا ہوں۔ ذوالفقار علی بھٹو تاریخ کا ایک عمل ہیں۔ اُنہوں نے پاکستان کے غریب، بے بس اور مجبور انسانوں کو ظلم و جبر سے نجات دلانے کی جدوجہد کی ہے۔ اُنہوں نے تیسری دنیا کی غلام قوموں کے سامراج کے خلاف زبردست جنگ کا ساتھ دیا ہے۔ اُنہوں نے اسلامی دنیا کے عوام کو خواب غفلت سے جگانے کی کوششوں میں بھرپور حصہ لیا ہے، نیز دنیا کو ظلم وستم کی آماجگاہ بنانے کے خلاف جنگ میں سپاہی کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی ہے۔ اُنہوں نے جہالت کے خلاف مادی طور پر جنگ میں حصہ لیا ہے۔ وہ تاریخی عمل کے ساتھ چلے۔ اُنہوں نے تاریخ کے عمل کو تیز کیا ہے۔ اُن کا قتل تاریخی عمل کا قتل ہے۔ حریت فکر کا قتل ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کی جدوجہد کا قتل ہے۔ یہ محض ایک شخص کا قتل نہیں ہے'' ......

''میر شاہنواز بھٹو'' نے اپنے شہید والد کا تاریخی عمل، فکر حریت اور تیسری دنیا کے ممالک کی ترقی وحقوق کی پاسداری کیلئے نیز جمہوریت کی بحالی کیلئے ایک ظالم آمر اور اُسکے حواریوں سے نجات کیلئے افغانستان، لیبیا، شام اور فرانس تک کے سفر کیے۔ یقیناً یہ کام شاہنواز کا شوق نہیں تھا بلکہ اِس نظریے کی پاسداری تھی...... جو شہید ذوالفقار علی بھٹو کا مشن تھا۔ اِسی فطری رویے کے پیش نظر...... شاہنواز نے پاکستان کے جمہوریت پسند جوانوں کو کابل میں اکٹھا کرنا شروع کیا۔ بعد ازاں اُنکی نظریاتی تربیت کی تاکہ وہ پاکستان میں موجود آمر اور اُسکے حواریوں کا سامنا کر سکیں اور اسلامی 'جمہوری' مملکت پاکستان سے آمریت کا خاتمہ کر سکیں۔ شاہنواز بھٹو اپنا یہ مقصد مکمل کرنے کیلئے عزم و استقلال، جرات، حوصلہ، اور جنونی جذبہ کے تحت اپنا یہ کام سرانجام دیتے رہے۔ شاہنواز جمہوریت پسند ساتھیوں کے ساتھ آزادی جمہوریت کی جنگ لڑنے کیلئے خود کو اور ساتھیوں کو سخت آزمائشوں سے گزارتے۔ جذبے کا یہ عالم تھا کہ کابل میں کرفیو نافذ تھا۔ ہر طرف روسی فوج کا محاصرہ تھا لیکن خود کو آزمانے کی غرض سے شاہنواز رات گئے سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے۔

میر شاہنواز بھٹو سے اُن کی افغان نژاد اہلیہ اکثر و بیشتر اصرار کرتیں کہ وہ کابل اور شام میں اپنی سرگرمیاں ختم کر کے امریکہ منتقل ہوجائیں اور اپنا کاروبار شروع کرلیں لیکن شاہنواز بھٹو اِس مشورے کو سختی سے رد کردیتے اور ہمیشہ اُن کا ایک ہی جواب ہوتا کہ ''میں اپنے وطن کے مظلوم و بے بس لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ اُن کی آزادی (جمہوریت) کیلئے ہمہ وقت جدوجہد کرتا رہوں گا۔ مجھے اپنے والد کا مشن مکمل کرنا ہے خواہ اِس میں اُن کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

ذوالفقار علی بھٹو اپنی انتخابی مہمات میں شاہنواز کو اپنے ساتھ رکھتے تھے

کابل میں میر شاہنواز بھٹو اور میر مرتضٰی بھٹو کی بیگمات کے خاندانی ملازم نے دونوں بھائیوں کے کھانے میں زہر ملا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کھانا وفادار کتے نے کھایا اور چند لمحوں میں مر گیا۔ بعد ازاں اِس سازش کو بے نقاب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اِس ملازم کو افغانستان کے ایک گروہ نے خطیر رقم دی تھی کہ وہ دونوں بھائیوں میر شاہنواز بھٹو اور میر مرتضٰی بھٹو کو قتل کردے تاکہ وہ گروہ اُس وقت کے پاکستانی آمر اور اُسکے حواریوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکے۔ میر شاہنواز بھٹو اور میر مرتضٰی بھٹو نے اِس ملازم کو آخر وقت تک اِس لئے زندہ چھوڑ دیا کہ اِن دونوں بھائیوں کی بیگمات نے اِس کو معاف کردینے کی سفارش کی تھی۔

اِسی طرح کابل کی شاہراہ پر دوران سفر شہید بھٹو کے صاحبزادوں کو قتل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی۔ گولی چلائی گئی لیکن خوش قسمتی سے نشانہ خطا ہوا اور کار کی سیٹ میں گولی پیوست ہوئی۔ اِس کے بعد شاہنواز بھٹو اور میر مرتضٰی کو اطلاع ملی کہ پانچ کمانڈوز پر مشتمل ایک دستہ تیار کیا گیا ہے تاکہ میر مرتضٰی بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو کو قتل کیا جا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ بے نظیر بھٹو نے میر شاہنواز بھٹو کو کئی مرتبہ مشورہ دیا کہ ''وہ عملی جدوجہد کی بجائے سیاسی جدوجہد کا آغاز کریں'' لیکن شاہنواز بھٹو ہمیشہ اِس مشورے کی نفی کرتے۔ شاہنواز بھٹو کا فطری رجحان و میلان جاسوسی کی طرف تھا۔

رپورٹس تیار کرنے اور مخالفین کی رپورٹس حاصل کرنے نیز مخالفین کی دہشت گرد کاروائیوں اور منصوبوں کو ناکام کرنے میں اُنکا ذہن جادوئی طاقت رکھتا تھا۔ یہ اِسی جادوئی طاقت کا رد عمل تھا کہ ضیاء الحق جو منصوبہ بندی کرتے اور ٹھکانے لگانے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا، 1979ء سے 1984ء تک میر مرتضٰی بھٹو بالخصوص میر شاہنواز بھٹو کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ 10 جنوری 1984ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کو علاج کیلئے بیرون ملک جانے کی اجازت ملی۔ یہ یقیناً ضیاء الحق کے سازشی ذہن کی شکست کے اور...... دہشت گردی کی وارداتوں کو ناکام بنانے والے شاہنواز بھٹو کے ذہن کی فتح تھی...... ''کیونکہ''

ضیاء الحق اور اُن کے حواریوں کے خیال میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی رہائی شاہنواز بھٹو اور میر مرتضٰی کے جوش کو ٹھنڈا کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ بیگم نصرت بھٹو ایم آر ڈی کی تحریک کی ناکامی سے خاصی دلبرداشتہ تھیں اور پھر جب تک افغانستان میں روس کی فوج موجود ہے، ضیاء الحق کو منظر سے ہٹانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اِسی دوران ضیاء الحق نے مجلس

شوریٰ کا نظام متعارف کرایا۔ 1981ء تا 1985ء تک یہ نظام چلتا رہا۔ اسلامی نظام کے نفاذ پر جنرل ضیاء الحق نے 1984ء میں ریفرنڈم کا انعقاد کیا اور آئندہ پانچ سال کیلئے صدر بن بیٹھا۔ 1984ء کے آخر میں میر شاہنواز کی پالیسیوں سے پریشان و عاجز ہوکر ضیاء الحق نے اپنے حواریوں کے ذریعے میر مرتضیٰ اور بالخصوص میر شاہنواز کو پیغام بھجوایا کہ ”اگر میرے (ضیاء الحق) قتل کرنے کی منصوبہ بندی کا سلسلہ جاری رہا تو اِسی قسم کی کاروائی بھٹو خاندان کے خلاف بھی کی جاسکتی ہے“

یہ الگ بحث ہے کہ ضیاء الحق بھٹو خاندان کے خلاف اِس کاروائی کو شہید ذوالفقار علی بھٹو کی صورت میں عملی مظاہرہ کرچکا تھا۔ نیز ضیاء الحق...... پانچ تربیت یافتہ کمانڈوز کے ذریعے میر شاہنواز اور میر مرتضیٰ کے درپے تھا۔ مختصراً یہ کہ جنوری 1985ء میں ضیاء الحق کو آگاہ کیا گیا اور طے پایا کہ اِس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کی یہی خواہش تھی کیونکہ ضیاء الحق ماضی کی طرح ایک مرتبہ پھر انتخابات کی تاریخ کا اعلان کرچکا تھا۔ اِس مرتبہ ضیاء الحق نے غیر جماعتی انتخابات کرادیئے جس کا پیپلز پارٹی نے بائیکاٹ کیا۔

5 مارچ 1985ء کو ناصر بلوچ اور 26 مارچ 1995ء کو ایاز سموں کو پھانسی دی گئی۔ اُنکی پھانسی کے بعد شاہنواز ایک مرتبہ پھر سرگرم ہوگئے۔ اب شاہنواز بھٹو بے گناہوں کے قتل پر خاموش تماشائی نہیں بن سکتے تھے۔ اِسکا اظہار اُنہوں نے اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو سے کیا۔ جب اِس بات کا علم محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی ہوگیا کہ میر شاہنواز بھٹو ذہنی اُلجھن اور کشمکش کا شکار ہے تو جولائی 1985ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو اور اُن کی والدہ بیگم نصرت بھٹو فرانس کے شہر کینز پہنچ گئیں جہاں میر مرتضیٰ بھٹو پہلے سے موجود تھے۔ بعد میں صنم بھٹو بھی فرانس پہنچ گئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ:

میر شاہنواز بھٹو کی ازدواجی زندگی 1981ء سے 1983 تک خاصی پرلطف اور پُرسکون تھی۔ لیکن 85-1984ء میں اُنکی ازدوجی زندگی جھگڑوں کا شکار ہوگئی۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اُن کی بیوی افغان نژاد ریحانہ کے پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسیوں سے روابط تھے۔ اِس بات کا علم میر شاہنواز بھٹو کو ہوچکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کے درمیان تعلقات کی خلیج بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ نوبت طلاق تک جا پہنچی تھی مگر علیحدگی میں میر شاہنواز بھٹو کی تین سالہ بیٹی ”ستی“ حائل تھی۔ جنرل ضیاء الحق کے سازشی ذہن کا مقابلہ کرنے کیلئے میر شاہنواز ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ متعدد مرتبہ قتل کے منصوبوں کا سامنا کرچکے تھے جس میں قسمت نے اب تک یاوری کی تھی۔ چونکہ شاہنواز بھی ضیاء الحق اور اُسکی سفاک آمریت کے خاتمے کیلئے جارحانہ انداز اپنائے ہوئے تھے۔ اِس لیے وہ اپنے پاس ہمہ وقت تیز ترین زہر رکھتے تھے کہ جس کے کھانے کے چند سیکنڈز میں زندگی موت کی آغوش میں چلی جائے۔ 17 جولائی 1985ء کو کئی سالوں بعد بھٹو فیملی کے تمام افراد نے مل کر رات کا کھانا کھایا اور دیر گئے تک خوش کن ماحول میں باتیں کرتے رہے۔ اِسی رات (17 جولائی 1985ء) کو فرانس کے سفارت خانے میں تعینات ایک آفیسر نے ضیاء الحق کو بھٹو فیملی کے متعلق معلومات فراہم کیں اور بھٹو فیملی کی فرانس کے شہر کینز...... میں موجودگی کی اطلاع دی۔ اِس قدر خفیہ اور حساس معلومات کے بعد

نجانے ضیاء الحق نے شاہنواز بھٹو کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟

لیکن یہ...... حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگلے روز 18 جولائی 1985ء کو میر شاہنواز بھٹو اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے۔ پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت نے میر شاہنواز بھٹو کے قتل کا الزام ضیاء الحق پر عائد کیا لیکن اِس کا ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا۔ دوسری طرف میر شاہنواز بھٹو کی اہلیہ ریحانہ نے بیان دیا کہ میر شاہنواز بھٹو نے خودکشی کی ہے جبکہ ردعمل میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو اِس بیان کی نفی کرتے رہے۔ بعد میں میر کی اہلیہ ریحانہ نے تسلیم کیا کہ اُس نے میر شاہنواز کے کراہنے کی آواز سنی تھی۔ جس رات شاہنواز کی موت واقع ہوئی، اُس رات اُن کی اہلیہ ریحانہ اُن کے ساتھ تھی اور دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ جس وقت شاہنواز بھٹو کی جان نکل رہی تھی اور وہ کراہتے رہے، نجانے وہ کیا وجہ تھی کہ اُن کی اہلیہ نے توجہ تک دینا گوارہ نہ کی؟ اِسی بنیاد پر فرانس پولیس نے ریحانہ کو گرفتار بھی کیا۔ فرانس کی تمام انٹیلی جنس تمام تر وسائل کی موجودگی کے باوجود میر شاہنواز بھٹو کے قاتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔

البتہ میر مرتضیٰ بھٹو نے اپنا انٹیلی جنس ونگ قائم کیا ہوا تھا جس کی کئی سالوں کی کوششوں سے صرف اتنا ہی معلوم ہوچکا کہ جس رات ”میر شاہنواز بھٹو“ کی موت واقع ہوئی، اُس رات ایک مرسڈیز گاڑی اُنکے فلیٹ کے سامنے اُن کی موت سے چند گھنٹے پہلے رکی جس میں سے چند افراد برق رفتاری سے میر شاہنواز بھٹو کے کمرے میں گئے اور چند لمحوں بعد اِسی برق رفتاری سے واپس گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

19 جولائی 1985ء کو شاہنواز کی موت کی خبر پوری دنیا سمیت پاکستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ فرانسیسی حکومت نے 6 اگست 1985ء کو شاہنواز بھٹو کی نعش بھٹو فیملی کے حوالے کردی۔ اِس دوران یہ فیصلہ کیا گیا کہ میر شاہنواز کو اُن کے وطن پاکستان میں آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش میں دفن کیا جائے گا اور میر شاہنواز بھٹو کے جسد خاکی کو لے کر محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان جائیں گی۔

پاکستان واپسی کیلئے فرانس میں موجود پاکستانی سفارت خانے نے کاغذات کی تیاری کیلئے خاصا وقت ضائع کیا اور بالآخر 21 اگست 1985ء کو پاکستان جانے کی اجازت دی۔ یقیناً اِس دیر کی وجہ یہ تھی کہ ضیاء الحق نہیں چاہتا تھا کہ ”شاہنواز بھٹو“ پاکستان میں دفن ہوں“ فرانس سے روانگی سے قبل محترمہ بے نظیر بھٹو نے مخدوم خلیق الزمان کو شاہنواز بھٹو کی تجہیز و تکفین کیلئے کہا۔ مخدوم خلیق الزمان، شاہنواز بھٹو کے کزن مشتاق بھٹو کے ساتھ مل کر تجہیز و تکفین کا بندوبست کررہے تھے کہ اُنہیں گرفتار کرلیا گیا۔ یہ سفاکی کی معراج تھی...... دنیا بھر سے تعزیتی پیغام آرہے تھے اور بھٹو فیملی کے سربراہ میر نبی بخش آنکھوں میں آنسو لئے تعزیتی پیغامات وصول کررہے تھے۔ دوغلہ پن خود اِس وقت شرمندہ تھا کہ جب اُس وقت کے وزیراعظم (غیر جماعتی) محمد خان جونیجو کے ساتھ ضیاء الحق نے بھی شاہنواز بھٹو کی موت پر تعزیتی پیغام بھجوایا۔ ایک طرف تعزیت اور دوسری طرف تجہیز و تکفین میں رکاوٹیں۔ اِسے کیا کہیے سیاست، منافقت یا دوغلہ پن۔

21 اگست 1985ء کو محترمہ بینظیر بھٹو اپنے چہیتے اور سب سے چھوٹے پیارے بھائی کا تابوت

ے کر پاکستان پہنچیں۔ مولانا احترام الحق تھانوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور 23 اگست کو سوئم کہ جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی اور 27 اگست 1985ء کو ضیاء الحق کے حکم کے عین مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو کو 3 ماہ کیلئے 70 کلفٹن میں نظر بند کیا گیا۔ حالانکہ بین الاقوامی سطح پر یقین دلایا گیا تھا کہ بے نظیر بھٹو کو گرفتار نہیں کیا جائے گا لیکن ضیاء الحق...... وعدہ خلافی کی فطرت سے باز نہ آیا۔ یکم ستمبر 1985ء کو امریکی سفیر ڈین ہنٹن نے گورنر جنرل سندھ جہانداد (سندھ) سے ملاقات کی اور محترمہ کی گرفتاری پر تشویش ظاہر کی لیکن افغانستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر ضیاء الحق نے واشگاف الفاظ میں امریکی سفیر پر واضح کیا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی گرفتاری پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے لہٰذا امریکی حکم نامہ کے تحت کسی کو گرفتار یا رہا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بین الاقوامی دباؤ بڑھتا رہا اور ضیاء الحق کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ ایک ماہ 5 دن کے بعد نظر بندی ختم کردی گئی البتہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو 3 نومبر 1985ء کو سخت حفاظتی اقدامات کے ساتھ واپس فرانس بھیج دیا گیا۔ بھٹو فیملی کا سب سے کم عمر جوان شاہنواز بھٹو صرف 27 سال کی عمر میں سول سوسائٹی کی بالادستی کیلئے کوشاں خالق حقیقی سے جاملا اور شہید حریت کہلایا۔

بے نظیر بھٹو اپنے نظریات کے آئینے میں

☆ ہم نے اپنی زندگیاں، آزادی، اپنی جوانی، اپنا ذہنی سکون جمہوریت کیلئے قربان کردیئے۔

☆ ہر آغاز کا ایک انجام ہوتا ہے اور ہر انجام کا ایک آغاز ہوتا ہے اِس لئے ہم مسلمان کہتے ہیں کہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔

☆ ہم جانتے ہیں کہ اپنے عوام کیلئے، اپنے وفاق کیلئے اور اپنے صوبوں کیلئے کس طرح لڑنا، لڑنا اور لڑنا ہے۔

☆ ذات کا انقلاب دراصل معاشرے کی انقلاب ہوتا ہے۔ فرد ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا ہے، پیچھے نہیں۔

☆ اب ایک پُرامن انقلاب آنا چاہیے جو ناانصافی، غیر مساوی نظام کا خاتمہ، غربت اور جہالت کا خاتمہ کرے۔

☆ تاریخ شہیدوں سے عبارت ہے، تاریخ کا تانا بانا انقلاب کے دھاگوں سے بنا جاتا ہے۔

☆ ہماری پارٹی مظلوموں اور پستے ہوئے طبقات کی پارٹی ہے۔ یہ اُن لوگوں کی پارٹی ہے جو معاشرے کو بدلنا چاہتے ہیں۔

☆ ہم دلائل پر بات کرنے والے مرد اور عورتیں ہیں۔ ہمارے بھی نظریات اور جذبات ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ کیسے زندہ رہنا اور کیسے مرنا ہے۔

مرتضیٰ بھٹو بے نظیر کے دورِ حکومت میں پولیس کی فائرنگ سے قتل ہوئے

بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم ہاؤس میں مرتضیٰ بھٹو کے قتل کی اطلاع ملی

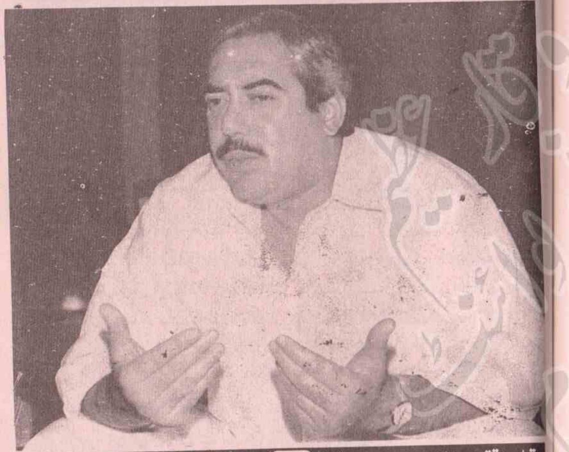

مرتضیٰ کے قتل پر بے نظیر نے کہا کہ ”میر مرتضیٰ کا قتل دراصل ایک بھٹو کے بعد دوسرے بھٹو کا قتل ہے“

مرتضیٰ بھٹو کی زندگی اور قتل سے متعلق ایک تحقیقی رپورٹ

5 جولائی 1977ء کا بدترین مارشل لا جب اسلامی مملکت خداداد پاکستان میں نافذ ہوا...... تو اُس وقت محترمہ بے نظیر بھٹو کی عمر 24 برس تھی جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو 23 برس کے تھے، اِسی طرح صنم بھٹو 21 سال اور میر شاہنواز 20 سال کے تھے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو۔ نے وقت وحالات کی نزاکت اور تقاضے کے عین مطابق اپنے صاحبزادوں میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو کو بیرون ملک بھجوا

فائرنگ سے شدید زخمی مرتضیٰ بھٹو کو ہسپتال لایا جارہا ہے

دیا۔ میر شاہنواز بھٹو تو اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کے صرف ایک مرتبہ کہنے پر چلے گئے جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو اِس کڑے وقت میں جبکہ فخرِ ایشیاء وقائدِ عوام مقید تھے، بیرون ملک جانے پر رضا مند نہ تھے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کے بار بار اصرار اور بالآخر سختی سے کہنے پر دیارِ غیر چلے گئے۔

لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو پاکستان میں ہی رہنے کیلئے کہا۔ نتیجتاً دونوں کو قید و بند کی صعوبتیں اُٹھانا پڑیں۔ اِس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس وقت تک محترمہ بے نظیر بھٹو سیاسی اسرار و رموز سے کافی حد تک واقف ہو چکی تھیں اور ذوالفقار علی بھٹو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں محترمہ کو آنے والے آمرانہ دور کیلئے تیار کرنا چاہتے تھے اور پھر ایسا ہی ہوا کہ جس کا نتیجہ آج تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جا چکا اور لکھا جاتا رہے گا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی حکمت عملی اِس حد تک کارگر رہی کہ وہ تا دمِ تحریر ملک کی پہلی خاتون وزیرِاعظم بنیں...... اور وزارت عظمیٰ کی مسند پر دو بار فائز ہوئیں۔ اِس سے قبل پاکستانی سیاست میں دو مرتبہ وزارت عظمیٰ کا اعزاز اُنکے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل تھا۔

علاوہ ازیں...... اپنے صاحبزادوں میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو کو بیرون ملک بھجوانے کا فیصلہ ذوالفقار علی بھٹو نے اِس لئے بھی کیا کہ وہ...... یہ نہیں چاہتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی طرح اُن کے خاندان کو کسی سازش کے تحت قتل کر دیا جائے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مارشل لاء کے نفاذ سے قبل میر مرتضیٰ بھٹو عملی طور پر سیاست میں آنے سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ وقت، حالات کی ستم ظریفی کہ میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد کی رہائی کیلئے کوشاں ہو گئے۔ بین الاقوامی سطح پر سربراہان مملکت بالخصوص اسلامی ممالک کے مختلف نمائندوں سے رابطے اور ملاقاتیں کیں جس

مرتضیٰ بھٹو کا آخری دیدار؛ ان سیٹ میں مرتضیٰ بھٹو ٹرین کے دروازہ میں کھڑے کارکنوں کے نعروں کا جواب دے رہے ہیں

کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضیاء الحق بین الاقوامی اور بالخصوص اسلامی ممالک سے ''وقتی طور پر'' یہ وعدہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اُس کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں اُٹھائے گی۔

4 اپریل 1979ء کو جب ضیاء الحق نے عہد شکنی کرتے ہوئے ''بھٹو'' کو تختہ دار پر چڑھا دیا تو میر مرتضیٰ بھٹو نے بھی ضیاء الحق کے خلاف سیاسی جدوجہد کی بجائے عملی کاروائی کی ٹھان لی۔ اِسی لئے میر مرتضیٰ بھٹو نے باقاعدہ فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ دریں اثناء ملک میں مظاہرے اور احتجاج ہوا جس کے نتیجے میں ضیاء الحق نے شاہی قلعہ جو بذاتِ خود ایک تاریخی ورثہ ہے، اُسے عقوبت خانے میں بدل کر نئی و منفی تاریخ رقم کی۔ اِس عقوبت خانے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو قید کیا گیا۔ مختلف قسم کی المناک اور خوفناک سزائیں دی گئیں۔ کوڑوں سے لے کر برف کے بلاکوں پر لٹانے تک اور بالوں سے لے کر ناخن تک کھنچوائے گئے۔

مختلف اذیتوں اور کربِ مسلسل سے گزرنے کے بعد بدلے کی آگ اپنے سینوں میں لئے جب بھی کارکن رہا ہوتے، مخفی طریقوں سے میر مرتضیٰ بھٹو سے جا ملتے۔ اِس طرح روز بروز میر مرتضیٰ بھٹو کی اندرون و بیرون ملک افرادی قوت بڑھتی چلی گئی۔ بلاشبہ میر مرتضیٰ بھٹو ضیاء الحق کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اِسی طرح بھٹو کے صاحبزادوں کو ضیاء الحق بھی پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن دونوں حملہ کرنے کے باوجود ناکام ہو جاتے، اِس میں کوئی کلام نہیں کہ ضیاء الحق کی انٹیلی جنس کمال

کی تھی جو بروقت اطلاع کردیتی اور دوسری طرف میر مرتضیٰ بھٹو بھی اپنی باصلاحیت انٹیلی جنس رکھتے تھے۔

ضیاء الحق نے مارشل لا کے دور میں قابل ذکر تین ممالک مصر، شام اور لیبیا میں موجود پاکستانی سفارت خانوں میں خصوصی طور پر حساس اداروں کے اہلکاروں کو تعینات کیا۔ یہ عہدیدار میر مرتضیٰ بھٹو کی تمام سرگرمیوں کا جائزہ لیتے۔ اِسی وجہ سے کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ ضیاء الحق کو میر مرتضیٰ بھٹو کی رپورٹ نہ ملتی۔ پاکستان پیپلز پارٹی سے کسی طرح بھی تعلق رکھنے والے لوگوں کو جب قید وبند، سزائیں، کوڑے اور جرمانوں کا سامنا کرنا پڑا، تو اِن کارکنوں کے پاس ملک چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہتا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے آمرانہ جال سے بچ جانے والے اِن کارکنوں کی افغانستان اور شام میں نظریاتی و عملی تربیت کی۔ ایک طرف میر مرتضیٰ بھٹو یہ عزم رکھتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کو کسی صورت معاف نہ کریں گے جبکہ دوسری طرف پاکستان میں سیاسی قائدین جو بھٹو حکومت کے خاتمہ میں پیش پیش رہے تھے، اب انتخابات کو یقینی بنانے کیلئے مارچ 1981ء میں احتجاجی تحریک شروع کرنا چاہتے تھے کہ اچانک 2 مارچ 1981ء کو سلام اللہ ٹیپو، عبدالناصر خاں اور اُنکے ساتھیوں نے پی آئی اے کا ایک طیارہ جس میں 148 مسافر سوار تھے، ہائی جیک کرلیا۔ 29 مسافر رہا کردیئے بقیہ 119 مسافر طیارے سمیت ہائی جیک رہے۔ ہائی جیکروں نے مطالبہ کیا کہ "92 سیاسی قیدی رہا کئے جائیں کہ جنہیں پولیس نے بے گناہ گرفتار کیا ہوا ہے"

بے نظیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا اور وہ جذبات غم سے نڈھال ہوگئی تھیں

"یہ بات قابل ذکر ہے کہ اِن مذکورہ 92 قیدیوں میں سے 15 ہائی جیکروں کے رشتے دار تھے" فوجی قیادت نے بیگم نصرت بھٹو سے درخواست کی جو اُن دنوں کراچی جیل میں قید تھیں کہ وہ اپنے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو سے کہیں کہ وہ...... ہائی جیک طیارہ ومسافروں کو رہا کروا دیں" 7 مارچ 1981ء کو بیگم نصرت بھٹو نے فوجی احکام پر واضح کردیا کہ "ہائی جیکنگ کا ڈرامہ ضیاء الحق کا اپنا رچایا ہوا ہے اور ضیاء الحق چاہتا ہے کہ وہ اپنے خلاف متوقع تحریک کو باآسانی کچل سکے اور اِس ہائی جیکنگ کا تعلق اُن کے بیٹوں میر مرتضیٰ بھٹو یا میر شاہنواز سے نہیں ہے"......

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آئی ایس آئی کی رپورٹ کے مطابق: "ہائی جیکروں نے یہ طیارہ اغوا کرنے کا کام ایک بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس کے تعاون سے انجام دیا تھا"......

8 مارچ 1981ء کو ہائی جیکر طیارہ لے کر شام کے دارالحکومت دمشق پہنچ گئے۔ شام کی حکومت سے ضیاء الحق مذاکرات کرتے رہے۔ لیکن یہ مذاکرات ناکام ہوئے۔ بالآخر ضیاء الحق کو ہائی جیکروں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور 54 قیدی رہا کرنا پڑے اور اُن کے رہائی کے عوض ہائی جیکروں نے یرغمال مسافر آزاد کردیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہائی جیکنگ کا منصوبہ میر مرتضیٰ بھٹو نے نہ بنایا ہو کیونکہ ضیاء حکومت میر مرتضیٰ بھٹو کی کابل میں موجودگی ثابت نہ کرسکی تھی۔ اِس تمام تر واقعہ کا ایک فائدہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ہوا اور ایک فائدہ ضیاء الحق کو ہوا۔ میر مرتضیٰ اِس واقعہ کے نتیجہ میں ایک مرتبہ پھر نئے انداز سے بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوگئے کہ پاکستان کے سابق وزیراعظم کے صاحبزادے نے ایک تنظیم قائم کرلی ہے جس کا مقصد پاکستان سے ضیاء الحق کی آمرت کے خاتمے کیلئے جدوجہد کرنا ہے۔

جنرل ضیاء ملک میں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہوگیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو و میر شاہنواز بھٹو تخریب کار ہیں اور اِسی آڑ میں ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کے خلاف اُٹھنے والی تحریک "ایم آر ڈی" کو غیر موثر کردیا۔ 1981ء سے 1984ء تک ایک دوسرے کے خلاف عملی محاذ آرائی اپنے عروج پر رہی۔ تنگ وعاجز آکر ضیاء الحق نے میر مرتضیٰ اور میر شاہنواز بھٹو کو پیغام بھیجا کہ "اگر یہ سلسلہ بند نہ ہوا تو اِس قسم کی کاروائیاں بھٹو خاندان کے خلاف بھی ہوسکتی ہیں" میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو نے خاصے غور وخوص اور بحث کے بعد جنوری 1985ء کو ضیاء الحق کو مطلع کیا کہ اب اُس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے گی۔

اِس معاملے کے طے ہوجانے کے بعد شواہد ثابت کرتے ہیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو اور میر شاہنواز بھٹو مذکورہ طے شدہ معاہدے کے پابند رہے۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی کہ اچانک 18 جولائی 1985ء کو میر شاہنواز بھٹو فرانس کے شہر کینز میں اپنے فلیٹ میں اِس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد تمام سیاسی قتلوں کی طرح آج تک یہ معمہ ہے کہ میر شاہنواز بھٹو کی موت...... کس طرح واقع ہوئی؟ لیکن پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت بالخصوص بیگم نصرت بھٹو نے شاہنواز بھٹو کی اِس بے وقت اور دل دوز موت کا ذمہ دار ضیاء الحق کو ٹھہرایا۔

جہاں شاہنواز بھٹو کی موت تمام خاندان کیلئے صدمہ تھی، وہاں میر مرتضیٰ بھٹو کیلئے دہرا صدمہ تھی کیونکہ میر مرتضیٰ بھٹو کی بے بسی کی معراج تھی کہ وہ...... اپنے شہید بھائی کا جسد خاکی لے کر فرانس سے پاکستان نہیں آسکتے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو اگرچہ مضبوط اعصاب کی مالک تھیں مگر نوجوان بیٹے کی لاش دیکھنے اور قبل ازیں اپنے شوہر کے عدالتی و آمرانہ قتل کے بعد اُن میں سکت نہ تھی کہ وہ اب میر مرتضیٰ بھٹو کی موت دیکھیں لہٰذا اُنہوں نے میر مرتضیٰ بھٹو کو پاکستان کے مخصوص حالات اور پیپلز پارٹی کے خلاف حکومتی "انتقامی کاروائیوں" کے پیش نظر پاکستان جانے سے منع کردیا۔ یقیناً بیگم صاحبہ اِس موقف میں حق بجانب تھیں مگر میر مرتضیٰ بھٹو اپنے بھائی اور ساتھی میر شاہنواز بھٹو کی آخری رسومات کندھا دینے سے تجہیز و تکفین تک میں شرکت نہ کرسکے۔

فرانس میں بیگم صاحبہ کو پاکستان کی مسندِ صدارت سے آمرانہ فرمان جاری ہوا کہ "اگر میر مرتضیٰ بھٹو نے اپنے بھائی میر شاہنواز بھٹو کی موت کے بعد کوئی انتقامی کاروائی کی تو اُسکے بعد کے تمام بھیانک نتائج کی ذمہ دار وہ خود ہوں گی" بعد کے شواہد کے مطابق 1986ء تا 1988ء تک میر مرتضیٰ بھٹو کی عملی جدوجہد اور تنظیم محض کاغذوں کی حد تک تھی۔ (1986ء تا 1988ء) میر مرتضیٰ بھٹو کی تمام تر توجہ کاروباری معاملات پر مرکوز رہی۔

ستم یہ ہوا کہ مرتضیٰ کے قتل کی ساری ذمہ داری بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری پر ڈال دی گئی

ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ طیارے کی تباہی معمولی حادثہ نہ تھا بلکہ ایک سازش تھی۔ اگرچہ پہلے پہل اِس حادثے کی ذمہ داری میر مرتضیٰ بھٹو کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی لیکن بعد کے تحقیقی قرآئن یہی ہیں کہ...... اتنے وسیع پیمانے کی سازش میر مرتضیٰ بھٹو اور اُس کی تنظیم جو اُس وقت محض کاغذوں کی حد تک رہ گئی تھی نہیں کرسکتی۔ یقیناً اتنی بڑی سازش کسی بڑے ملک کی انٹیلی جنس ہی کرسکتی ہے“......

ضیاء الحق کے گزر جانے کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو اپنی جلاوطنی ختم کر کے واپس پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اعلیٰ فوجی حکام اُن کیلئے کوئی اچھے جذبات نہ رکھتے تھے۔ نیز اُن کے خلاف اور بھٹو فیملی کے خلاف مقدمات درج تھے۔ اِس دوران محترمہ بے نظیر بھٹو 1988ء میں پاکستان کی وزیراعظم بن گئیں۔ افسوس کہ ابھی وہ بھٹو فیملی اور بالخصوص میر مرتضیٰ بھٹو کے خلاف عائد مقدمات کا جائزہ لے رہی تھیں کہ اُن کی حکومت کے خلاف ساز باز شروع ہوگئی۔ محترمہ قطعاً یہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ جلد بازی میں مقدمات ختم کروا کے سازشی عناصر کو مزید تقویت دیں۔ لہٰذا میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کا یہ مناسب وقت نہ تھا۔

اگر میر مرتضیٰ بھٹو وطن واپس آجاتے تو سازشی عناصر کے مقاصد جلد سے جلد پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے اور پھر آئین و قانون کی مصلحتیں بھی پیش نظر تھیں۔ وقت و حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میر مرتضیٰ بھٹو نے وطن واپس آنے کا ارادہ موخر کردیا۔ محترمہ کا پہلا دور حکومت انتہائی مختصر و قلیل ثابت ہوا۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے محترمہ کیلئے پہلے دورِ حکومت کے خاتمہ کے بعد فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں سے اپنی راہ و رسم بڑھائی اور یقین دہانی کروادی کہ ”اُن کی لڑائی ضیاء الحق سے تھی اور بحیثیت ادارہ وہ (میر مرتضیٰ بھٹو) فوج کی عزت کرتے ہیں نیز اُن کے دل میں فوج کیلئے کوئی عدوات نہیں ہے“......

”جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو اور فوج کے درمیان رابطوں سے محترمہ بے نظیر بھٹو قطعاً بے خبر تھیں۔ اِس یقین دہانی کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو کو فوج نے کئی طرح سے چیک کیا اور ثابت ہوگیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کسی منفی سرگرمی میں ملوث نہیں ہیں۔ اُن کی دی گئی یقین دہانی درست ہے۔ محترمہ کے بعد میاں نواز شریف کا دورِ حکومت آیا اور میاں نواز شریف بھی خاصے شریف واقع ہوئے اور سازشیوں نے اُن سے پے در پے سیاسی غلطیاں کروائیں۔ نتیجتاً وہ 1993ء میں اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اِس موقع پر میر مرتضیٰ بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ سیاست میں حصہ لیں گے۔ اکتوبر 1993ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو ایک مرتبہ پھر وزیراعظم نامزد ہوئیں۔ محترمہ نے اگرچہ جنرل عبدالوحید سے مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کیلئے بالواسطہ رابطہ کیا لیکن فوجی قیادت کی طرف سے یہ تاثر ملا کہ وہ مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی پر کوئی اعتراض نہیں رکھتی البتہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ قوانین کے مطابق سلوک کیا جائے گا“ 19 اکتوبر 1993ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم بنیں اور 4 نومبر 1993ء کو میر مرتضیٰ بھٹو نے عجلت کی اور پاکستان پہنچ گئے۔ اِس کے برعکس محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی سیاسی بصیرت اور صبر و تحمل سے کام لینے کی عادی رہیں ہیں۔ لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو مزید کم از کم 6 ماہ تک وطن واپس نہ آئے کیونکہ دوسری مرتبہ وزیراعظم بننے کے بعد وہ اِس قدر جلد کسی بھی ادارہ کی مرہونِ منت نہ ہونا چاہتی تھیں۔

قبل اِس کے کہ فوج کی طرف سے واضح عندیہ تھا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ ملکی قوانین کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ پھر وہی ہوا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو 4 نومبر 1993ء تا 1994ء یعنی تقریباً ساڑھے سات ماہ تک جیل میں رہنا پڑا۔ اگرچہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی پالیسیوں کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو مزید 6 ماہ وطن واپس آنے میں تاخیر کردیتے تو عین ممکن ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو 7 ماہ جیل میں نہ رہنا پڑتا۔ یہی وہ مقام تھا کہ جب...... محترمہ کے متعلق میر مرتضیٰ بھٹو غلط فہمی اور شکوک و شبہات کا شکار ہوگئے اور پھر لگائی بجھائی کرنے والوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور کہا جانے لگا کہ ”بہن وزیراعظم اور بھائی جیل میں ہو کس طرح ممکن ہے؟ تاہم وقت نے ثابت کیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی میں عجلت خطرناک ثابت ہوئی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو اور میر مرتضیٰ بھٹو کے درمیان مخالفت اور شکوک و شبہات پیدا کرنے والے جانتے تھے کہ کسی وقت بھی محترمہ و میر صاحب کے درمیان یہ وقتی رنجشیں ختم ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ مخالف سازشی ٹولہ اِس بات سے بخوبی واقف تھا کہ ”29 اکتوبر 1993ء میں دمشق سے میر مرتضیٰ بھٹو نے بذریعہ ٹیلی فون اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کو ایک ایسی سازش سے آگاہ کیا کہ جو ”میر مرتضیٰ بھٹو“ کے قتل کرنے کیلئے تیار کی گئی تھی۔ نیز میر مرتضیٰ بھٹو نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو بیگم نصرت بھٹو کی وساطت سے پیغام بھجوایا کہ ”بے نظیر میرے دشمن دراصل تمہارے دشمن ہیں اور میرے قتل کے بعد تمہارے لئے آسانیاں نہیں بلکہ مشکلات پیدا ہوں گی“

اِسی طرح 10 جون 1994ء کو بمقام لاڑکانہ جب میر مرتضیٰ بھٹو کی دستار بندی کی گئی تو اِس موقع پر میر مرتضیٰ بھٹو نے محترمہ کو پیغام بھجوایا کہ:

”بے نظیر! تمہارا ہر دکھ میرا دکھ ہے اور تمہارا ہر خواب میرا خواب ہے مگر یاد رکھنا کہ ہمارے خلاف سازشوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا“ اور پھر وقت نے ثابت کردیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے سچ کہا تھا۔ جن سازشوں کے سلسلے کی نشاندہی میر نے کی تھی، وہ تادمِ تحریر جاری رہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے مخصوص سیاسی طریق کار اور بدلتے ہوئے عالمی حالات کے پیش نظر ”امریکہ“ کے ساتھ تعلقات میں بہتری لا چکی تھیں جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو کو ابھی مخالفت کا سامنا تھا۔ ”شاید“ یہی وجہ تھی کہ میر مرتضیٰ بھٹو کے متعلق فوج، سول انٹیلی جنس اور پولیس ایڈمنسٹریشن نے مخصوص محتاط رویہ اپنائے رکھا اور پھر...... میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی طرح ایٹمی ٹیکنالوجی اور دفاعی اُمور میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرتضیٰ بھٹو نے سخت محنت اور جاں فشانی سے اُن بین الاقوامی اسمگلروں سے رابطے کئے اور کسی حد تک تعلقات بھی قائم کئے جو ایٹمی ٹیکنالوجی سے متعلقہ معلومات فراہم کرتے تھے۔ نیز وہ اسمگلر عملی طور پر ایٹمی ٹیکنالوجی کا سامان بھی مہیا کرسکتے تھے۔ اِسی بناء پر...... میر مرتضیٰ بھٹو ایک ایسا منصوبہ رکھتے تھے کہ جس پر عمل درآمد کرنے کے بعد ”سپر کمپیوٹر“ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اِس سے قبل ضیاء الحق کے دور میں سپر کمپیوٹر کے حصول میں مکمل ناکامی ہوچکی تھی۔ بعد ازاں پاکستان کے قابلِ فخر کمپیوٹر سائنس دانوں نے متبادل انتظامات کئے۔

وہ ممالک جو ایٹمی قوت بن چکے تھے، اُن کے متعلق انتہائی خفیہ معلومات میر مرتضیٰ بھٹو نے حاصل کررکھی تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے وطن واپسی کے کچھ

عرصہ بعد کوشش کی کہ کسی طرح اُنکی ملاقات پاکستان کے ایٹمی سائنس دانوں سے ہو جائے مگر بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو اپنے ملک کی ایٹمی ٹیکنالوجی کی تعمیر و ترقی میں جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ میر نے اپنے ملک کی ٹیکنالوجی کو مضبوط کرنے کیلئے "ایٹمی ٹیکنالوجی کے استعمال پر ایک مقالہ لکھا" میر مرتضیٰ بھٹو اِس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اِس مقالہ پر اُنہیں بوجوہ پی ایچ ڈی کی ڈگری نہ مل سکی۔ ڈگری نہ ملنا ایک الگ موضوع ہے البتہ اُن کا یہ مقالہ ایٹمی ٹیکنالوجی میں اُن کی دلچسپی اور رجحان کی مکمل و جامع عکاسی کرتا ہے۔

میر مرتضیٰ بھٹو نے اپنی سولہ سالہ جلاوطنی میں جہاں مختلف پریشانیوں اور مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا وہاں میر مرتضیٰ بھٹو نے بین الاقوامی سطح پر بالخصوص اسلامی ممالک سے بہت اچھے اور مضبوط تعلقات قائم کیے تھے۔ میر مرتضیٰ بھٹو نے اپنے وطن واپس آنے کے تقریباً چھ ماہ بعد اپنے شہید والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلامی ممالک کے سربراہوں سے رابطے کیے اور جنوبی ایشیاء میں نیا اسلامی بلاک بنانے کی نہ صرف تجویز دی بلکہ ایک مکمل منصوبہ بندی پیش کی۔ امریکی تاریخ سے ظاہر ہے کہ ایٹمی ٹیکنالوجی اور اسلامی بلاک کی بات کرنے والے کو وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے۔ اب تو خیر وہ ملک کے ملک پسند نہیں کرتے اور سفاک تاریخ رقم کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایسی صورتحال میں کیسے ممکن تھا کہ امریکہ میر مرتضیٰ بھٹو کیلئے اچھے جذبات رکھتا؟

محترمہ و میر مرتضیٰ بھٹو کے درمیان اگرچہ شکوک و شبہات پیدا کرنے والے عناصر کچھ عرصہ تک کامیاب رہے لیکن پھر نومبر 1995ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے میر مرتضیٰ بھٹو سے لے کر پارٹی کی تشکیل نو تک اور پھر سے بیگم نصرت بھٹو کو پارٹی کی چیئر پرسن بنانے تک کے معاملات طے کر دیئے۔ بس اِن کا اعلان ہونا باقی تھا کہ محترمہ کے دوسرے دورِ حکومت کو ختم کرنے کیلئے سازشی ٹولہ متحد و متحرک ہو گیا۔ دریں اثناء 18 ستمبر 1996ء کو کراچی میں کمشنر آفس و سول سیکرٹریٹ میں بم دھماکے ہوئے۔ اِسی شام کراچی پولیس اور انٹیلی جنس نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو رپورٹ ارسال کی جس میں شک ظاہر کیا گیا کہ "دہشت گردی کی اِس واردات میں بھارتی انٹیلی جنس را کے دہشت گرد ملوث ہو سکتے ہیں" جو میر مرتضیٰ بھٹو کے قریبی ساتھی علی سنارا کی رہائی کیلئے حکومت کو بلیک میل کر رہے ہیں"……

19 ستمبر 1996ء کو پولیس میر مرتضیٰ بھٹو کے باڈی گارڈز کو گرفتار کرنا چاہتی تھی مگر اِس دوران "محترمہ بے نظیر بھٹو نے بطور وزیر اعظم اُس وقت کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کو…… خاص ہدایت کی کہ "میر مرتضیٰ بھٹو سمیت کسی بھی رکن اسمبلی کو پولیس تشدد کا نشانہ نہیں بننا چاہیے" واقفانِ حال و تاریخ کے مطابق اُس وقت کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے وزیر اعظم کی ہدایت پر کس حد تک عمل کیا، آج تک سوالیہ نشان ہے؟ کیونکہ بعد کے حالات سے ظاہر ہے کہ کراچی پولیس نے اپنے متوقع منصوبے کو ترک نہ کیا تھا۔ کراچی پولیس نے میر مرتضیٰ بھٹو پر الزام عائد کیا کہ اُنہوں نے…… سی اے سنٹر پر حملہ کیا ہے جبکہ شواہد اِس الزام کے برعکس ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا۔ علاوہ یہ کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے 20 ستمبر 1996ء کو ایک پریس کانفرنس میں کراچی پولیس سے کہا تھا کہ "اگر وہ اُنہیں گرفتار کرنا چاہتی

ہے تو باقاعدہ وارنٹ حاصل کرے"……

20 ستمبر 1996ء کی رات بھٹو فیملی کیلئے بھیانک و بھاری گزری…… "میر مرتضیٰ بھٹو صدیق گوٹھ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہیں۔ جلسہ کے اختتام پر…… جلوس کی صورت واپس 70 کلفٹن روانہ ہوتے ہیں۔ وقت و حالات کے سفاک تیور بھٹو فیملی کا جوان میر مرتضیٰ بہت اچھے طریقے سے محسوس کر رہا تھا۔ میر مرتضیٰ کو اطلاع ملی تھی کہ کراچی پولیس اُن کے…… اور اُنکے ساتھیوں کے خلاف کوئی بڑا آپریشن کرنے کی تیاری رکھتی ہے۔ بمطابق اطلاع وقت معلوم نہ تھا ورنہ بھٹو فیملی اور بالخصوص میر مرتضیٰ بھٹو سے توقع تھی کہ وہ اپنا دفاعی انتظام یا متبادل راستہ بنا لیتے مگر ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ رات 8 بج کر 40 منٹ کا وقت تھا۔ میر مرتضیٰ بھٹو، اپنے قافلے سمیت جس میں اُن کے چند ساتھی تھے، 70 کلفٹن پہنچے کہ اچانک اُن کی نظر پولیس گاڑیوں پر پڑی جو بے ترتیب حالت میں کھڑی تھیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو مضبوط اعصاب کے مالک تھے اور پھر ایسی صورتحال کا سامنا کرنا تو اُن کی مشقِ مسلسل رہی تھی۔ وہ خوفزدہ نہیں ہوئے۔ بڑے پُرسکون انداز سے اپنی نشست پر براجمان رہے اور پولیس کے اشارہ پر گاڑی روک دی۔ اُن کے باڈی گارڈز نے پوزیشن سنبھال لی مگر میر مرتضیٰ بھٹو نے بلا تاخیر بااعتماد لہجے میں اپنے باڈی گارڈز کو ہدایت کی کہ "کوئی گولی نہیں چلائے گا"

مرتضیٰ بھٹو نے پولیس آفیسر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُنہوں نے پولیس آفیسر کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ دیکھ کر اے ایس پی شاہد حیات آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے اور گاڑی کے قریب پہنچ کر میر مرتضیٰ سے کہتا ہے کہ "سر ہم آپ کے باڈی گارڈز کی تلاشی لینا چاہتے ہیں"

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اِنکے پاس غیر قانونی اسلحہ ہے۔ اِس پر میر مرتضیٰ بھٹو اے ایس پی شاہد حیات کو کہتے ہیں کہ "وہ چند پولیس آفیسران اور ملازمین کے ساتھ اُن کے پیچھے 70 کلفٹن آ جائیں اور تلاشی لے لیں۔ اِس طرح سڑک کے کنارے تلاشی دینا اور لینا نا مناسب ہے" ابھی بات چیت جاری تھی کہ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور اُنکے ساتھی زخمی ہو گئے۔ بعد ازاں دو موقف سامنے آئے۔ پولیس کے مطابق میر مرتضیٰ بھٹو کے گارڈز نے اے ایس پی شاہد حیات کو اغوا کرنے کی کوشش کی جسکی بناء پر پولیس کو فائرنگ کرنا پڑی جبکہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھیوں کا موقف ہے کہ اُس وقت جب میر صاحب اور اے ایس پی کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے کہ پولیس کی طرف سے فائرنگ ہوئی اور نتیجتاً مرتضیٰ بھٹو اور اُن کے ساتھی زخمی ہو گئے۔ اِس حادثے میں 8 افراد قتل ہوئے۔

(1) میر مرتضیٰ بھٹو (2) عاشق حسین جتوئی (3) سجاد حیدر (4) یار محمد بلوچ (5) وجاہت حسین کھوکھر (6) محمد رحیم (7) عبدالستار (8) محمد بچل جبکہ چار زخمی ہوئے (1) ڈاکٹر مظہر حسین (2) اسماعیل (3) ایاز (4) اصغر۔

جبکہ پولیس انتظامیہ کے دو افراد زخمی ہوئے۔ اے ایس پی شاہد حیات، اور انسپکٹر حق نواز سیال، دونوں معمولی زخمی ہوئے اور پھر انسپکٹر حق نواز سیال 29 ستمبر 1996ء کو قتل ہو گئے۔ صرف 9 دنوں کے مختصر عرصہ میں انسپکٹر حق نواز کے قتل میں بہت سے سوالات اور جوابات پنہاں ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیر اعظم ہاؤس میں میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے متعلق

اطلاع بذریعہ فون اُن کی بھتیجی "فاطمہ بھٹو نے دی جبکہ محترمہ کو اطلاع ملنے سے پہلے یہ خبر بین الاقوامی سطح پر نشر کی جا چکی تھی۔ محترمہ کالے لباس میں ملبوس کراچی کے میڈ ایسٹ ہسپتال اپنے بھائی کی لاش پر نوحہ کناں و ماتم کناں تھیں۔ میر مرتضٰی بھٹو ابدی نیند سو رہے تھے۔ اُن کی بہن محترمہ بے نظیر بھٹو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب رواں تھا۔ رونے کی وجہ سے اُنکی آنکھیں لہو کی مانند سرخ تھیں۔ جذبات غم سے وجود نڈھال اور کپکپی طاری تھی۔ ابھی تو اُن کے بھائی "شہید حریت" شاہنواز بھٹو کے قتل کا نہ بھولنے والا منظر محترمہ کی آنکھوں میں تھا کہ وہ ایک اور ناگہانی منظر دیکھ رہی تھیں۔

وقت و حالات کی بے رحمی کے ایک عرصہ بعد وہ اپنے بھائی میر مرتضٰی بھٹو سے کس طرح اور کس حال میں مل رہی تھیں۔ میر مرتضٰی بھٹو کو میر شاہنواز بھٹو کی طرح شہید ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

اِس کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ "میر مرتضٰی بھٹو کا قتل دراصل ایک بھٹو کے بعد دوسرے بھٹو کا قتل ہے۔ یہ ایک سازش ہے کہ جس کا مقصد حکومت ختم کرنا اور قتل کے الزام میں اُن کے شوہر آصف علی زرداری سمیت اُن کو ملوث کرنا ہے۔ یہ سازش وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف بھٹو خاندان کا خاتمہ ہے"......

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آنے والے چند ہفتوں میں ایسا ہی ہوا۔ 20 ستمبر 1996ء کو مرتضٰی بھٹو کا قتل ہوا اور 5 نومبر 1996ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کر دی گئی اور قتل کا الزام محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری پر عائد کر دیا گیا۔

آج بھی ہماری سیاسی تاریخ میں یہ سوال اپنی تمام تر خوفناکی کے ساتھ جواب طلب ہے کہ پاکستان کی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے احکامات کو نظر انداز کرنے والے وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے میر مرتضٰی بھٹو کا قتل کر دیا؟

بقیہ : عارفہ صبح خان

ٹکٹ ضائع کیے ہیں اور تین نشستیں ہاری ہیں بلکہ پیپلز خود منہ سے بولتا ہے۔ عابدہ حسین نے تو پیپلز پارٹی کے پارٹی کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ یہ خاتون پہلے میاں نواز شریف کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی تھیں اور بے نظیر بھٹو میں کیڑے نکالتی تھیں جب میاں نواز شریف نے وزارت لے لی تو پیپلز پارٹی سے مل گئیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

حکمت کی باتیں

☆ علم حاصل کرو ماں کی گود سے لے کر قبر تک۔

☆ خدا کا بہترین اور آخری تحفہ ماں ہے۔

☆ انسان شکل سے نہیں عقل سے پہچانا جاتا ہے۔

☆ خدا کی نظر میں عظیم وہ ہے جس کا اخلاق سب سے بلند ہے۔

☆ بہترین شخص وہ ہے جو خدا سے ڈرتا ہے۔

☆ اچھی کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔

☆ علم ایک لازوال دولت ہے۔

مراسلہ: حسنین عادل ملتان

ق لیگ کی شکست کی بڑی وجہ الیکشن میں منفی ہتھکنڈے استعمال کرنا ہے

نواز شریف اور بے نظیر کی کردار کشی کیلئے ق لیگ نے بڑے پیمانے پر اشتہار بازی کی

ملک میں تبدیلی کا جھونکا سابق وزیراعظم میاں نواز شریف کے صبر کا پھل ہے

میاں نواز شریف بہت جلد صدر پاکستان کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں گے

پاکستان کی ممتاز صحافی، ادیبہ، شاعرہ اور ڈرامہ نگار عارفہ صبح خان سے انٹرویو

عارفہ صبح خان پاکستان کے ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنہیں اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی بنا پر شہرت اور مقبولیت ملی۔ انہوں نے انتہائی مختصر وقت میں زیادہ کام کر کے دکھایا اور تمام تر رکاوٹوں، بندشوں کے باوجود اپنی ذہانت اور شخصیت کو منوایا۔ وہ اپنی انفرادیت کی وجہ سے چھا گئیں کیونکہ بہت کم لوگوں میں بیک وقت اتنی صلاحیتیں اور خوبیاں اکٹھی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنی ذہانت، برجستگی، حاضر جوابی، شوخی، غصے، علم اور رعب کی وجہ سے پرکشش شخصیت رکھتی ہیں۔

عارفہ صبح خان بلاشبہ پاکستان کی واحد صحافی خاتون ہیں جنہیں ان کی مختلف کارکردگی اور خدمات پر پندرہ ایوارڈز دیئے گئے ہیں۔ وہ پاکستان کی پہلی مزاح نگار خاتون، پہلی کرائم لیڈی رپورٹر اور پہلی پولیٹیکل لیڈی رپورٹر کا اعزاز بھی رکھتی ہیں۔ عارفہ صبح خان اس وقت تک چھ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ان میں عکس زن، اماں حوا سے اماں کونسلر تک، شٹ اپ، مابدولت، تجاہل عارفانہ اور کرکرے کردار شامل ہیں۔ چار ڈرامہ سیریلز آئینہ، نئے راستے، کیوں، لیڈی رپورٹر لکھے ہیں جبکہ ہاٹ ایشوز، پولیٹیکل ٹائم، پولیٹیکل ٹمپریچر جیسے مقبول سیاسی پروگرامز کی میزبانی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ عارفہ صبح خان کا

سابقہ حکمرانوں نے وزارتیں ریوڑیوں کی طرح بانٹیں اور ثقافت کے نام پر کروڑوں روپے ہضم کیے

تعلق مسلم لیگ سے ہے۔ یہ تعلق ان کے بزرگوں سے چلا آ رہا ہے۔ عارفہ صبح خان کے دادا مسلم لیگ کے صدر اور والد ادریس محمد خان (گولڈ میڈلسٹ) مسلم لیگ (بھارت) کے جنرل سیکرٹری رہے عارفہ صبح خان کے دادا اور والد نے قائداعظم کو غازی آباد بھارت میں ایک عظیم الشان جلسے میں صدارت کرائی۔ ان کے خاندان نے تحریک پاکستان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

عارفہ صبح خان کو ادب سیاست اور کرنٹ افیئرز پر زبردست عبور ہے۔ وہ زندگی کے ہر موضوع پر گہری نظر رکھتی ہیں اور بے ساختہ بولتی ہیں۔ عارفہ صبح خان کچھ عرصے سے اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ انہوں نے شاندار پوزیشن کے ساتھ ایم فل کیا ہے اور آج کل پی ایچ ڈی میں مصروف ہیں۔

سوال: آج کل آپ پی ایچ ڈی کر رہی ہیں لیکن اتنی مصروفیات کے باوجود آپ کی ایک نئی کتاب ”کرکرے کردار“ بھی مارکیٹ میں آ گئی؟

جواب: ”کرکرے کردار“ کی ڈیمانڈ ہی اس قدر زیادہ تھی کہ اسے ہر صورت آنا ہی تھا بلکہ یہ کتاب 2007ء کی ابتداء میں آ جاتی لیکن میرے ایم فل کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوگئی۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ”مصروفیت“ کا شور بہت مچاتے ہیں مگر کارکردگی صرف زیرو رہتی ہے۔ میں اپنا ہر کام خلوص، محنت، توجہ اور انہماک سے کرتی ہوں اور کبھی یہ نہیں سوچتی کہ مجھے اس دن رات کی محنت کے عوض عزت، دولت، شہرت ملے گی۔

کیونکہ عزت، دولت، شہرت صرف اور صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے کئی لوگوں کو دیکھا ہے کہ عزت، دولت، شہرت کے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگتے ہیں اور دوسروں کے راستے میں رکاوٹیں بھی ڈالتے ہیں لیکن پھر بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا اس لئے جس طرح خدا زندگی اور موت دینے اور لینے پر قادر ہے۔ اسی طرح عزت دولت شہرت بھی اسی کی طرف سے ملتی ہے فضول میں بھاگنے یا دوسروں سے حسد کرنے کا کیا فائدہ۔

سوال: تو کیا آپ پر خدا مہربان ہے؟

جواب: شکر ہے خدا کا...... مگر میں سمجھتی ہوں کہ انسان کو اس کی نیت کے مطابق ملتا ہے۔ انسان کی نیت جیسی ہوتی ہے وہی اسے ملتا ہے۔ انسان دوسروں کو بیوقوف بنا سکتا ہے۔ باس سے چرب زبانی اور منافقت کر سکتا ہے، ماتحتوں کو الو بنا سکتا ہے لیکن خدا کے آگے نہ چاپلوسی کام آتی نہ منافقت سے کام چلتا اور نہ رشوت سفارش چلتی...... خدا ہر شخص کو نیت کے مطابق نوازتا ہے۔ اب میاں نواز شریف کو دیکھ لیں۔ خدا نے میاں نواز شریف کو صبر تحمل اور برداشت پر کیسے نوازا ہے۔ یہ ہوتا ہے نیت کا پھل۔

اگر نواز شریف صدر اور مخدوم امین فہیم وزیر اعظم ہوں تو یہ پاکستان کی آئیڈیل ترین جوڑی ہوگی

سوال: لیکن ابھی تک خود میاں نواز شریف کے حصے میں کیا آیا ہے۔ انہیں تو الیکشن بھی لڑنے نہیں دیا گیا اور تیسری بار وزیر اعظم بننے کی بھی پابندی ہے؟

جواب: اس سے کیا فرق پڑتا ہے میاں نواز شریف وزیر اعظم سے بھی بڑے عہدے کیلئے منتخب ہو چکے ہیں اور بہت جلد آپ ان کا انٹرویو بطور صدر لیں گے۔ میاں نواز شریف۔ بہت جلد صدر پاکستان کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں گے کیونکہ اب ان کیلئے یہی عہدہ سب سے موزوں ترین ہے اور وہی اس عہدے کیلئے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ آج کل صدر مشرف کے خلاف ہوائیں چل رہی ہیں اور امریکہ بھی تبدیلی کا خواہاں ہے اس سے زیادہ پاکستان میں لوگ اب صدر مشرف کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں لیکن ان سب چیزوں سے زیادہ تبدیلی کا یہ جھونکا میاں نواز شریف کے صبر کا پھل ہے۔ انہوں نے جو مصیبتیں تکلیفیں اور ایذائیں برداشت کیں یہ انہی کا انعام ہے۔

سوال: ق لیگ کا گراف گرنے کی کیا وجہ ہے۔ ان کی شکست کیوں ہوئی؟

جواب: غرور اور طاقت کا گھمنڈ، احسان فراموش، میڈیا پروجیکشن، میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو مرحومہ پر الزامات اور ان کا کردار دبانے کیلئے جو غلط قسم کے اشتہارات دن رات دیئے گئے۔ وہی ق لیگ کو لے بیٹھے۔ جب انسان دولت طاقت اور اقتدار کی وجہ سے اندھا ہو جائے اور مخالف کو دبانے کیلئے منفی ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے تو کیا مطلب ہے کہ وہی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ انسان پتہ نہیں یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ اس کا احتساب کرنے والا سر نیچا کرنے والا بھی اوپر بیٹھا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ

انسان خدا بننے کی کوشش میں ہے مصروف
لیکن یہ تماشا بھی خدا دیکھ رہا ہے

ق لیگ کا تو یہ حال تھا کہ انہیں جب سیاسی پروگراموں میں بلایا جاتا تھا تو یہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ جاتا تھے۔ اپوزیشن کے سارے لوگ بھاگ کر آتے تھے۔ مگر یہ منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ ق لیگ نے جس طرح اقربا پروری، برداری ازم، فرقہ واریت اور لوٹ کھسوٹ کو فروغ دیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے جو للو پنجو دیکھو تو اٹھارہویں، انیسویں گریڈ میں بیٹھا ہوا تھا اور ڈائریکٹروں کا عہدہ تو ایسے بانٹا گیا جیسے کسانوں میں ٹریکٹروں کو بانٹا جاتا ہے بلکہ دو تین لوگوں نے تو ق لیگ کے سر پر پی ایچ ڈی بھی کر ڈالی۔ یہ تو اب میاں شہباز شریف کو چاہیئے کہ اس طرح کے پی ایچ ڈی ہولڈروں کا راز فاش کریں جنہوں نے بیٹھے بٹھائے پی ایچ ڈی کر ڈالی ذرا ان کے تھیسز تو کھلوائیں اور حقیقی عالموں، دانشوروں، استادوں سے چیک کروائیں کہ ایم اے نما

ہوا کا رخ بدلتے ہی نام نہاد صحافی، کالم نویس، مشیر شہباز شریف کے گرد گھیرے ڈالنے لگے

ق لیگ والوں کو سیاسی پروگراموں میں بلایا جاتا تو یہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ جاتے تھے

تھیسز پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کیسے جاری ہوگئی۔ اب یہ تو میاں نواز شریف اور شہباز شریف کو چاہیئے کہ جو جو ناانصافیاں ہوئی ہیں ان کا ازالہ کریں اور جو لوگ غلط عہدوں پر قبضہ جما کر بیٹھے ہوئے ہیں انہیں وہاں سے نکالیں اور صحیح لوگوں کو ان کا حق دیں۔ بہر حال ق لیگ کے وفاقی اور صوبائی وزیروں نے عوام کے کام کے نام پر صرف اور صرف اپنے کام کئے ہیں۔ ق لیگ والوں نے کبھی کسی کا کام نہیں کیا صرف کام کا واویلا مچایا ہے اور جتنی بے وقعتی اور بے توقیری پچھلے پانچ سالوں میں وزارتوں کی ہوئی ہے اتنی کبھی پاکستان کی تاریخ میں نہیں ہوئی تھی۔ معمولی لوگ بھی وزیروں کا مذاق اڑاتے اور پھبتیاں کستے تھے۔ وزارتیں ریوڑیوں کی طرح بانٹی گئیں اور تہذیب و ثقافت کے نام پر کروڑوں روپیہ نام نہاد لوگوں کے پیٹوں میں اترا۔ ق لیگ کے وزراء کی وجہ سے سیاست کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔ میاں شہباز شریف کو اب پھر ڈبل شفٹ لگانی پڑے گی۔ ایک تو سارے محکموں میں سفارشی اور اقربا پروری، برادری ازم کے نام پر جو نالائق نکمے لوگ بیٹھے ہیں ان کی صفائی کرنی پڑے گی۔ لاہور سے اسلام آباد تک تقریباً سارے محکموں میں ''بھل صفائی'' کرنی ہوگی۔ دوسرے میاں شہباز شریف کو ایسے لوگوں سے بچ کر رہنا ہوگا جنہوں نے جھوٹی تعریفوں، خوشامدوں، چاپلوسوں سے چوہدری پرویز الٰہی سے دن رات فائدے اٹھائے ہیں اور اب یہی نام نہاد صحافی، کالم نویس، مشیر، سیاستدان میاں شہباز شریف کے گرد گھیرا ڈالنے کے چکر میں ہیں تا کہ اب نئی حکومت کو کیش کر سکیں۔ ویسے بھی اب مسلم لیگ ن کے پاس غلطی کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ق لیگ کے بدترین انجام سے سبق سیکھنا چاہیئے۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں شہباز شریف خوشامدیوں کے ٹولے سے بچ جائیں گے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ شہباز شریف کی نظر عقابی ہے اس کے علاوہ ان کے پاس ایسے صحافیوں، مشیروں اور ابن الوقتوں کی ایک لسٹ اس وقت سے ہے جب وہ ابھی جدہ میں تھے۔ وہ اب ایسے چہروں اور ذہنوں کو خوب پہچانتے ہیں لیکن میاں شہباز شریف کو ایسے شاطر، مکار، منافق اور ابن الوقتوں سے دور رہنے کی سخت ضرورت ہے اور اس سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو بھی ایسے لوگوں کے نرغے سے دور رکھیں۔

سوال: کیا نئی حکومت چلے گی؟

جواب: ویسے اس کا زیادہ انحصار میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری پر ہے۔ میاں نواز شریف تو خیر مدبر اور دور اندیش سیاستدان ہیں لیکن تھوڑا سا کھٹکا آصف زرداری سے ہے وہ بیچ میں گڑ بڑ نہ کر جائیں یا ق لیگ والے مسلم لیگ ن میں گھس کر دراڑیں نہ ڈالیں اگر نواز شریف صدر اور امین فہیم وزیر اعظم کے طور پر چلتے ہیں تو آپ یقین جانیے ...... یہ پاکستان کی تاریخ کی آئیڈیل ترین جوڑی ہوگی کیونکہ دونوں معتدل مزاج ہیں اور باہمی احترام کے قائل ہیں اس لئے نئی حکومت احسن طریقے سے چلے گی۔

میاں شہباز شریف کو شاطر، مکار، منافق اور ابن الوقتوں سے دور رہنے کی سخت ضرورت ہے

سوال: خواتین کی شمولیت سے سیاست میں بہتری آئی ہے یا بدتری؟

جواب: سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کس طرح کی خواتین سیاست میں آئیں ہیں بدقسمتی سے سیاست میں وہ خواتین زیادہ آئی ہیں جن کے باپ، بھائی، شوہر، بیٹے گریجوائٹ نہ ہونے کی وجہ سے الیکشن میں حصہ لینے سے قاصر تھے لہٰذا انہوں نے سیٹ ہاتھ سے جاتے دیکھ کر اپنی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کو اپنی نشست دلا دی۔ اس سے قومی و صوبائی اسمبلیوں کی کم از کم سو نشستوں پر ایسی عورتیں آ گئیں جنہیں نہیں آنا چاہیئے تھا کیونکہ ان کا کوئی سیاسی مشن یا خدمت خلق کا جذبہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ سفارش اور اقربا پروری کی وجہ سے اتنی ہی خواتین مزید آئیں۔ اب بھی اکثریت کے پاس اصلی بی اے کی ڈگری نہیں ہے۔ ان خواتین کے پاس نہ وژن ہے نہ مشن!! بس اسمبلیوں میں آ کر بیٹھ جاتی ہیں اور میرے حساب سے ایسی خواتین ضرف خزانے پر ناقابل برداشت بوجھ ہیں۔ اس وقت صرف پیپلز پارٹی میں تعلیم یافتہ، سلجھی ہوئی ذہین اور سیاسی ذہن رکھنے والی خواتین موجود ہیں۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ ن میں چند ایک سوا باقی بھرتی کی ہیں جبکہ ق لیگ میں چار پانچ خواتین کے سوا زیادہ تر چغلخور خواتین کی کھیپ زیادہ رہی ہے جو ہر وقت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتی اور ایک دوسرے کے خلاف سیاست کرتی رہتی تھیں۔ ان سے سیاست پر بات کرو تو ان کے پاس جواب نہیں ہوتا تھا۔ اب وہی پارٹی سب سے زیادہ نقصان اٹھائے گی جس کے پاس اچھی تعلیم یافتہ ذہین اور سلجھی ہوئی سیاسی سوچ رکھنے والی خواتین نہیں ہوں گی۔ کیونکہ اب ہر بڑی پارٹی میں کم و بیش سو عورتیں اسمبلیوں میں جائیں گی اور اگر یہ سو عورتیں اپنی پارٹی اور منشور کی صحیح نمائندگی نہ کر سکیں۔ اپنی پارٹی کا موثر دفاع نہ کر سکیں تو گویا پارٹی خود بخود ڈوب جائے گی جیسا کہ ق لیگ کے ساتھ ہوا ہے۔

ایسی عورتوں کو شکست ہی ہونی چاہیئے جنہوں نے میڈیا پروجیکشن کے سوا کوئی کام نہیں کیا

سوال: عابدہ حسین بھی پورے خاندان سمیت ہار گئیں کیوں؟

جواب: ایسی عورتوں کو شکست ہی ہونی چاہیئے جنہوں نے سوائے میڈیا پروجیکشن کے کوئی کام نہیں کیا۔ کام کیا ہوتا تو میاں بیوی اور بیٹی کو ایسی شکست نہ ہوتی عابدہ حسین جیسی جہاندیدہ اور تیز عورت کے سامنے ڈاک فردوس عاشق اعوان جیسی نو آموز سیاسی عورت ـ ناقابل یقین کامیابی حاصل کر کے ثابت کیا ہے کہ کا

باقی صفحہ نمبر 198 پر

اسرائیل سے مراسم

پریس ریویو.........اشرف رفیقی

صدر مملکت کا حالیہ دورہ یورپ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آج کل اخبارات کی زینت بنا ہوا ہے۔ اپنے ہفتے بھر کے دورے میں صدر مملکت نے پاکستانی منفی امیج کو یورپی یونین اور ان کے ایوانوں تک صحیح سمت اور حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کیا جس کو مغربی دنیا میں کہیں کہیں بے حد سراہا گیا اور کئی موقعوں پر اپنی صفائی اور حقائق نامہ کی تائید کرنے میں دشواری کا مسئلہ بھی درپیش رہا۔ مغربی قومیں پاکستان اور پاکستان میں بسنے والوں کیلئے کیا رویہ رکھتی ہیں اور یہاں کے بسنے والے ان کی نگاہ میں کونسی دنیا کی مخلوق ہیں اس پر بھی صدر صاحب نے تفصیلی آگاہی دی۔

درحقیقت 9/11 کے بعد دنیا کا نقشہ راتوں رات تبدیل ہوا اور اس واقعہ کے بعد یکسر تبدیلی جو پاکستان میں رونما ہوئی اور اب تک ہمیں بحیثیت قوم کتنی قربانی دینی پڑ رہی ہے اس سے یہاں بسنے والا ہر شہری واقف ہے۔ میری طرح آپ جیسے کتنے ہی پاکستانی ہیں جنہوں نے 9/11 کے بعد پاکستان سے باہر کا سفر کر کے مشاہدہ کیا ہوگا کہ ہمیں پاکستان کی حدود سے نکلتے ہی کیسی پذیرائی ملتی ہے۔ یہ پذیرائی کئی موقعوں پر ناقابل تحریر اور شرمناک ہے۔ مغرب نے اپنے گلے کا طوق ہر پاکستانی کے گلے میں جس طرح ڈالا ہے وہ انتہائی قابل نفرت ہے۔ ہمیں اپنی قربانیوں کا صلہ جواب تک ملا ہے وہ کسی طور پر قابل تحسین نہیں۔

روس کی تباہی میں مغرب اور امریکہ کا ساتھ دینے کی پاداش میں ہماری اور کتنی نسلیں تباہ ہوں گی۔ یہ کوئی نہیں جانتا لیکن اس بات پر سب مغربی ممالک بشمول امریکہ متفق ہیں کہ آج پوری دنیا میں ارتعاش آیا ہے تو اس کا سبب کسی نہ کسی طور پاکستان ہے جو قطعی ناقابل فہم اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ ہم اپنی ہمدردی اور خلوص کا جو عملی مظاہرہ کرتے ہیں وہی مغرب کیلئے بسا اوقات شک و شبہات کا باعث بنتا ہے' باالفاظ دیگر یوں کہیئے کہ ہمارے علاوہ جن ممالک نے ان کی بات کی تائید کی ان ممالک نے کثیر تعداد میں خوشحالی کے مواقع بھی حاصل کئے۔ مصر کو ہی دیکھئے اسلامی ممالک میں سب سے پہلے متازعہ اسرائیل کو تسلیم کر کے کتنے فائدے حاصل کئے' پانچ ارب ڈالر سے زائد امریکی قرضے معاف کروائے اور کئی نئے دفاعی معاہدے کر کے اپنے ملک کا استحکام اور معاشی ترقی بھی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ سے دوستی کی جو گرہ لگائی وہ آج تک قائم ہے' حالانکہ ان ممالک میں ڈکیٹیٹر بھی برسر اقتدار رہے اور ہیومن رائٹس کا مسئلہ بھی بین بین چلتا رہا۔ ترکی مغرب اور امریکہ سے دوستی گانٹھ کر اب تک آنکھ کا تارا بنا رہا ہے حالانکہ تانسو چلر کے دور میں کرپشن کی بے مثال تاریخ وہاں بھی رقم ہو چکی ہے۔ لیکن ترکی کیلئے مغرب اور امریکہ کا رویہ پاکستان سے یکسر مختلف ہے۔ صدر پرویز مشرف اور اسرائیلی وزیر دفاع یہود بارک کی حالیہ ملاقات جو پیرس کے اس ہوٹل کی لابی میں ہوئی جہاں یہ دونوں اصحاب قیام پذیر تھے اس اتفاقیہ ملاقات کے بعد گھنٹہ بھر کی تفصیلی ملاقات خوش آئند اور اچھی بات ہے۔ ہم نے اسرائیل سے طویل نفرت اور دشمنی پالی ہے' حالانکہ آج کل فلسطین اور اسرائیلی رہنماؤں کی سرکاری سطح پر ملاقاتیں ہو رہی ہیں جو خوش آئند بھی ہیں اور علاقے میں امن و استحکام کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔ بہرحال ہنود و یہود سے دوستی کر کے خیر کی توقع ہرگز نہیں کرنی چاہیئے لیکن تعلقات بحیثیت قوم و ملک ایسے ضرور ہونے چاہئیں کہ جن میں سلام دعا کی نوبت قائم رہے۔ آگرے کے شیر نے پیرس میں ازلی حریف کو کس طرح پچھاڑا ہوگا اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے' لیکن ایک بات پکی ہے کہ صدر مشرف ایسی خطرناک وکٹوں پر جم کر کھیلنے کے ماہر ہیں۔ ایسے واقعات آگرہ میں ہوں یا پیرس میں قوم کو ان سے سچے پاکستانی ہونے کی ہی امید ہے۔ بہرحال اس ملاقات کی ایک خبر یہ بھی ہے کہ ہم نے اسرائیلی وزیر دفاع یہود بارک کو اس مسئلہ پر یقین دہانی کروادی ہے کہ ہمارا ایٹمی پروگرام اور اس کی باگ ڈور محفوظ ہاتھوں میں ہے' یہ پاکستانی عوام کیلئے قابل اعتراض بات ہے کہ اسرائیل کون ہوتا ہے ہماری ایٹمی صلاحیتوں کو جانچنے والا !! اور ہمیں اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ ہم اسے یہ صفائیاں پیش کریں۔ ہم بحیثیت قوم اس بات سے زیادہ خوش ہوتے اگر صدر مملکت اسرائیلی وزیر دفاع سے یہ بازپرس کرتے کہ وہ اپنی چیرہ دستیاں مظلوم فسلطیوں پر ختم کریں اور اس خطے میں بسنے والے مسلمانوں کے لہو سے کھیلے جانے والی یہ خون کی ہولی اب بند کی جائے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ صدر مشرف نے پاکستانی امیج اور وقار کو دیگر یورپی ممالک میں بہترین وکیل اور سچے پاکستانی کی طرح پیش کیا ہے۔ برطانیہ میں پریس نے ان سے تند و ترش سوالات کی بھرمار کی لیکن اپنی مستقل مزاجی اور بلند انداز تخاطب سے صدر مشرف نے انہیں مکمل طور سے مطمئن کیا جس بنا پر برطانیہ کو فوراً یہ بیان دینا پڑا کہ پاکستان میں الیکشن کے بعد پاکستان کی دولت مشترکہ میں دوبارہ شمولیت کے بارے میں سنجیدہ رویہ اختیار کیا جائے گا۔ یہ خارجہ پالیسی اور صدر مملکت کے تدبر اور ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ قارئین کی اصلاح کیلئے یہ بات بتاتا چلوں کہ اس ملاقات میں صدر مملکت نے ہالینڈ کے ایک پارلیمنٹیرین کے اس ارادے کا سختی سے نوٹس لیا جس میں اس نے قرآن پاک کے خلاف فلم بنانے کا اعلان کیا صدر نے اس مسئلے پر یورپی یونین کے ممالک کی پرزور الفاظ میں مذمت کی اور تنبیہ کی اور کہا کہ ایسے عزائم کسی طور پر بھی مسلم امہ کیلئے قابل برداشت نہیں ہوں گے۔ درحقیقت پاکستان کے ارباب اختیار صحیح موقعوں پر صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر رہے جس کی بنا پر ہم نے کئی اہم امور پر اپنے تحفظات محفوظ رکھے ہم نے ہمیشہ صحیح موقع پر فیصلہ نہ کر کے بہت مواقع ضائع کئے۔ اب دعا ہے کہ امت مسلمہ جاگ کر اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ کرے اور کوئی بعید نہیں کہ G-B کے ممالک کی طرح امت مسلمہ کی ایک کرنسی اور ایک ملک کا نعرہ بلند ہو سکے۔

الیکشن کے موقع پر پولیس نے مکمل امن وامان برقرار رکھا ہے

پولیس کی کوششوں کے نتیجہ میں جرائم میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی ہے

نئی نسل پُر تشدد فلمیں اور ڈرامے دیکھ کر جرائم کی طرف راغب ہو رہی ہے

پنجاب کے مختلف شہروں میں معیاری تعلیمی ادارے کھولنے پر ادیب جاودانی مبارکباد کے مستحق ہیں

تقریب سے سکول کی چیئرپرسن مسز فوزیہ ادیب، شمائلہ بانو اور مریم مجید نے بھی خطاب کیا

مون لائٹ سکول گجرات میں منعقدہ ایک تقریب سے گجرات کے ڈی پی او محمود الحسن قریشی، ادیب جاودانی اور دیگر مقررین کا خطاب

گجرات کے ڈی پی او محمود الحسن قریشی نے کہا ہے کہ ضلع گجرات کی پولیس نے حالیہ الیکشن میں بالکل غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے اور کسی سیاسی جماعت کی سپورٹ نہیں کی۔ ہم نے الیکشن کے موقع پر امن وامان کی صورت حال کو مکمل طور پر کنٹرول کیا۔ ہم نے الیکشن سے قبل جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کر لیا تھا الیکشن کے بعد بھی ہم گجرات میں امن وامان کی صورت حال کو بہتر بنانے پر بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔ پولیس کی کوششوں کے نتیجہ میں جرائم میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ بات مون لائٹ سکول محلہ غریب پورہ گجرات میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے دور میں پولیس کی کارکردگی کو بہت بہتر بنایا ہے اور گجرات پولیس نے جرائم کی روک تھام کیلئے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نئی نسل پُر تشدد فلمیں اور ڈرامے دیکھ کر جرائم کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ والدین کو اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت پر توجہ دینی چاہیئے اور انہیں ٹی وی پر ایسی فلمیں اور ڈرامے دیکھنے سے منع کرنا چاہیئے اور میڈیا کو بھی چاہیئے کہ وہ ایسی فلمیں اور ڈرامے نہ بنائیں جن سے جرائم کو فروغ ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں ادیب جاودانی کو پنجاب کے مختلف شہروں میں معیاری تعلیمی ادارے کھولنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ مزید شہروں میں ایسے ہی معیاری تعلیمی ادارے قائم کر کے نئی نسل کے مستقبل کو سنواریں گے۔ ادیب جاودانی نے کہا کہ محمود الحسن قریشی ایک فرض شناس افسر ہیں ان کے آنے سے واقعی جرائم میں کمی واقع ہوئی ہے اور وہ محکمہ پولیس کو کرپشن اور سفارش کلچر سے پاک کرنے کیلئے بھی پوری طرح کوشاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پولیس کی تمام تر کاوشوں کے باوجود یہ امر بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ جب تک جرائم کے بنیادی عوامل سے نمٹا نہیں جاتا اس وقت تک اکیلی پولیس جرائم پر قابو نہیں پا سکتی۔ تقریب سے سکول کی چیئرپرسن مسز فوزیہ ادیب، شمائلہ بانو اور مریم مجید نے بھی خطاب کیا۔

گجرات کے ڈی پی او محمود الحسن قریشی ادیب جاودانی،

جب تک بنیادی عوامل سے نمٹا نہیں جاتا پولیس اکیلی جرائم پر قابو نہیں پاسکتی

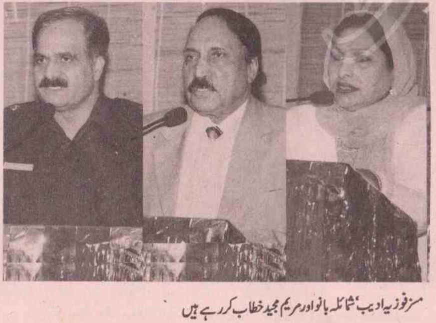

مسز فوزیہ ادیب، شمائلہ بانو اور مریم مجید خطاب کر رہے ہیں

سنٹرل جیل گوجرانوالہ

میں سب سے بڑا مسئلہ اوور کراوڈنگ کا ہے

جیل کے کھانے کا معیار بہتر تھا

میں اسی جیل میں قیدی رہا ہوں اس لئے مجھے قیدیوں کے مسائل کا زیادہ علم ہے

سنٹرل جیل گوجرانوالہ کے سپرنٹنڈنٹ **چوہدری سکندر حیات** سے ایک انٹرویو

گذشتہ دنوں سینٹرل جیل گوجرانوالہ کے سپرنٹنڈنٹ چوہدری سکندر حیات سے ملاقات ہوئی۔ چوہدری سکندر حیات کو یہ انوکھا اعزاز حاصل ہے کہ وہ اسی جیل میں قیدی بھی رہے ہیں چوہدری سکندر حیات دراصل سینٹرل جیل سیالکوٹ کے سپرنٹنڈنٹ تھے ان کے دور میں ججوں کی قیدیوں کے ہاتھوں ہلاکتوں کا سانحہ

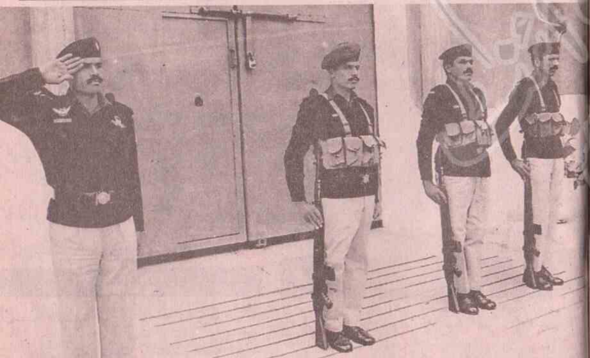

جیل کے گارڈ ادیب جاودانی، کاشف ادیب اور جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ملک عطاء کو گارڈ آف آنر پیش کر رہے ہیں

ادیب جاودانی گوجرانوالہ سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ چوہدری سکندر حیات سے انٹرویو کر رہے ہیں

پیش آیا تھا حالانکہ اس وقت چوہدری سکندر حیات چھٹی پر تھے لیکن اس کے باوجود پولیس نے انہیں گرفتار کر کے سینٹرل جیل گوجرانوالہ بھجوادیا وہ اسی جیل میں دو سال تک قیدی رہے تاہم بعد ازاں وہ بری ہو کر نوکری پر بحال ہوگئے چوہدری سکندر حیات نے بتایا کہ چونکہ میں اس جیل میں قیدی رہا ہوں اس لئے قیدیوں کے مسائل کا جتنا علم مجھے ہے کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ راقم نے اور کاشف ادیب نے گوجرانوالہ جیل کا معائنہ بھی کیا جیل کو صاف ستھرا پایا جیل کے کھانے کا معیار بھی بہت بہتر تھا البتہ اوور کراؤڈنگ کا مسئلہ ضرور تھا گوجرانوالہ جیل کی سکیورٹی بھی اطمینان بخش تھی بلکہ پورے پنجاب کی جیلوں کی سکیورٹی مناسب بتائی جاتی ہے اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد سندھ کی جیلوں سے 100 جرائم پیشہ قیدی فرار ہوگئے تھے جنہوں نے بعد میں لوٹ مار بھی کی تھی تاہم پنجاب کی جیلوں سے ایک قیدی بھی فرار نہیں ہوسکا اور اس کا سارا کریڈٹ آئی جی جیل خانہ جات پنجاب کیپٹن ریٹائرڈ سرفراز احمد مفتی کو جاتا ہے اس کا اعتراف گورنر پنجاب خالد مقبول نے بھی کیا ہے۔

کیپٹن ریٹائرڈ سرفراز احمد مفتی کو ان کی اعلیٰ کارکردگی پر حکومت پنجاب کو ان کی ملازمت پر توسیع کر دینی چاہیئے۔

ہاتھ

کل جنہوں نے کئی عہدو پیاں کئے
اب وہ اپنے کہے سے مکرنے لگے
پہلے جو ہاتھ جوڑا کئے رات دن
جیت کر ہم سے وہ ہاتھ کرنے لگے

بزنس

یہ الیکشن بھی ایک بزنس ہے پہلے لاکھوں لگائے جاتے ہیں
اور اگر کوئی سیٹ مل جائے پھر کروڑوں کمائے جاتے ہیں

رسم غربت

ریفرنڈم ہو یا ہو الیکشن میں
ہم نے تو کر کے کھائی ہے ہر حال میں
کوئی آئے رہے یا کہ جائے کوئی
رسم غربت نبھائی ہے ہر حال میں

رویہ

پہلے رویہ اور تھا پر اب ہے مختلف
تبدیل ہو گئی ہے نظر جیتنے کے بعد
جو ووٹروں کے گھر رہے موجود رات دن
ملتے نہیں وہ اپنے بھی گھر جیتنے کے بعد

جیت ہار

بعد الیکشن کے خاک اڑتی ہے
گم ہوئے جان وارنے والے
گھر بدلتے ہیں جیتنے والے
شہر بدلیں گے ہارنے والے

آوے ای آوے

آوے ای آوے چھاوے ای چھاوے
سانوں تھلے لاوے ای لاوے
بھولی بھالی قوم دوبارہ
ڈنگ سیاں توں کھاوے ای کھاوے

ادیب جاودانی کے دورۂ بھارت کا مختصر احوال

انہوں نے بھارت کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات سے ملاقات کی

ہوشیار پور کے ڈی اے وی کالج کے پرنسپل نے کالج میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا

ہوشیار پور کے صحافیوں نے ادیب جاودانی سے انٹرویوز کئے اور انہیں ہند سماچار میں شائع کیا

رپورٹ: محمد ارشد ضیاء

ادیب جاوانی امرتسر میں اوم پرکاش سونی سے بات چیت کر رہے ہیں

گذشتہ دنوں مجھے امرتسر جانے کا موقع ملا۔ اس دورے کا بنیادی مقصد وہاں ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کرنا تھا۔ اس کانفرنس کے علاوہ دیگر تقاریب میں بھی شرکت کی جہاں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والی ممتاز بھارتی شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ضلعی صدر ڈاکٹر اوپی سرین، آل انڈیا ہومن رائٹس ایسوسی ایشن کی چیئر پرسن ڈاکٹر ونیت سرین، پنجاب وومن یوگا ایسوسی ایشن کی صدر سندیب سرین،

ڈاکٹر جنمیت سنگھ پرنسپل ڈی اے وی کالج ہوشیار پور (اپنے آفس میں)

سرسوتی ایڈن گروپ کے ڈائریکٹر وریت دیوگن نے نہ صرف میرے اعزاز میں استقبالیہ تقاریب کا اہتمام کیا بلکہ میری تعلیمی وصحافتی خدمات کے اعتراف میں چند شیلڈیں بھی پیش کیں۔ ہوشیار پور کے ڈی اے وی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جنمیت سنگھ نے بھی اپنے کالج میں اسی طرح کی ایک تقریب منعقد کی جس میں کالج کے سابق پرنسپل درشن لال آنند، پروفیسر تجندر سنگھ اور سینئر سٹاف نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر مجھے مختلف ایوارڈز کے علاوہ بیش قیمت تحائف بھی پیش کئے گئے۔

امرتسر میں ڈاکٹر ونیت سرین نے میری بہت عزت افزائی کی اور میڈیا سے میرے متعدد انٹرویوز کرائے۔ ہوشیاپور میں بھی میری کئی بھارتی صحافیوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان میں سے بعض نے میرے انٹرویو بھی لئے جالندھر سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ ہندسماچار کے ڈپٹی ایڈیٹر اوم پرکاش سونی سے امرتسر میں ملاقات ہوئی۔ اوم پرکاش سونی کا آبائی شہر گجرات ہے۔ وہ گجرات میں پیدا ہوئے اور تعلیم لاہور سے حاصل کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی جوانی لاہور میں گزری ہے اس لئے انہیں یہ شہر بہت یاد آتا ہے۔ انہیں پاکستان آئے ایک عرصہ گزر چکا ہے دوبارہ آنے کی شدید خواہش کے باوجود وہ اس کیلئے وقت نہیں نکال سکے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں روزانہ امرتسر سے جالندھر کام کیلئے جانا پڑتا ہے اور مصروفیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اوم پرکاش سونی نے ایک تنظیم ''بزم ادب'' کی جانب سے میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا بھی اہتمام کیا۔ اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے راقم نے کہا کہ پاکستان اور بھارت کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب آنا چاہیئے اسی طریقے سے ہمارے دیرینہ مسائل کے حل کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ پاکستان کے باشعور عوام بھی اس چیز کے حق میں ہیں کہ دونوں ملکوں کے عوام میں ربط وتعلق بڑھے۔ بزم ادم کے ناظم اعلیٰ اوم پرکاش (پرکاش افقی) نے بتایا کہ بھارتی پنجاب میں ''ہندوسماچار'' واحد اردو روزنامہ ہے جو مئی 1948 میں امر شہید لالہ جگت نارائن نے جاری کیا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے نور نظر پدم شری وجے چوپڑہ نے اخبار کی ادارت کا قلم دان سنبھالا۔ انہی کی بدولت آج پنجاب میں دلدادگان اردو کو ''ہندوسماچار'' جیسا اخبار جو 10 صفحات پر محیط ہے صرف ڈیڑھ روپے میں دستیاب ہے۔ بھارت میں اخبارات کی اتنی کم قیمت دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ ہمارے اردو اور انگریزی اخبارات کی قیمت تو 7 روپے سے بھی زائد ہے۔ اس نشست میں سالگ رام بھاردواج، کلدیپ سنگھ غالب، شرون کمار ورما، سدرشن دیوگن اور دیگر پرستاران اردو نے بھی حاضرین کو اپنے اپنے خیالات سے مستفید کیا۔

بقیہ: پتھروں کی بارش

لوٹ کر نہیں آیا آپ واحد لوگ ہیں جو پہلی مرتبہ اس گاؤں میں آئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس گاؤں کے باہر سید دامن شاہ نام کے بزرگ کا ایک مزار ہے جو بہت بڑی ہستی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے گاؤں پر اچانک پتھروں کی بارش شروع ہوگئی تھی۔ جب ہمیں کوئی حل نہ ملا تو ہم کپورتھلہ میں ایک مشہور نجومی کے پاس چلے گئے اس نے بتایا کہ آپ کے گاؤں کے مشرق کی طرف ایک بزرگ ہے آپ لوگوں نے اس مزار کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ یہ پتھراؤ اس مزار میں ابدی نیند سونے والے بزرگ ہی کررہے ہیں۔ آپ اس مزار پر جا کر چراغاں کریں اور اپنی سلامتی کیلئے دعائیں مانگیں پتھروں کی بارش رک جائے گی۔ گاؤں والوں نے ایسا ہی کیا اور انہیں اس مشکل سے نجات مل گئی۔ اب ہر اتوار کو مقامی لوگ اس مزار پر آکر دعائیں مانگتے ہیں چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور فیض یاب ہو کر لوٹتے ہیں۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہندوؤں کے اس گاؤں میلی میں ایک مسلمان بزرگ مدفون ہیں اور انہوں نے ان ہندوؤں سے اپنے آپ کو منوالیا ہے۔ ہم نے بھی سید دامن شاہ کے مزار پر جا کر فاتحہ خوانی اور ذکر الٰہی کیا۔ وہاں جا کر ہمیں بہت روحانی سکون ملا۔ اسی گاؤں میں ایک اور بزرگ کی بھی قبر ہے جو ''ان داتا'' کے نام سے مشہور ہیں سنا ہے وہ بھی بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔

( )

پتھروں کی بارش نے ہندوؤں کو مسلمان بزرگ کا مرید بنا دیا

کپورتھلہ کے نجومی نے بتایا کہ بزرگ کے مزار کو نظرانداز کرنے پر گاؤں مصیبت کا شکار ہے

میلی کے گاؤں والوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور پھولوں کے ہار ڈالے

ہوشیار پور بھارت میں ادیب جاودانی کا اپنے آبائی گاؤں میلی کا دورہ

کچھ عرصہ قبل راقم کو ہوشیار پور بھارت جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے والد کا آبائی گاؤں میلی ہوشیار پور سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بھارت آمد پر میری بڑی دلی خواہش تھی کہ اپنے اس آبائی گاؤں کی جھلک ضرور دیکھوں۔ اس خواہش کی تکمیل کیلئے میرے میزبان پروفیسر تجندر سنگھ اور درشن لال آنند نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ دونوں ایک دن ہمیں اپنی گاڑیوں میں بٹھا کر اس گاؤں میں لے گئے۔ میری اہلیہ فوزیہ ادیب اور بیٹا کاشف ادیب بھی ہمراہ تھے۔ ہمارے میزبانوں نے گاؤں والوں کو پہلے سے بتا دیا تھا کہ آپ کے ”میلی“ میں رہنے والا ایک شخص جو ہجرت کرکے پاکستان چلا گیا تھا اس کا بیٹا، بہو اور پوتا آپ کے گاؤں آنا چاہتے ہیں۔ جب ہم ہوشیار پور سے میلی پہنچے تو تمام گاؤں والوں نے والہانہ استقبال کیا اور گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ گاؤں والوں نے ہمیں وہ مکان بھی دکھایا جہاں میرے والد قیام پاکستان سے پہلے رہا کرتے تھے۔ اب اس مکان میں ایک ہندو گوجر خاندان رہائش پذیر ہے۔ وہ لوگ بھی ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہماری خوب آؤ بھگت کی۔

گاؤں والوں نے ہمیں بتایا کہ 1947ء میں تقسیم کے وقت بلوائیوں نے یہاں حملہ کرکے پچیس تیس مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا اور ان کی سات، آٹھ نوجوان لڑکیاں اٹھا کر لے گئے تھے۔ ان کے ہاتھ مسلمانوں کا جو کچھ بھی آیا وہ اپنے ساتھ لے گئے یہاں تک کہ انہوں نے بکریوں تک کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی اور روح فرسا داستانیں بھی سنائیں جنہیں سن کر ہماری آنکھیں بھر آئیں۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ یہاں سے ہجرت کر جانے والوں میں کوئی شخص دوبارہ

باقی صفحہ نمبر 213 پر

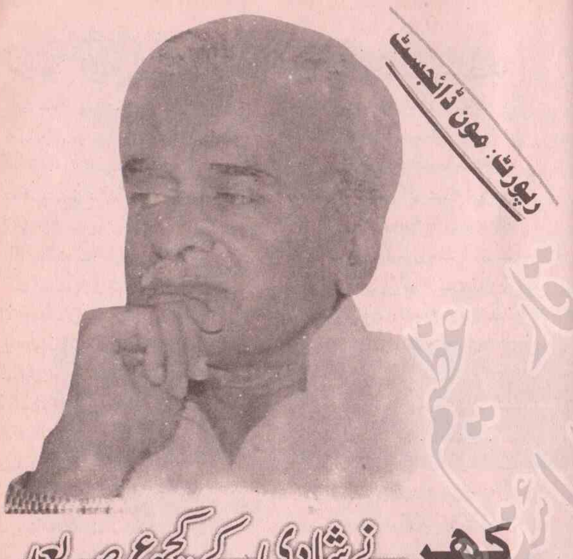

رپورٹ: مون ڈائجسٹ

کھر نے شادی کے کچھ عرصہ بعد مجھے تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا

میں نے کھر سے پسند کی شادی کی، 25 لاکھ حق مہر، جوہر ٹاؤن والا گھر، 110 تولہ زیور اور ماہانہ 20 ہزار روپے خرچ طے ہوا تھا

میرا اور غلام مصطفیٰ کھر کا معاملہ ذاتی ہے اسے سیاسی رنگ نہ دیا جائے

سابق گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر کی اہلیہ نیلوفر

کھر نے کہا کہ غلام مصطفیٰ کھر کو زیب نہیں دیتا کہ ۔۔

غلام مصطفیٰ کھر کی نئی بیوی نیلوفر کھر کی صحافیوں سے بات چیت

گھریلو مسئلے کو سیاسی رنگ دے کر اپنی شخصیت مسخ کریں۔' انہوں نے جاگیردارانہ روایات کے مطابق مجھے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا اور مار پیٹ کر رات کو گھر سے نکال دیا۔ اب حقائق کے منافی بیان بازی کر کے اپنا کیا دھرا حکومت پر ڈال رہے ہیں۔ صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں نے غلام مصطفیٰ کھر سے پسند کی شادی کی اور نکاح کے وقت 25 لاکھ روپے حق مہر' جوہر ٹاؤن والا گھر' 110 تولہ زیور اور ماہانہ 20 ہزار روپے خرچ طے ہوا' مگر شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے حسب عادت مجھے تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا یہاں تک ایک روز رات گئے مجھے تشدد کا نشانہ بنا کر گھر سے نکال دیا۔ اپنے شوہر کے اس بیان پر کہ ہمارے درمیان کوئی تنازع نہیں اور اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو گھر کی چار دیواری کے اندر ہی حل کر لیتے نیلوفر کھر نے کہا کہ غلام مصطفےٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہتے اور سیاسی میدان کی طرح وہ اپنی نجی زندگی میں بھی قول کے پکے نہیں۔ انہوں نے لو میرج کرتے وقت بہت سارے عہد و پیمان کیے مگر کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے اپنی کوئی بات پوری نہیں کی۔ کھر سیاست کی طرح گھریلو معاملات میں ناکام ہیں اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کی بجائے ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ میرا اور کھر کا خانگی مسئلہ ہے اس میں حکومت یا ایجنسیوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔

نیلوفر نے کہا کہ غلام مصطفیٰ کھر نے گذشتہ پانچ ماہ سے مجھے خرچہ وغیرہ بھی دینا بند کر رکھا ہے اور بار بار رابطہ کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے خرچہ دینے سے انکار کر دیا ہے جس کی وجہ سے مجھے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش آئی ہے تاہم میں ان کی قانونی اور شرعی بیوی ہوں اور ہم دونوں کے درمیان موجود جھگڑے کو سیاسی رنگ نہ دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ نجی ٹی وی چینل پر مصطفیٰ کھر نے میری جانب سے لگائے گئے الزامات کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ ان کے سیاسی مخالف ان کی اہلیہ کو میری سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانے کیلئے استعمال کر رہے ہیں مگر میں یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں خالصتاً ایک گھریلو خاتون ہوں اور میرا نہ کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی سیاست میں آنے کا میرا کوئی ارادہ ہے لہٰذا میرے معاملہ کو سیاسی رنگ نہ دیا جائے۔ اس موقع پر انہوں نے اخبار نویسوں کو تصویر بنانے سے بھی روک دیا اور کہا کہ میں اس مسئلہ پر عنقریب ایک پریس کانفرنس کرنے والی ہوں اور اس سے قبل میں اپنی تصویر شائع نہیں کروانا چاہتی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ پریس کانفرنس کب کریں گی تو انہوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ سب سے پہلے ملتان میں پریس کانفرنس کریں۔

یاد رہے کہ دو سال قبل جب نیلوفر کا غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا اور دونوں میں خفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو ان کے متعلق مون ڈائجسٹ نے ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ جس کے مطابق

غلام مصطفیٰ کھر سیاست کی طرح ذاتی زندگی میں بھی ایک ناکام شخص ہیں

غلام مصطفیٰ کھر کی نیلوفر سے پہلی ملاقات ایک بہت بڑے بیوروکریٹ کے گھر ایک شادی کی دعوت کے دوران ہوئی تھی۔ مصطفیٰ کھر کی نظر اس محفل میں نیلوفر پر پڑی اور وہ ان کے شباب کے گرویدہ ہو گئے۔ شادی کی تقریب کے اختتام پر گھر واپس آتے ہوئے تمام راستے نیلوفر کھر کے حواس پر سوار رہی تھی اور اگلے ہی دن کھر نے نیلو کے بارے میں تمام اہم معلومات حاصل کر لیں تھیں۔ کھر کی مسلسل جدوجہد اور کوششوں سے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مستقبل سے بے خبر نیلو بھی مصطفیٰ کھر کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور اس وقت

مصطفیٰ کھر نے اپنی بیویوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیوں کا عنوان بن چکا ہے

اس قسم کی خبریں بھی آئیں کہ نیلوفر بہت کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتیں ہیں اور وہ کسی قسم کی شہرت' لالچ یا مطلب کے بغیر مصطفیٰ کھر سے محبت میں گرفتار ہوئی ہیں۔ حالانکہ نیلوفر کے تازہ بیان نے اس حقیقت کی قلعی کھول دی ہے کہ وہ کسی لالچ کے بغیر ان سے محبت میں گرفتار ہوئی تھی بلکہ انہوں نے شادی سے قبل اپنے مطالبات' اور کھر کے ان مطالبات کے تسلیم کرنے کا باقاعدہ میڈیا پر اعلان کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نیلوفر نے کھر سے شادی ان کی محبت میں اندھے ہو کر نہیں کی بلکہ دولت کی خاطر کی تھی۔ تاہم شادی سے قبل نیلوفر اور کھر میں طویل عرصہ تک ملاقاتیں جاری رہیں اور نیلوفر غلام مصطفیٰ کھر کو چھپ چھپ کر ملتی رہی۔ ان کی زیادہ تر ملاقاتیں کھر کے کالا خطائی میں واقع فارم ہاؤس پر ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں کو لوگوں نے کراچی اور اسلام آباد میں بھی اکٹھے گھومتے پھرتے دیکھا۔ نیلوفر کا عشق کھر کے سر چڑھ کر بولا اور بالآخر دونوں نے شادی کر لی۔ یہ کھر کی غالباً تیرہویں شادی تھی۔ مون ڈائجسٹ نے نیلوفر کو مصطفیٰ کھر سے شادی کرنے سے قبل خبردار

میں ایک گھریلو خاتون ہوں میرا کسی سیاسی جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے

کرنے کی کوشش کی تھی اور ایک رپورٹ اس قسم کی بھی شائع کی تھی جس میں کھر کی سابقہ بیویوں کی تفصیل اور ان کے ساتھ کھر کے رویئے کی داستان بھی درج تھی۔ مگر کہتے ہیں کہ دولت اور عشق کا نشہ بہت برا ہوتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ نیلوفر کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ ماضی میں کھر نے اپنی بیویوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا وہی سلوک انہوں نے نیلوفر کے ساتھ کیا۔ اس حوالے سے ہم مون ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے چند اقتباسات ذیل میں قارئین کی دلچسپی کیلئے پیش کر رہے ہیں جو کھر صاحب کے اپنی بیویوں کے ساتھ برے رویئے کی پوری طرح وضاحت کرتے ہیں۔

''غلام مصطفیٰ کھر نے اپنی بیویوں کے ساتھ ماضی میں جو سلوک کیا وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیوں کا عنوان بن چکا ہے۔

غلام مصطفیٰ کھر جنوبی پنجاب کے جس علاقے (مظفر گڑھ) سے تعلق رکھتے ہیں وہاں ہر طرف غربت کا راج ہے۔ فاقے رقص کرتے ہیں، غریب، بے زر اور بے در شہری احساس محرومی کے اژدھے کا نوالہ بنے ہوئے ہیں۔ اسی علاقے میں بھارت کے علاقے راجستھان سے ایک ''کھر'' خاندان ہجرت کر کے پاکستان سے پہلے آباد ہو گیا تھا۔ اس خاندان کی کہانی اور شجرہ نسب کیا ہے وہ شاید خود ''کھر'' خانوادے کے لوگوں کو بھی معلوم نہیں۔ تاریخی کتابوں میں جنوبی پنجاب کے جاگیرداروں، وڈیروں، نوابوں اور سرداروں کا ذکر آتا ہے۔ ان میں مزاری، لغاری، دریشک، کھوسے نوابزادے، گورمانی، دولتانے، قریشی، گیلانی، گردیزی، ڈاہے وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں کھر خاندان کا ذکر کہیں سننے اور پڑھنے کو نہیں ملتا۔ ''کھر'' کا لاحقہ محمد یار کھر کے ساتھ کہاں سے اور کیوں لگا؟ تاریخ اس حوالے سے خاموش ہے اور مورخ حیران ہے صرف اتنا معلوم ہے کہ محمد یار کھر نے پانچ شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی کے بطن سے غلام مصطفیٰ کھر پیدا ہوتے ہیں۔ محمد یار کھر کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹوں میں غلام مصطفیٰ کھر، ملک عزلی کھر، میلادی کھر، مرتضیٰ کھر اور ربانی کھر شامل ہیں۔ ربانی کھر کی فیملی دوسرے بھائیوں سے خاصی مختلف اور اپنے کام سے کام رکھنے والی ہے۔ ربانی کھر پنجاب کے صوبائی وزیر رہے ہیں۔ ان کی ایک بیٹی حنا ربانی کھر وفاقی وزیر رہی ہے جبکہ مصباح ربانی قومی اسمبلی کی رکن رہی ہیں۔ غلام مصطفیٰ کھر نے سترہ سال کی عمر میں اپنی ایک رشتہ دار خاتون سے شادی کی۔ یہ شادی خاندانی دباؤ کا نتیجہ تھی۔ اس نے اپنی بیوی پر زیادہ توجہ نہ دی اور مختلف خواتین کے پیچھے دوڑتا رہا ہے۔ احمد ظہیر اپنی کتاب ''پارلیمنٹ سے بازار حسن'' میں لکھتے ہیں کہ 1964ء میں غلام مصطفیٰ کھر نے رضیہ مینشن لاہور کی مالکہ کی ایئر ہوسٹس بیٹی صفیہ عرف فردوس سے شادی کی۔ بعد ازاں ان میں طلاق ہو گئی۔ ''میڈا سائیں'' کی مصنفہ اور غلام مصطفیٰ کھر کی سابقہ بیوی تہمینہ درانی (جو آج کل میاں شہباز شریف کی اہلیہ ہیں) نے صفیہ اور کھر کی شادی کے اختتام کی کہانی کچھ یوں بیان کی ہے کہ...... غلام مصطفیٰ کھر کے بھائی گورنر ہاؤس اس سے ملنے آئے۔ اسے بتایا گیا کہ صفیہ نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ اب آپ گورنر ہیں، یہ آپ کی عزت کا معاملہ ہے۔ صفیہ نے آپ کے چھوٹے بھائی غلام مرتضیٰ سے ناجائز تعلقات قائم کر لئے تھے۔ ہم اس بات کو آپ سے مزید نہیں چھپا سکتے۔'' اس نے صفیہ کو بے دردی سے مارا پیٹا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس نے صفیہ اور دائی عائشہ کے ساتھ ناقابل بیان'' تشدد کیا، جس پر دونوں کو ہسپتال لے جانا پڑا۔ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مصطفیٰ کھر نے دائی عائشہ کو تقریباً جان سے مار ڈالا جسے اس معاملے کا شروع سے علم تھا۔ اس نے اپنی صفائی میں سیدھی سی بات کہی، میں آپ کو بتانے کی جرات کیسے کرتی۔ میری وجہ سے خاندان میں فساد پڑ جاتا۔ آپ کا بھائی مجھے مار ڈالتا۔ وہ میری بوٹیاں ابال کر اونٹوں کو کھلا دیتا۔'' ایک اور جگہ ہفت روزہ الفتح کے حوالے سے احمد ظہیر لکھتے ہیں کہ: غلام مصطفیٰ کھر نے صفیہ کو طلاق دینے کے بعد باقاعدہ شادی تو نہیں کی مگر وہ بازار حسن کے بالا خانوں کا طواف کرتے رہے۔ 1968ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ انہی دنوں ان کا تعارف ایک رقاصہ نو بہار سے ہوا۔ جو ایک مشہور طوائف کی بیٹی تھی۔ اس کی پہلی شادی ملتان کے گردیزی خاندان کے ایک فرد سے ہوئی تھی۔ لیکن گردیزی صاحب نے کچھ عرصہ بعد اسے چھوڑ دیا اور اس کی بڑی بہن سے شادی رچا لی۔ چنانچہ نو بہار نے ''ناہید'' کے نام سے فلموں میں کام شروع کر دیا۔ وہ پہلے پہل ایک پنجابی فلم ''ہڈ حرام'' میں آئی پھر دلجیت مرزا نے اسے اپنی دو فلموں میں کاسٹ کیا۔ دلجیت مرزا اور راجہ منور احمد پیپلز پارٹی کے سابق ایم پی اے میں گہری دوستی تھی۔ راجہ منور کھر کے گہرے دوست تھے۔ چنانچہ اسی دوستی کے ذریعے نو بہار عرف ناہید کا کھر سے تعارف ہوا۔ غلام مصطفیٰ کھر ناہید پر اس قدر لٹو ہوئے کہ رات کے علاوہ دن کو بھی اس کے کوٹھے پر نظر آنے لگے۔ اس امر کے گواہ ''اس بازار'' کے لوگوں کے علاوہ علاقے کے پولیس والے بھی ہیں۔ آہستہ آہستہ ناہید کی شہرت اتنی بڑھ گئی اور اس کے بالا خانے پر تماش بینوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کھر حسد کی آگ میں جلنے لگے اور انہوں نے ناہید کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کی غرض سے اس سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد ناہید نے اپنا دھندا بند کر دیا اور شاہی مسجد کے قریب فورٹ روڈ پر اپنی نئی تعمیر شدہ بلڈنگ میں رہنے لگی۔ جہاں غلام مصطفیٰ کھر عموماً راتیں بسر کرتے تھے۔ اسی دوران کھر پنجاب کے گورنر اور ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔

گرسی اقتدار پر فائز ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک ناہید کے ہاں جاتے رہے۔ بعد ازاں چند دوستوں کے سمجھانے پر انہوں نے اپنی سیاسی پوزیشن کو بے داغ ثابت کرنے کیلئے ناہید کو ایک لاکھ 20 ہزار روپے اور ایک مرسڈیز کا نمبر آئی۔ آر۔ ڈی 480 دیکر چھٹکارا حاصل کر لیا۔ بعد میں ناہید کے بطن سے پیدا ہونے والی غلام مصطفیٰ کھر کی بیٹی کے تعارف کے معاملے پر انہوں نے ایک شخص کے ذریعے ناہید پر ڈاکا زنی کا مقدمہ بنوا دیا۔ ایف آئی آر کے مطابق ''ناہید نے اس کے ساتھ کسی پروگرام میں جانے کیلئے بھاری رقم وصول کی لیکن بعد ازاں جانے سے انکار کر دیا اور جب اس نے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو ناہید اور اس کے گھر والوں نے اسے زدوکوب کیا اور قتل کی دھمکی دے کر نقدی اور گھڑی چھین لی۔'' اپنے دور گورنری میں کھر نے اپنے ایک بھائی کی شادی کیلئے جنرل رانی سے بھی روابط بڑھائے۔ وہ

جنزل رانی پر دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ اپنی بیٹی کے ہمراہ گورنر ہاؤس آئے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کھر کو بہت غصہ آیا۔ وہ موقع کی تلاش میں رہے۔ اتفاق سے جلد ہی موقع ہاتھ لگ گیا۔ جنزل رانی غلام مصطفےٰ کھر کی سابق محبوب نیل کنول کے ہمراہ کانٹی نینٹل ہوٹل لاہور میں مقیم تھی۔ رات کو اس نے محفل سجائی، پولیس کا چھاپہ پڑا۔ جنزل رانی، نیل کنول وغیرہ گرفتار کر لی گئیں۔ تہمینہ کھر کی شادی کا انجام بھی عوام کے سامنے ہے وہ غلام مصطفےٰ کھر جو ایک طویل عرصہ تک تہمینہ سے محبت کا دم بھرتا رہا۔ گورنری پروٹوکول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسوال پہنچ گیا تھا۔ جب اس کا تہمینہ سے دل بھر گیا تو وہ اس کی شادی شدہ بہن ''عدیلہ'' کو برباد کرنے میں مصروف رہا۔ اور جب تہمینہ سے جان چھڑانے پر آیا تو خونخوار درندہ بن گیا۔ آگے کی کہانی تہمینہ کی اپنی زبانی سنیئے ''وہ مجھے گھورنے لگا، اس کے بعد اس پر سراسر جنون طاری ہو گیا۔ اسے اپنے حواس پر قابو نہ رہا۔ وہ دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی دونالی بندوق اٹھا کر اس کے بٹ سے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں گر پڑی، اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے پے در پے مجھ پر ضربیں لگائیں، میرے سر میں زخم ہو گیا۔ جب خون بہنے لگا تو اس نے ہاتھ روکا، غصے سے کانپتے ہوئے اس نے کہا ''ابھی اسی لمحے اپنی امی کو فون کرو، انہیں بتاؤ کہ تم پاگل ہو۔ انہیں بتاؤ کہ یہ ساری باتیں تم نے خود سے گھڑی ہیں۔ فون اٹھاؤ۔'' وہ دھاڑا...... میں...... میں یہ نہیں کر سکتی۔ انہیں میری اس بات کا ہرگز یقین نہ آئے گا۔ میں اپنا یہ بیان کیسے بدلوں۔ انہیں شبہ ہو جائے گا کہ...... وہ پھر مجھے مارنے لگا۔ کھڑی ہو جاؤ کتیا کہیں کی۔ میں بڑی مشکل سے اٹھی...... دائی اور بلال کمرے کے باہر میری دونوں بچیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ عائشہ بٹ کے ساتھ بھی مصطفےٰ کھر اکثر تشدد کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جان چھڑانے میں ہی عافیت سمجھی۔ عائشہ بٹ سے علیحدگی کے بعد کسی عورت نے مصطفےٰ کی زندگی کا شریک سفر بننے کی حامی نہ بھری۔ یہ وہ وقت تھا کہ مصطفےٰ کو احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے اور کوئی عورت اس کی زندگی میں آنا پسند نہیں کرتی۔ آخر مصطفےٰ کے بھائی کی ایک سالی کی بیٹی ایونیا مڑل سے ان کی شادی کروا دی گئی۔ اس طرح ایونیا نے اپنے خالو کے بھائی سے شادی کر لی۔ اس طرح صفیہ ایونیا کی خالہ بھی اور جٹھانی بھی لگتی ہے۔ ایونیا اور مصطفےٰ میں نہ کوئی ذہنی مطابقت تھی اور نہ کوئی انڈرسٹینڈنگ۔ مصطفےٰ کھر اس کے خاندان والوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایونیا بھی اس کے بے پناہ اور وحشیانہ تشدد کا نشانہ بھی بنتی رہی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ مصطفےٰ کھر کی بیوی ایونیا کا تمام زیور چوری کر لیا گیا تھا اور اس چوری کا الزام بھی مصطفےٰ کے خادم خاص بالی پر عائد کیا جاتا تھا۔ حقیقت کیا تھی اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور اب تازہ ترین بیوی نیلوفر کے ساتھ بھی کھر نے سابقہ بیویوں سے روا رکھا جانے والا سلوک کیا ہے۔ آج نیلوفر کھر بھی ان کے ظلم و ستم کا شکار ہے۔ کاش وہ ان سے شادی کرنے سے قبل سابقہ بیویوں کے حشر سے کوئی عبرت حاصل کر لیتیں تو آج کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ذہنی بے زاری کے باوجود مصطفےٰ ایونیا سے جان نہیں چھڑا سکتا کیونکہ ایسا کرنے پر اسے 26 لاکھ روپے اور 8 مربع ایونیا کو دینے ہوں گے۔

شیخ رشید سے شادی کر کے ان کی بیوہ نہیں بننا چاہتی

جب سے شیخ صاحب دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ میں آئے ہیں

میں نے ان سے شادی کرنے کے خیال کو دل سے نکال دیا ہے

راولپنڈی کی بے باک شاعرہ رخسانہ نازی سے ایک دلچسپ گفتگو

سوال: آپ کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ آپ سابق وفاقی وزیر شیخ رشید سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ اُن کا تعلق آپ کی برادری سے تھا اور یہ بھی خبر تھی کہ وہ بھی آپ سے شادی کرنا چاہتے تھے تو پھر بات آگے کیوں نہیں بڑھی؟

جواب: جی اِس بات میں کسی حد تک حقیقت ہے کہ میں شیخ رشید سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ایک دو بار میں نے سنجیدگی سے اِس بارے میں سوچا تھا لیکن اب یہ

سوچ میں نے اپنے دل و دماغ سے نکال دی ہے۔ اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب شیخ صاحب دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ میں ہیں۔ اِس لئے میں اُن سے شادی کر کے اُن کی بیوہ نہیں بننا چاہتی۔ اِس لئے میں نے اُنکے ساتھ شادی کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔

سوال: کیا کسی اور کے ساتھ شادی کرنے کا بھی خیال آپ کے دل میں آیا۔ سنا ہے کہ جب سے آپ کا نیا مجموعہ کلام ''کنوارہ نہیں ملا'' چھپ کر منظر عام پر آیا ہے، اُس کے بعد سے آپ کو شادی کے بہت سے پیغامات موصول ہوئے ہیں؟

جواب: جی ہاں! مجھے شادی کے کئی پیغامات موصول ہوئے ہیں۔ یہ پیغامات اندرون ملک اور بیرون ملک سے بھی آئے ہیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی پیغام سنجیدہ نہیں تھا۔ سارے ہی ٹھرکی قسم کے رشتے تھے جو گپ شپ لڑانے کیلئے مجھے فون کرتے رہتے تھے۔ کافی عرصہ پہلے نیو یارک سے ایک صاحب مجھے لمبی لمبی فون کالز کرتے تھے اور مجھ سے محبت جتاتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے اُن سے کہا کہ آپ جو اتنی لمبی لمبی کالیں کرتے ہیں اور وقت پاس کرتے ہیں کیا نیو یارک میں آپ کیلئے کوئی لڑکی نہیں ہے جس سے آپ رومانٹک باتیں کر سکیں اور دل کی بھڑاس نکال سکیں تو اِسکے جواب میں اُس نے کہا کہ یہاں لڑکیاں تو بے شمار ہیں اور وہ رومانوی گفتگو کرنے کیلئے بھی تیار ہوتی ہیں مگر اِس کا کیا کیا جائے کہ وہ گفتگو کرنے کا بھی بل بنا دیتی ہیں جو بھاری بھر کم ہوتا ہے۔ آپ سے باتیں اِس لئے کرتا ہوں کہ کم از کم آپ بل کا تقاضا تو نہیں کرتی ہیں۔ اُس شخص کی روز روز کی بک بک اور سبز باغ دکھانے سے تنگ آ کر میں نے اُس کا فون اٹینڈ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

سوال: کچھ عرصہ قبل آپ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ''کاش میں جنرل پرویز مشرف کی پڑوسن ہوتی''...... کیا آپ اب بھی ایسا چاہتی ہیں؟

جواب: توبہ توبہ! آپ نے کیا بات کہہ دی ہے۔ میں نے اِس خواہش کا اظہار اُس وقت کیا تھا جب صدر پرویز مشرف پاکستان میں بہت مقبول تھے۔ اب تو اُن کی مقبولیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اب تو میں یہ کہتی ہوں کہ شکر ہے کہ میرا گھر اُن کے پڑوس میں نہیں ہے۔ اگر اُن کے پڑوس میں ہوتا تو اب تک تو طالبان اور القاعدہ نے میرے گھر پر خودکش حملہ آور بھیج دیئے ہوتے...... میں راولپنڈی میں اپنے گھر میں بڑی پرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔ مجھے کسی بڑی شخصیت کے پڑوس میں ہونے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

سوال: جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں بہت سی خواتین، صوبائی اور قومی اسمبلی کی ممبر بنی ہیں اور اُنہوں نے خوب ترقی کی ہے اور نام کمایا ہے۔ کیا آپ کا بھی سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ ہے؟

جواب: گزشتہ حکومت میں جو خواتین صوبائی اور قومی اسمبلی کی ممبر بنی ہیں اُنہوں نے خواتین کے حقوق کیلئے کچھ نہیں کیا۔ بس وہ مردوں کا دل لبھانے کیلئے اسمبلیوں میں آتی رہیں اور کئی خواتین نے تو اسمبلیوں میں اپنے لئے مناسب بَر بھی ڈھونڈ لے ہیں اور شادی کر کے وہ پیا گھر سدھار گئی ہیں۔ ایسی خواتین اِسی مشن کے تحت اِس فیلڈ میں آئی تھیں۔ مشن مکمل ہوتے ہی وہ واپس لوٹ گئی ہیں۔ میرا سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

سوال: پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی شہادت راولپنڈی میں ہوئی اور اب محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی راولپنڈی میں ہی شہید کر دیا گیا۔ اِس پر لوگ اِس شہر کو قاتلوں اور بے وفاؤں کا شہر کہنے لگ گئے ہیں۔ اِس بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

جواب: راولپنڈی کے لوگ قاتل اور بے وفا نہیں ہیں۔ لیاقت علی خان اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو راولپنڈی کے شہریوں نے نہیں بلکہ باہر کے کچھ لوگوں نے قتل کیا ہے۔ آپ راولپنڈی شہر کے شہریوں کو قاتل اُس وقت کہتے جب تفتیشی ٹیم بے نظیر بھٹو کے قاتلوں کو راولپنڈی کے شہری ثابت کرتے۔

سوال: عام تاثر یہ ہے کہ آپ نے جو اپنا مجموعہ کلام ''کنوارہ نہیں ملا'' لکھا ہے یہ مجموعہ کلام آپ کی زندگی اور جذبات کی عکاسی کرتا ہے اور عام تاثر ہے کہ اگر مزید دو چار سال تک آپ کی شادی نہ ہوئی تو آپ اِس عنوان سے بھی اپنا مجموعہ کلام لکھیں گی کہ ''مجھے کوئی شادی شدہ بھی نہ ملا''

جواب: اس عنوان سے میرا مجموعہ کلام لکھنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ویسے میں آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ مجھے شادی شدہ کے علاوہ کنواروں نے بھی کئی بار شادی کے پیغام بھیجے تھے لیکن میرے معیار پر اُن میں سے کوئی بھی پورا نہیں اُترا۔ اب ملک میں جتنی مہنگائی ہو چکی ہے اِس کے بعد لوڈ شیڈنگ اور ضروریات زندگی کی اشیاء میں گرانی اِس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اچھا ہوا میں نے شادی نہیں کی۔ اگر میں شادی کر لیتی اور میرے چار پانچ بچے ہو جاتے تو میں اُن کو کہاں سے کھلاتی اور کیسے اُن کی پرورش کرتی۔

سوال: سنا ہے کہ گذشتہ دنوں آپ اکیلی ہی بھارت میں مشاعرہ پڑھنے گئیں تھیں۔ آپ کو وہاں کوئی ڈر خوف تو محسوس نہیں ہوا؟

جواب: میں پہلی مرتبہ اکیلی نہیں گئی تھی۔ میرے ساتھ احمد فراز، فرخ زہرہ گیلانی اور ایک دو اور شاعرات بھی تھیں۔ دوسری مرتبہ میں اکیلی ضرور گئی تھی لیکن مجھے وہاں کوئی ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوا۔ بھارت والوں نے میری بڑی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کی۔ حال ہی میں بھارت کے ایک سکھ شاعر نے مجھے دعوت دی ہے کہ آپ بھارت آئیں۔ ہم بھارتی پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں آپ کے مشاعرے کروائیں گے لیکن سکھوں نے 1947ء میں مسلم خواتین اور لڑکیوں کے ساتھ جو ظلم و ستم کیے، اِس کی بناء پر مجھے سکھوں سے بڑا ڈر لگتا ہے چنانچہ میں کسی سکھ کی دعوت پر کبھی بھارت نہیں جاؤں گی۔

سوال: راولپنڈی کی کئی شاعرات نے ملک کی نامور شخصیات پر کتابیں لکھیں ہیں تو اُنکے وارے نیارے ہو گئے اور آپ ایک صحافی ماموں کے سبز باغوں میں مبتلا رہیں اور وہ آپ کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکے۔ اِس کا ذکر آپ اپنے اکثر ملنے جلنے والوں سے کرتی ہیں۔ آپ نے فائدہ اُٹھانے والا ایسا کوئی کام زندگی میں نہیں کیا جبکہ آپ کے صحافی ماموں نے کئی صحافی خواتین کو پلاٹ بھی دلوائے لیکن آپ کیلئے اُنہوں نے ایک پلاٹ بھی الاٹ نہ کروایا۔ اِس پر آپ کیا تبصرہ کریں گی؟

جواب: کتابیں لکھ کر شہرت حاصل کرنے والی شاعرات میں سے میں نہیں ہوں۔ یہ تو کسی کی شہرت سے خود فائدہ اُٹھانے والی بات ہے۔ ایسا فائدہ اُٹھانے والوں کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں۔ جہاں تک آپ نے صحافی ماموں کا ذکر کیا تو اگر کوئی میرے سگے ماموں ہوتے تو وہ ضرور میرے لئے کچھ نہ کچھ کرتے۔ جس ماموں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے وہ نہ ''تین میں ہیں نہ تیرہ میں''۔ اُن سے کیسا گلا وہ تو خود روزگار کی تلاش میں رہتے ہیں، اب وہ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں ہاں ان کیلئے میں یہی دُعا کر سکتی ہوں کہ وہ جہاں رہیں خوش رہیں اور برسرِ روزگار رہیں۔

کیا تنویر آفریدی

عدنان سمیع خان بن سکے گا؟

وہ اکثر و بیشتر نجی محفلوں اور تقریبات میں عدنان سمیع خان کے گانوں پر پرفارم کرتا ہے

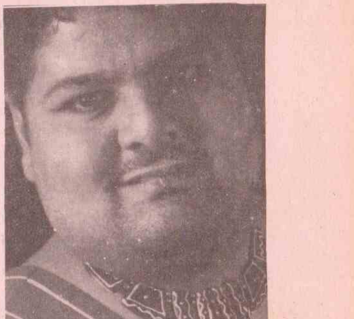

تنویر آفریدی میں ٹیلنٹ موجود ہے اسے اپنے فن اور کام کے حوالے سے اپنا آپ منوانا چاہیئے دوسروں کی نقالی کر کے وہ زندگی میں کامیابی نہیں سمیٹ سکتا

تنویر آفریدی وائی ایم سی اے میں بیوٹی اینڈ میک اپ ٹیکنکس لیکچرار ہیں۔ بناؤ سنگھار اور میک اپ سے ان کو خاصی دلچسپی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہت اچھے گلوکار بھی ہیں لیکن ان کی وجہ شہرت یہ ہے کہ نہ صرف ان کی شکل عدنان سمیع خاں سے ملتی جلتی ہے بلکہ وہ ان کی طرح بھاری بھرکم وزن کے مالک بھی ہیں۔ دور سے دیکھیں تو وہ بالکل عدنان سمیع خان ہی لگتے ہیں اور پھر وہ اپنا اسٹائل بھی ویسا ہی بنا کر رکھتے ہیں جیسا عدنان سمیع خان ہے۔ اس لیے لوگ ان کو بعض اوقات عدنان سمیع کی ڈپلی کیٹ کاپی سمجھتے ہیں۔ چونکہ ان کو گلوکاری کا بھی شوق ہے۔ اس لیے لوگ ان کو اپنی پارٹیوں اور دیگر پروگراموں میں بلاتے ہیں۔ جہاں وہ اکثر و بیشتر عدنان سمیع کے گانوں پر ہی پرفارمنس دیتے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں لوگ فرط حیرت سے کھڑے ہو کر انہیں دیکھنے لگ جاتے ہیں کہ یہ عدنان سمیع کہاں سے آ گیا۔ تنویر آفریدی کا چکر آج کل ایک نوعمر لڑکی گل کے ساتھ چل رہا ہے۔ گل ایک ماڈل اور اداکارہ ہے اور تنویر آفریدی اکثر اس کا میک اپ کرتے ہیں۔ اور شوٹ وغیرہ کے وقت اس کے ہمراہ ہی ہوتے ہیں سنا ہے کہ دونوں میں کافی انڈرسٹینڈنگ ہے مگر اندرونی حلقے یہ بھی بتاتے ہیں کہ گل نے تنویر آفریدی سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ بلاشبہ اسے تنویر آفریدی سے محبت ہے مگر وہ اس کے بہت زیادہ مٹاپے سے خائف ہے۔ اس نے تنویر آفریدی سے کہا ہے پہلے تم سلم اور سمارٹ ہو جاؤ پھر میں تم سے شادی کے بارے میں سوچوں گی۔ اور ویسے بھی مٹاپا انسان کو لے ڈوبتا ہے یہ اپنے ساتھ بیشمار بیماریاں لے کر آتا ہے ابھی تو تنویر آفریدی جوان ہے مگر ذرا عمر ڈھلی اور وہ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچا تو اس کا یہ موٹاپا اس کیلئے وبال جان بن جائے گا۔ تنویر آفریدی سے اگر اس کا وزن پوچھا جائے تو وہ اپنا وزن بتاتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے لڑکیاں اپنی عمر بتاتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔ گل کے علاوہ تنویر آفریدی کی ایک اور لڑکی سحر کے ساتھ بھی دوستی ہے۔ سحر بھی ایک ماڈل اداکارہ ہے اور تنویر آفریدی کی میک اپ کلائنٹ بھی ہے۔

تنویر آفریدی ایک بہترین میک اپ ماسٹر ہے۔ میک اپ کی دنیا میں اس کا نام ہے اور وہ اپنے کام میں ماہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وائی ایم سی اے میں بطور لیکچرار کام کر رہا ہے اور میک اپ اور آرٹ کے طلباء و طالبات کو پڑھا رہا ہے گذشتہ دنوں پی سی ہوٹل لاہور میں ایک تقریب کے دوران اس کی ملاقات مون ڈائجسٹ

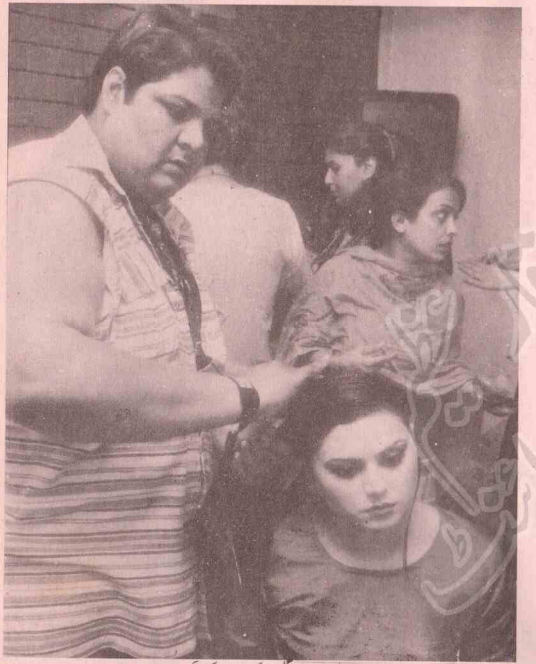

تنویر آفریدی ماڈل و اداکارہ گل کا میک اپ چیک کر رہے ہیں

شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ اس طرح وہ تنویر آفریدی کو بھی ایک موقع فراہم کریں۔ سید نور نے تنویر آفریدی کو فلموں میں پرفارم کرنے کا موقع فراہم کر ے ز

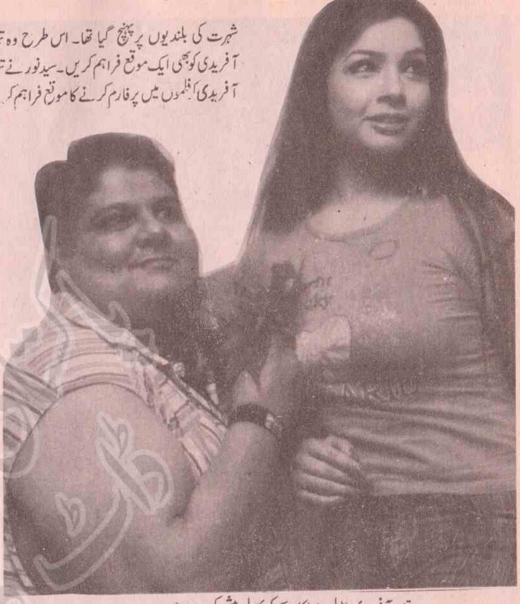

تنویر آفریدی ماڈل واداکارہ سحر کو پھول پیش کر رہے ہیں

کے چیف ایڈیٹر ادیب جاودانی سے ہوئی تو وہ بھی اسے عدنان سمیع خان ہی سمجھ بیٹھے لیکن ملاقات ہونے پر پتہ چلا کہ وہ عدنان نہیں بلکہ تنویر آفریدی ہے۔ اس تقریب میں پاکستان فلم انڈسٹری کے معروف ہدایتکار اور فلم ساز سید نور بھی موجود تھے۔ تنویر آفریدی نے ادیب جاودانی سے کہا کہ وہ ان کی سفارش کریں کہ سید نور انہیں اپنی کسی فلم میں چانس دیں۔ اس پر ادیب جاودانی نے سید نور سے کہا کہ جس طرح انہوں نے برسوں پہلے عدنان سمیع خان کو اپنی فلم سرگم میں چانس دیا تھا اور وہ اس فلم کے بعد

کی حامی تو بھر لی ہے لیکن دیکھیں وہ کب انہیں موقع فراہم کرتے ہیں۔ ہماری دعائیں تنویر آفریدی کے ساتھ ہیں لیکن ہم بھی تنویر آفریدی کو یہی مشورہ دیں گے کہ وہ خود کو عدنان سمیع بنانے کی بجائے اپنے موٹاپے پر کنٹرول کرے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرے اس میں ٹیلنٹ موجود ہے۔ اسے اپنے فن اور کام کے حوالے سے اپنے آپ کو منوانا چاہیئے نہ کہ دوسروں کی نقل کر کے، دوسروں کی نقالی کر کے وہ زندگی میں کامیابیاں نہیں سمیٹ سکتا۔

○

چہرے نہیں نظام بدلو

ڈوری وہی پتنگ وہی ہے
حرص و ہوس کا رنگ وہی ہے
اوپر عیش کا ڈھنگ وہی ہے
نیچے بھوک اور ننگ وہی ہے
نام تو بدلے کام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

سچے پر الزام وہی ہے
جھوٹے پر اکرام وہی ہے
راشی کو آرام وہی ہے
صبح وہی ہے شام وہی ہے
گردش صبح و شام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

سرداروں پر وہی شباب
محکوموں پر وہی عذاب
وہی ہے شیشہ وہی شراب
ہوا نہ ہوگا یہاں حساب
قبلہ اور امام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

زرداروں نے کیا یہ حال
چند اک ہو گئے مالا
ہر اک کی جب ٹپکے
ملک تو ہونا تھا کنگال
حرص و ہوس کے دام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

ملک میں ہر سو لوٹ ہی لوٹ
گونگی، بہری، اندھی لوٹ
میں بھی لوٹوں تو بھی لوٹ
ملی ہے سب کو لمبی چھوٹ
لوٹ کی دعوت عام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

آئے چور اور جائے چور
گھورے اور غرائے چور
لوٹے، مارے، کھائے چور
خود بھی شور مچائے چور
حاکم خوں آشام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

مل جل کر سب کھا گئے لوٹے
اپنا ہاتھ دکھا گئے لوٹے
نکلے اور پھر آ گئے لوٹے
ملک پہ پھر سے چھا گئے لوٹے
اک دو نہیں تمام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

وہی ہے مینا وہی ہے جام
اعلیٰ طوگ اور ادنیٰ کام
ہر کام کو کریں سلام
ہر سودے میں ان کا نام
بد بدلو بد نام کو بدلو
چہرے نہیں نظام کو بدلو

مون ڈائجسٹ لاہور کے چیف ایڈیٹر

ادیب جاودانی

کے دورہ بھارت کی تصویری جھلکیاں

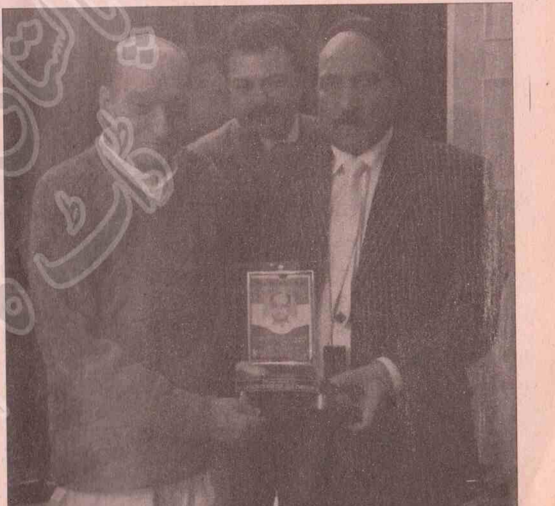

انڈیا امرتسر۔۔ڈاکٹر او پی سرین صدر کانگریس کمیٹی امرتسر ادیب جاوادنی کو شیلڈ پیش کر رہے ہیں
ان کے درمیان سندیپ سرین کھڑے ہیں

سندیپ سرین صدر پرائیویٹ سکولز ایسوسی ایشن مشرقی پنجاب (وومن یوگا ایسوسی ایشن بھارت)
ادیب جاودانی کو ان کی صحافتی اور تعلیمی خدمات پر شیلڈ پیش کر رہے ہیں

درشن لال آنند، تجند رسنگھ، ادیب جاودانی، ہوشیار پور کی ایک تقریب میں بیٹھے ہوئے ہیں

ادیب جاودانی، سندیپ سرین، فوزیہ ادیب اور کاشف ادیب سندیپ سرین کے سکول بھارتیہ ودیا نکیتن سینئر سیکنڈری سکول امرتسر میں طلباء اور طالبات کا پروگرام دیکھ رہے ہیں

ہوشیار پور میں، درشن لال آنند کے گھر میں مسز درشن لال آنند، وینو آنند، فوزیہ ادیب اور رجنا آنند بیٹھی ہیں

WWW.PAKISTANIPOINT.COM